شمارہ نمبر 01

ادبیات انٹرنیشنل

اکادمی ادبیات پاکستان

ادبیات انٹرنیشنل

آن لائن شمارہ نمبر 1، سال 2021

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ایٹ/ون، اسلام آباد

ضروری گزارشات

☆ مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں۔

☆ نگارشات کے ساتھ اپنا اصل نام، قلمی نام، ای میل اور ڈاک کا پتہ تحریر کریں۔

☆ شامل اشاعت نگارشات کے نفس مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔

ترتیب

تمنا کا پہلا قدم

اس نام سے ہے باقی آرام جہاں ہمارا

سراغ زندگی

میرو غالب سے دوستی رکھی

تہذیب، روایت، اسلوب

تتلیاں خیال کی

رات کہانی کہتی ہے

من بیتی، تن بیتی

دیا جل اٹھا دیے کی لو سے(تراجم)

☆☆☆☆

عزت مآب ڈاکٹر عارف علوی

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ''ادبیات انٹرنیشنل'' کے اجرا کے موقع پر خصوصی پیغام

انسانی فطرت اپنے احساسات، مشاہدات اور تجربات کا اظہار چاہتی ہے اور اس اظہار کا سب سے معتبر ذریعہ ادب ہی ٹھہرتا ہے۔ سماج، انسانی رویوں پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے اور ادب انھی رویوں کے زیرِ اثر زمرۂ تخلیق میں آتا ہے۔ اس طرح کسی بھی عہد میں تخلیق پانے والا ادب اس عہد کی سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی اقدار کی شہادت بن جاتا ہے۔ آج دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ معاشرے سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ ہم ایک میکانکی دور میں جی رہے ہیں۔ اس مشینی عہد میں احساسات و جذبات اور لطیف محسوسات کو زندہ رکھنے کے لیے ادب کی تخلیق اور مطالعے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ادب، تہذیبی و ثقافتی اقدار کی بقا اور قلبی و روحانی تسکین کا اہم ذریعہ ہے۔ قوموں کی زندگی میں ادب اور ادیب کی اہمیت اور کردار سے انکار ممکن نہیں۔ یہ ادیب کا خیال ہی ہے جس کا اظہار فینٹسی کی صورت میں ہوتا ہے اور ایک خواب، تعبیر کی صورت میں ڈھل کر زندگی کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ زبان و ادب کے کمالات قوموں کے حق خود ارادیت کے حصول اور ان کے سیاسی خوابوں کی تکمیل میں کس طرح کردار ادا کرتے ہیں، اسے سمجھنے کے لیے برصغیر کے مسلمان ادیبوں اور شاعروں، خاص طور پر علامہ اقبال کی قلمی جدوجہد ہمارے سامنے موجود ہے۔ اسی طرح قیام پاکستان کے بعد بھی جمہوریت کی بحالی اور استحکام کے لیے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کے اس کردار کو ذہن میں رکھ کر اگر وطن سے دُور جا بسنے والے پاکستانیوں اور خاص طور پر ادیبوں اور شاعروں کو خیال میں لایا جائے تو یہ بات نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ سکتی ہے کہ تارکین وطن جو ادب تخلیق کرتے ہیں، وہ دراصل ادب کی رگوں میں شامل ہونے والے نئے خون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو ایک ارتقاپسند زبان ہے جو قدرتی طور پر پھوٹے ہوئے چشمے کی طرح اپنی راہوں کا تعین خود کرتی ہے۔ یہ زبان جس معاشرے میں جاتی ہے، وہاں کی زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر اس خوب صورتی سے جذب کر لیتی ہے کہ وہ اسی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ تارکین وطن کا تخلیق کردہ ادب اس زبان کے فروغ اور مقبولیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

میں اکادمی ادبیات پاکستان کے زیرِ اہتمام ''ادبیات انٹرنیشنل'' میں تارکین وطن کے ادب کی اشاعت کے اقدامات کا خیر مقدم کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ اس سے نہ صرف پاکستانی ادب میں ایک نئی جہت پیدا ہوگی بلکہ تارکین وطن ادیبوں کی تخلیقات کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ میں اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر یوسف خشک اور ادبیات انٹرنیشنل کے مدیران و ادبی حلقے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عارف علوی
صدر، اسلامی جمہوریہ پاکستان

عزت مآب جناب عمران خان

وزیراعظم، اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ’’ادبیات انٹرنیشنل‘‘ کے اجرا کے موقع پر خصوصی پیغام

میرے لیے یہ اطلاع باعث مسرت ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان نے بیرون ملک جا بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کی ادبی تخلیقات کو ایک بڑے پلیٹ فارم پر سامنے لانے کے لیے بین الاقوامی سطح پر ’’ادبیات انٹرنیشنل‘‘ کی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے جس پر میں اکادمی کی قیادت اور جریدے کے مدیران کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ادبی جریدہ نئے عالمی ادبی رجحانات کے فروغ کا ذریعہ بنے گا اور بیرون ملک جا بسنے والے پاکستانیوں، خاص طور پر ادیبوں اور شاعروں کا تعلق اپنے وطن سے مزید مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے بیرون ملک فروغ کا باعث بھی بنے گا۔ اس کی مدد سے وطن عزیز کی گود میں بسنے والے پاکستانیوں کی سمجھ میں بھی یہ آسکے گا کہ روزگار یا کسی دوسری وجہ سے دیارِغیر میں جا بسنے والوں کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ اس پس منظر میں اکادمی ادبیات پاکستان کا یہ قدم تاریخی حیثیت کا حامل ہے جس کا میں تہہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

عمران خان
وزیراعظم، اسلامی جمہوریہ پاکستان

عزت مآب جناب شفقت محمود

وفاقی وزیر برائے تعلیم و پیشہ ورانہ تربیت، قومی ورثہ وثقافت کا خصوصی پیغام

جیسے ہوا اور پانی انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہیں بالکل اسی طرح ادب قوموں کی زندگی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تاثر غلط نہیں ہے کہ ادب کا تعلق خواب وخیال سے ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں خواب و خیال کے ذریعے انسانی ذہن پر اترنے والی باتیں اہمیت نہیں رکھتیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جس قوم کے ادیب، شاعر اور دانش ور خواب نہیں دیکھتے، اس قوم کا کوئی مستقبل ہی نہیں۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے سمندر پار پاکستانیوں اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے محبان اردو کی تخلیقات کو ایک بین الاقوامی پلیٹ فارم مہیا کرنے کے لیے ایک پرچے کے اجراء کا جو فیصلہ کیا گیا ہے، میں اس کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ یہ پرچہ نہ صرف وطن عزیز میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل کرے گا۔ پرچے کی اشاعت پر میں اکادمی کے سربراہ اور پرچے کے مدیران کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ اس شاندار منصوبے کی کامیابی کے لیے میری وزارت کی تائید وحمایت انھیں ہمیشہ حاصل رہے گی۔

شفقت محمود
وفاقی وزیر برائے تعلیم و پیشہ ورانہ تربیت، قومی ورثہ وثقافت

ہم نے یہ سوچا

عالمی ادب کے مزاج اور رجحانات سے آگاہی رکھنے والا پاکستانی ادب کا کوئی بھی سنجیدہ قاری اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اپنے موضوعات، تیکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے ہمارا ادب ہر اعتبار سے مثالی اور غیر معمولی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو یہ ادب تخلیق کر رہے ہیں، ادب کے ساتھ ان کی وابستگی بھی مثالیت کی حد تک سنجیدہ اور مبنی بر اخلاص ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اکادمی ادبیات پاکستان کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے میں نے یہ عزم کیا کہ پاکستانی ادب کو نئے پلیٹ فارموں پر متعارف کرانے کے لیے جو کچھ بھی بن پڑا، میں کروں گا۔

اس سلسلے میں پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ پاکستان کی قومی یا علاقائی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب کو قومی سطح پر متعارف کرانے کے لیے اکادمی کے معروف اور تاریخی پرچے 'ادبیات' کے مرکزی ایڈیشن کے ساتھ چار مزید ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کیا، اس طرح پاکستان کے تمام صوبوں میں بولی اور لکھی جانے والی زبانوں کے ادب کو ایک پلیٹ فارم دینے کی کوشش کی گئی۔ پاکستان کی مختلف قومی زبانوں میں 'ادبیات' کے یہ ایڈیشن ملک کے چاروں صوبائی دارالحکومتوں سے الحمدللہ کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔

میرا دوسرا ارادہ یہ تھا کہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اردو کی نئی اور پرانی بستیوں میں تخلیق پانے والے ادب کو صرف اسی کی شناخت کے ساتھ سامنے لایا جائے۔

دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو کے ادیبوں سے ذاتی تعلق اور اپنی براہ راست معلومات کی بنیاد پر یہ میرے علم میں تھا کہ ہمارے بہت سے اہل علم اور ادیب سچے ادیبوں اور دانش وروں کے مزاج کے عین مطابق گوشہ گم نامی میں بیٹھے ادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں لیکن وہ چوں کہ آگے بڑھ کر خود کو نمایاں کرنے کا ذوق نہیں رکھتے، اس لیے اکثر اوقات ان کا کام سامنے نہیں آپاتا۔ چناں چہ میں نے عزم کیا کہ بیرون ملک رہنے والے پاکستانیوں اور ان محبان اردو کا کام بھی سامنے لایا جائے جن کی مادری اور قومی زبان اردو نہیں۔

اسی خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے یہ ذمہ داری اپنے مہربان و مشفق دوست اور بھائی جناب فاروق عادل کے سپرد کی۔ فاروق عادل ایک سنجیدہ ادیب اور اچھے قلم کار ہیں لیکن وہ بھی ادیبوں کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو گوشہ گم نامی میں بیٹھ کر خاموشی کے ساتھ کام تو کرتے رہتے ہیں لیکن آگے بڑھ اپنی ذات کو

نمایاں نہیں کرتے ۔ مجھے خوشی ہے کہ فاروق عادل نے میری دعوت قبول کی اور مختصر عرصے میں دنیا بھر میں اردو کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ استوار کے ان کی تخلیقات حاصل کیں اور انھیں آن لائین اشاعت کے لیے مرتب کر دیا۔

یہ کام فاروق عادل کے سپرد کرنے کا ایک اضافی فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے مہجری یا ڈایسپورا ادب کی روایت کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کر کے کسی خاص زبان کے معاشرے سے باہر اسی زبان میں لکھے جانے والے ادب کے ایک نئے پہلو کی نشان دہی کی ہے جس کی شناخت مہجری ادب سے مختلف ہے ۔ ان کے استدلال کے مطابق یہ ادب باز دید جیسے نازک اور نفیس تجربے کے نتیجے میں ظہور میں آتا ہے ۔ میری رائے میں انھوں نے اہل علم کی توجہ ادب ایک نئے پہلو کی طرف مبذول کرائی ہے، توقع کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں ادب کا یہ پہلو مکالمات ادب کا سنجیدہ موضوع بن سکے گا۔

ہماری درخواست پر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو ادب کے نمائندہ اور ممتاز اہل قلم نے اس پرچے کے لیے اپنے رشحات قلم ارسال کیے ہیں جی چاہتا ہے کہ میں فرداً فرداً سب کے نام لے کر ان کا شکریہ ادا کروں، میں توقع کرتا ہوں کہ آنے والے دنوں ان سب احباب اور دوستوں سے رابطہ بھی رہے گا اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے مواقع بھی بار بار ملیں گے، ان شااللہ۔

آخر میں؛ میں پرچے کے مدیر، ان کے ساتھ تعاون کرنے والے ادیبوں اور اکادمی کے دیگر کارکنان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ان کی محنت ٹھکانے لگی اور ہم اتنا خوب صورت پرچہ شائع کرنے میں کامیاب رہے۔

ڈاکٹر یوسف خشک
چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان

دید و باز دید

انسانی دماغ سے بڑا عجائب خانہ کیا ہوگا، خاتون خانہ جب بھی پکوڑے تلنے کا ارادہ کرتی ہیں، انھیں ایک ڈبیا کی یاد آتی ہے جو ان کی کسی بزرگ نے کارنس پر سجا رکھی تھی۔ کوئی پرانی یاد اچانک کود کر آپ کے سامنے آن کھڑی ہو تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے لیکن نصف صدی پہلے کہیں دیکھے ہوئے جیولری باکس کا پکوڑوں سے کیا تعلق؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں، سوائے اس کے کہ یہ سمجھ کر صبر کرلیں کہ یہ اُس طلسم خانے کا کمال ہے، سائنس دان جس کے نوے فی صد حصے کو اطلاعات کی فراوانی کے عہد میں بھی تاریک براعظم قرار دیتے ہیں۔ یہ حیرت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب کوئی شخص اپنا گھربار، عزیز و اقارب، دوست احباب حتیٰ کہ اپنے وطن کو تقریباً ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر ان دیکھی دنیاؤں کے سفر پر ہی نہیں جا نکلتا بلکہ وہیں کا ہو رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے خیمے میں گھاس اُگنے لگتی ہے۔

کوئی انسان اپنا گھربار اور وطن کیوں چھوڑتا ہے، اس کی وجوہات بے شمار ہو سکتی ہیں، غربت، بے روزگاری، تعلیم، محبت میں ناکامی، فسادات، حق خود ارادیت کی سلبی، فطری بے چینی یا محض نئی اور ان دیکھی دنیاؤں کے اسرار کو سمجھنے کی تڑپ جو کسی پردیسی کو کسی روز کسی اجنبی دنیا کا باسی بنا دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کو جب کبھی تنہائی کی یاس انگیز کیفیت یا کسی کمزور لمحے کے دوران میں وطن کی یاد ہوک بن کر بے چین کر دیتی ہے اور وہ بے اختیار سیٹی بجاتے ہوئے اپنے دیس کی کوئی لوک دھن گنگنانے لگتے ہیں جیسے ہو جمالو، واہ واہ جمالو یا چن کتھاں گزاری ائی رات وے یا گم شدہ جذبوں کو کھوجنے والے ہمارے طلسماتی افسانہ نگار انتظار حسین کہیں پیچھے رہ جانے والے نیم کے پیڑ یا بیری پر لٹکتے ہوئے جھولے کو پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمارے یہاں لوگ ایسی کیفیت کو ناسٹلجیا یعنی ماضی کی یاد، محبت یا ماضی پرستی قرار دے کر نچنت ہو جاتے ہیں لیکن اپنا اور اپنے ماں جائیوں کا وطن چھوڑ کر کسی اجنبی سرزمین میں بس جانے والوں کے ذہن میں جو طوفان اٹھتے ہیں، انھیں صرف ناسٹلجیا قرار دے کر ان کیفیات کے بیان کا حق ادا ہو سکتا ہے؟ ماہرین نفسیات و سماجیات اس سے اتفاق نہیں کرتے، خاص طور ایسی صورت میں جب اس قسم کے جذبات کا اظہار قلم و قرطاس کے ذریعے کیا گیا ہو۔

یوں ایسی کیفیات کا اظہار فقط شاعروں اور ادیبوں تک محدود نہیں کیوں کہ ڈائسپورا لٹریچر کے بارے

میں جسے اردو دان حلقوں میں گزشتہ کچھ عرصے سے مہجری ادب کا نام بھی دیا جا رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ ان کی ابتدا دراصل خطوط سے ہوئی جو تارکین وطن نے اپنے دوست احباب اور قرابت داروں کو لکھے۔ مکتوب نگاری بھی اگر چہ ادب کی ایک تسلیم شدہ صنف ہے لیکن ادب کا دامن ابھی اتنا کشادہ نہیں ہو سکا کہ ہر لکھی ہوئی چیز کو ادب میں شمار کر کے دریا دلی کا ثبوت دیا جائے، اس لیے لامحالہ اس بحث کا دائرہ ان لوگوں تک محدود ہو جاتا ہے جو شاعر اور ادیب کی کلاسیکی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔

رنگارنگی میں پوشیدہ حسن کے بیان میں جب مشکل پیش آئے اور کچھ کہنے کے لیے الفاظ کم پڑ جائیں تو قوسِ قزح کی خوب صورت ترکیب عجز بیاں کا عیب چھپا لیتی ہے۔ مہجری یا ڈائسپورا ادب کی رنگارنگی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ بے گھری اختیار کرنے والوں یا صحیح معنوں میں نئے دیس میں نئے گھر بسا لینے والوں کے خیالات میں کتنے رنگ جھلکتے ہیں، ایسی تحریروں کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینے والے نقادوں، مدبروں اور علما کا خیال ہے کہ بے شمار۔ اناس تاسیا کرسٹو نے اس رنگارنگی کی تہہ میں اتر کر اس کی کیفیات اور اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ یہ ایک ایسا عجیب و غریب جذبہ ہے جس میں دل کی دنیا میں ہل چل مچا دینے والی یادیں، بہت کچھ چھوٹ یا بچھڑ جانے کا صدمہ (ٹراما)، وہ دنیا جو انھوں نے اپنی پرانی دنیا کو چھوڑ کر بسا رکھی ہوتی ہے، اس میں مختلف ہونے کا احساس، اس احساس کے نتیجے کے طور پر اپنی بنیادی قومیت اور شناخت پر اصرار اس کی نمایاں پہچان ہے۔

ڈائسپورا لٹریچر کی ایک جہت فلسفیانہ بھی ہے، کہا جاتا ہے کہ ایسے ادیب جو ذاتی اور جسمانی حیثیت سے اس نوع کے سفر سے گزرتے ہیں، اس تجربے میں وہ ناگزیر طور پر ایک نفسیاتی سفر بھی کرتے ہیں جو حال اور ماضی سے متعلق اِن کی یادوں میں ایک خاص قسم کی پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ اس پیچیدگی کا مطالعہ بہ یک وقت دل چسپ بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ وہ لوگ جو کسی پریشانی، مجبوری یا دباؤ کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ دینے پر مجبور ہونے کے بعد ایک نیا وطن اختیار کرتے ہیں، انھیں اپنے نئے وطن میں مقامی آبادی اور اپنے درمیان ناگزیر ثقافتی فرق اور اپنی جڑوں سے اکھڑ جانے کا احساس پریشان کرتا ہے، کسی کیفیت میں وہ اس فرق کے خلاف شدت کا رویّہ اختیار کر کے خود کو اس کے استرداد پر آمادہ پاتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے انھیں اپنے سابقہ یا اصل وطن کے حالات یاد آتے ہیں اور اِن کے مقابلے میں نئے وطن کا سکون اور آسائشیں انھیں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں تو وہ اس سے یک سر مختلف کیفیت میں چلے جاتے ہیں، یوں ان کا سفر، اس سفر کی یادیں اور تجربات ایک پیچیدہ عمل سے گزر کر نئی شکل اختیار کرتی ہیں، یہی وہ روحانی یا نفسیاتی تجربہ ہے جس کی یادوں سے ایک نئی، غیر معمولی، قیمتی بلکہ شان دار جہت جنم لیتی ہے جو ان یادوں کو بہ ظاہر دھندلا کر ایک قسم کی مابعد

الطبیعاتی کیفیت پیدا کرتی ہے جس کی مدد سے یوں کہہ لیجیئے کہ صاحب قلم وقرطاس ندی کا تیسرا کنارہ دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے یعنی ایسا ادیب پکوڑے تلنے والی اُس خاتون کے تجربے سے گزرتا ہے جس کی آنکھوں کے سامنے اس کی تائی اماں کا جیولری بکس آجاتا ہے جسے یاد آنے کی بہ ظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جسمانی، روحانی اور نفسیاتی سفر کرنے والوں کے تخلیق کردہ ادب کی یہی جہت اسے اُس روایتی ادب سے ممتاز کرتی ہے جو اب تک ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ چلا آتا ہے۔ تارکین وطن کی اصطلاح کی ذیل میں آنے والے ہماری ادیب اگر برا نہ منائیں تو اس ادب کی ایک شناخت تضاد کی یہ کیفیت بھی ہے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ یہی تضاد اس ادب کو وہ امتیازی شان عطا کرتا ہے جو اپنے قاری کو ایک مختلف دنیا میں لے جا کر ایک نئے ذائقے کے ادب سے روشناس کراتا ہے۔

قوس قزح کے رنگوں والے اس ادب کو فلسفے کی زبان میں Synthesis کے طور پر شناخت کیا گیا ہے کیوں کہ یہ تجربہ ایک نئی عالم گیر تہذیب کو بنیاد فراہم کرنے کے علاوہ پہلے سے موجود تہذیبوں میں نئے رنگ ڈھنگ، طور طریقے اور نیا خون شامل کر کے ان کی تجدید کا مقدس فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔

ہمارے ہاں تقسیم ہند کے تجربے کے بعد جو ادب لکھا گیا، اس تجربے کی طرح اس کی جہتیں بھی بے شمار ہیں جن میں ہمارے بہت سے محترم ادیبوں نے خامہ فرسائی کر کے دامن ادب کو مالا مال کیا ہے، انتظار حسین ان ادیبوں کے سرخیل ہیں۔ ہجرت کے عظیم تجربے کے بعد جن ادیبوں نے تارکین وطن کی حیثیت سے اپنے تجربات کو زباں بخشی، عبداللہ حسین اِن میں نمایاں ترین ہیں۔ اِس عہد میں نوجوان اور سینئر ادیبوں کی ایک بڑی تعداد اس عمل میں شریک ہے۔ زمانۂ حال کے ادیبوں کے تجربات ماضی کے مقابلے میں اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی نے تہذیب اور ثقافت پر جو غیر معمولی اثرات مرتب کیے ہیں، ان کی تحریروں میں ان کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس پرچے میں شامل بیشتر تحریریں اس معیار پر پورا اترتی ہیں، اس سلسلے میں امریکہ میں لکھے گئے افسانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن میں سوگ کی فضا میں اجنبی رویے اور بلقیس اور سلیمان کی علامتیں معنی خیز ہیں۔ اسی طرح بے رحم اکثریت کے ہاتھوں اقلیتوں اور کمزور طبقات کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک یا قوت قاہرہ کے زور پر حق خود ارادی کو سلب کر لینے والی قوتوں کے مظالم کے پس منظر میں جنم لینے والا ادب بھی ایسا ہی مزاج رکھتا ہے جس کی مثالیں اس شمارے میں موجود ہیں۔

اگر مہجری ادب کی تعریف سے اتفاق کر لیا جائے تو ایسی تحریریں اس تعریف پر پورا ضرور اترتی ہیں لیکن دو پہلو ایسے بھی ہیں جو مہجری ادب کی اصطلاح کے بارے میں سوالات پیدا کرتے ہیں:

ا۔ پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار نے دلی میں مہجری ادب کے بارے میں ایک بین الاقوامی

کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے نیا نکتہ پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ترکوں کے نزدیک تو ہجرت ایک ہی ہے یعنی وہ ہجرت جو نبی آخرالزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ رہ گئی تلاش معاش یا کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے نقل مکانی تو ترک جہاں جا کر قیام کرتے ہیں، اسی جگہ کو اپنا وطن خیال کرتے ہیں۔ ترکوں کا یہ تصور حضرت اقبالؒ کے اس تصور کے عین مطابق ہے جس کے تحت انھوں نے وطن ہے سارا جہاں ہمارا کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔

۲۔ ترکِ وطن کرنے والے ادیب جس طرح اپنے آبائی دیس پر نگاہ واپسیں ڈال کر یا بالفاظ دیگر باز دید کے تجربے سے گزر کر خیال کے کچھ نئے دریچے کھولتے ہیں، بالکل اسی طرح وہ ادیب جن کی مادری یا قومی زبان اردو نہیں اور وہ دنیا کے مختلف حصوں میں بستے ہیں، اگر وہ ہماری زبان میں ادب تخلیق کرنے لگیں تو سوال یہ ہے کہ ان کے ادب کو کیا نام دیا جائے گا؟ حالیہ مہجری کانفرنس میں ڈاکٹر خلیل طوقار کو مدعو کیا گیا تھا، کیا وہ مہجری ادب کی تعریف پر پورا اترتے ہیں؟ اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ انھیں آخر کس ادب کا نمائندہ تصور کیا جائے؟

واقعہ یہ ہے کہ وہ محبانِ اردو جن کی مادری اور قومی زبانیں کچھ اور ہیں اور وہ اردو میں دسترس حاصل کر کے ادب تخلیق کرتے ہیں تو یہ حقیقت ہے کہ وہ پورے طور پر نہیں تو بہت حد تک اسی تجربے سے گزرتے ہیں جس سے مہجری یا ڈائسپورا ادیب گزرتے ہیں۔ ڈائسپورا ادیبوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اُن کے ادب کی بنیاد نئے اختیار کردہ معاشرے میں رہتے ہوئے اپنے پرانے معاشرے پر نگاہ واپسیں ڈالنے سے پڑتی ہے۔ اردو میں لکھنے والے محبانِ اردو کا تجربہ کم و بیش وہی یا ویسا ہی ہے، وہ بھی ایک مختلف معاشرے سے اردو معاشرے کو دیکھتے ہیں یا مہجری ادیبوں کی طرح اردو معاشرے سے مختلف تجربات سے اردو معاشرے کو آگاہ کرتے ہیں۔ اردو والوں کا نگاہ واپسیں کا عمل ہو یا محبانِ اردو کی خیال آفرینی یا ان کی طرف سے اردو میں پہلے سے موجود لٹریچر سے واقفیت کے بعد اس میں اضافے کا عمل، لغت اس سلسلے میں باز دید کی ترکیب متعارف کراتی ہے، کیا ہم ایسے ادب کو اطمینان کے ساتھ 'ادبِ باز دید' قرار دے سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں، آنے والے دنوں میں اس باب میں بڑھتے ہوئے سوالات پر غور اور ادب کی دنیا میں کچھ نئے دریچوں کے کھل جانے سے ہی اس سوال کا جواب ممکن ہو سکے گا۔

فاروق عادل

مدیر اعزازی

تشکرات

بیرون وطن مقیم پاکستانیوں اور اردو کی دیگر اور نئی پرانی بستیوں میں تخلیق ہونے والے ادب کو پلیٹ فارم مہیا کرنا ایک خواب تھا، اس خواب کی تعبیر ممکن نہ ہوتی اگر اس کی کام یابی کے لیے پاکستان اور بیرون پاکستان سے مقیم دوستوں، مہربانوں اور محبان اردو کا تعاون شامل حال نہ ہوتا۔ ہمارے ان دوستوں میں ترکی سے برادر محترم پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار، بھارت سے پروفیسر ڈاکٹر سلیم محی الدین، مقبوضہ کشمیر سے ڈاکٹر محمد معروف شاہ، جناب توصیف احمد، لندن سے جناب یشب تمنا، جناب فہیم اختر، امریکہ سے جناب سلمان باسط، محترمہ نورین طلعت عروبہ، برادر محترم اشرف قریشی اور میرے بڑے بھائی رئیس وارثی سمیت بہت سے دیگر احباب شامل ہیں، اگر کوئی نام شامل ہونے سے رہ گیا ہے تو اس سہو پر معذرت کے ساتھ ان کی خدمت میں بھی نذرانہ محبت پیش کرتے ہیں۔ ان سب دوستوں نے اس کام کو اپنا کام سمجھ کر ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ ہم ان تمام احباب کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

'بازدید' ادب کے اس پہلے شمارے کے لیے ہی بڑی مقدار میں مواد اکٹھا ہو گیا تھا جو اس شمارے میں شامل تخلیقات کی طرح ہی معیاری اور شان دار ہے۔ یہ تخلیقات آئندہ شمارے کے لیے محفوظ کر لی گئی ہیں۔

اس پرچے کی تیاری کے دوران عزیز دوستوں ڈاکٹر جنید آزر، راجہ عبدالقیوم صاحب اور برادرِ عزیز کاشف رحمٰن کاشف کے علاوہ اکادمی ادبیات پاکستان کے جناب اختر رضا سلیمی، آنسہ فضا گل، جناب سعید رضا خان، جناب محمد ساجد بھٹی، عابد محمود اور سجاد احمد کا تعاون ہمارے شامل حال رہا ہے جس پر یہ احباب بھی شکریے کے مستحق ہیں۔

چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف خشک کا شکریہ خاص طور پر ہم پر واجب ہے۔ اگر قدم قدم پر ان کی راہ نمائی میسر نہ ہوتی تو یہ پرچہ شاید دن کی روشنی نہ دیکھ پاتا۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ اردو کی نئی پرانی بستیوں میں لکھے جانے والے ادب کو سامنے لانے کے لیے ایک خصوصی پرچے کی اشاعت کا خیال سب سے پہلے ان ہی کے ذہن میں آیا اور انھوں نے ہی اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ضروری

انتظامات کیے لیکن اس کے باوجود اس پرچے کی پالیسی کے تعین اور اس کے تیاری کے سلسلے میں انھوں نے جو آزادی ہمیں مہیا کی، اس لیے ہم خاص طور پر ان کے ممنون ہیں۔

ہماری تمنا کا یہ پہلا قدم اب آپ کے ہاتھوں میں ہے، آپ نے اسے کیسا پایا، اس سلسلے میں آپ کا ردعمل ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ہی نہیں بنے گا بلکہ یہ تمنا کے اس سفر میں مزید بہتری بھی پیدا کرے گا۔

بہت سی محبتیں اور دعائیں

فاروق عادل

نورین طلعت عروبہ (واشنگٹن، امریکا)

یہ سب الفاظ کے بس میں نہیں تھا

عجب تیرے کرم کا سلسلہ ہے
مری اوقات سے بڑھ کر دیا ہے

مرے الفاظ ہیں سارے اضافی
وہ میری خامشی کو جانتا ہے

میں اس شانِ خداوندی کے صدقے
تمنا کا شگوفہ کھِل رہا ہے

سنبھلنا چاہتے ہوں گرنے والے
تو پھر اس کا کرم ہی تھامتا ہے

یہ سب الفاظ کے بس میں نہیں تھا
جو اشکوں سے ادا ہونے لگا ہے

تیقن ہے عطاؤں پر جبھی تو
دِیا چلتی ہوا میں جل رہا ہے

ہماری محفلوں میں ذکر جس کا
وہی تنہائیوں میں بولتا ہے

☆☆☆☆

ڈاکٹر حیات عامر حسینی (علی گڑھ، بھارت)

آپ سے ہے سازِ ہستی استوار

آپؑ تو محمود ہیں پیارے نبیؐ
آپؑ تو مسعود ہیں پیارے نبیؐ

آپؑ سے ہے سازِ ہستی استوار
آپؑ تو مشہود ہیں پیارے نبیؐ

آپؑ پر نازاں ہے ذاتِ ذوالجلال
آپؑ تو مقصود ہیں پیارے نبیؐ

آپؑ سا پیارا نہیں تخلیق میں
آپؑ تو محمود ہیں پیارے نبیؐ

☆☆☆☆

ڈاکٹر جلال سوئیدان، نشانِ امتیاز
شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی، ترکی

مغربی نظامِ تعلیم: اقبالؒ اور عاکفؒ کی نظر میں

علامہ محمد اقبال بخوبی جانتے تھے کہ ان کے سماجی اور عمرانی خیالات، صحت مند تہذیبی رویے، رجائی نقطۂ نظر، یہ سب تعلیم ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ وہ تعلیم کی اہمیت سے کماحقہٗ آگاہ تھے اور وہ جانتے تھے کہ انسان کی تہذیبِ باطن اور تزکیۂ نفس کے لیے تعلیم کس قدر ضروری ہے۔ اقبال نے تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر مفکرانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا۔ ان کے تعلیمی نظریات اگرچہ ایک خاص دور سے متعلق ہیں لیکن ان کی اہمیت آج کے دور میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اقبال کی طرح ترکی کے ملی شاعر اور مفکر محمد عاکف ارصوئے (۱۸۷۳ـ ۱۹۳۶ء) نے بھی مغربی تہذیب اور تعلیم کے بارے میں اقبال کے سے خیالات کا اظہار کیا۔

دراصل ہر موضوع پر اقبال اور عاکف کے کلام میں حیرت انگیز حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ چوں کہ موجودہ صدی میں ممالکِ اسلامیہ سیاسی و تہذیبی اعتبار سے یکساں صورت حال سے دو چار تھے اور ایک ہی طرح کی آزمائش و ابتلا کے دور سے گزر رہے تھے، لہٰذا ان ممالک کے اہلِ فہم و دانش کے خیالات و نظریات میں بھرپور مماثلت اور یکسانیت ملتی ہے۔ عاکف نے ترکوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ موضوع خواہ کوئی بھی ہو، ان کے سوچنے اور غور کرنے کا انداز ایک باشعور مسلمان کا انداز ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے اقوامِ مشرق اور خاص طور پر ترکوں کو مغربی تہذیب کی برائیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

مغرب کی تعلیم اور تہذیب کے بارے میں عاکف کے نظریات شروع ہی سے مخالفانہ رہے ہیں۔ اس مخالفت کے پس منظر میں کئی باتیں عامل نظر آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کی بدحالی کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض اراکینِ سلطنت اور دانش ور یہ خیال کرتے تھے کہ اس بدحالی سے بچنے کے لیے مغربی تہذیب اور اندازِ زیست کو اپنایا جائے۔ ان خیالات نے اٹھارویں صدی سے ذہنوں میں اپنے نقوش ثبت کرنا شروع کر دیے تھے۔ اس نقطۂ نظر پر اتنا زور دیا گیا کہ اس کا نام مغربیت رکھا گیا اور یہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ ان خیالات کے مطابق فوجی اصلاحات کے ساتھ ساتھ انتظامی، عدالتی اور تعلیمی شعبوں میں بھی اصلاحات کی گئیں۔ مغربی طرز کے مدرسے قائم کئے گئے اور مدرسوں کے لیے مغرب سے معلم لائے گئے۔

عاکف اس سلسلے میں یوں فرماتے ہیں:

جولوگ اپنے تئیں دانش ور سمجھتے ہیں
وہ تم سے کہتے کیا ہیں سن لو، ذرا:
اقوام مشرق کی ترقی کے لیے ایک ہی راہ ہے
علاوہ اس کے راہ ڈھونڈنے والا یقیناً نادان ہے۔
بس یہ دیکھنا کہ مغربی اقوام کس زمین پر چلتی ہیں
ہمیں بھی انہی کے نقش قدم پر چلنا ہوگا، دائیں بائیں ہٹے بغیر
افکار مغرب کو مشرقیوں کے دماغوں کا حصہ بنانا ہوگا
سب کے جذبات کو ایک ہی قالب میں ڈھالنا ہوگا
اجتماعی، ادبی، القصہ ہر بات میں مغرب کی تقلید نہیں کی جائے تو سب کہا سنا بے کار ہے۔

عاکف کے خیالات اپنے دور کے دانش وروں سے بالکل جداگانہ تھے۔ عاکف اپنے مثالی کردار عاصم سے جو دوسرے طالب علموں کے ساتھ یورپ اکتسابِ فن کے لیے جاتا ہے، بات کرتے ہوئے یہ نصیحت کرتے ہیں:

بیٹا، اس بات سے کبھی باز نہ رہیں کہ
محض مغرب کے علم وفن پر نظر رکھیں
ان بچوں کے ساتھ رات دن ایک کر کے کوشش کریں
اور پچھلے تین سو سال کے علم کو جلد حاصل کریں
دیارِفن میں بہنے والے لامتناہی دریا سے
خود بھی پئیں راس مفید پانی کو اپنے ملک میں بھی لائیں۔

عاکف کے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی کا بڑا سبب علم وفن کا فقدان ہے۔ کسی زمانے میں افضل و برتر مسلمان قوم سائنسی علوم سے بیزاری یا اس کے غلط مفہوم کے ہاتھوں روز بروز بدحالی کا شکار ہوگئی:

ہماری وہ فضیلت جو آخری تین صدی کے علم کے دوش بدوش آگے نہیں بڑھی
بلکہ ملت اور زیادہ جہالت میں مبتلا ہوگئی
جسمانی طاقت روز بروز مفلوج ہوتی گئی
وہ ایسی پامال ہوگئی کہ اب گرتے پڑتے سنبھلنے کی کوشش میں ہے

چوں کہ اس فن سے محروم ہے جو حاکم و زندگی بخش ہے
اس لیے مغرب کے حکم کے تحت بسیرا کرنے پر مجبور ہے۔

دراصل عاکف کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مغربی تعلیم ترکوں کے اندازِ فکر میں اسلام کو خارج کرنے کا سبب بن گئی ہے۔ اکتسابِ فن و صنعت کی خاطر جو طالب علم یورپ بھیجے گئے وہ نہ صرف اپنی شخصیت کھو بیٹھے بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک تہذیبِ مغرب اپنانے کے شوق میں اپنے مذہب اور نسلی شناخت بھی گنوا بیٹھے۔ اقبال کا بھی یہی خیال ہے کہ اس تعلیم سے جو نئی نسل پیدا ہو رہی ہے اس میں صرف یہی نقص نہیں ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کے دینی اور روحانی اصول پر قائم نہیں ہے بلکہ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس میں یورپین قوموں کی خصوصیات بھی نہیں پائی جاتیں۔

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آزرانہ!

اقبال اور عاکف دونوں کے نزدیک الحاد اور مذہب سے بیزاری کی خرابی نظامِ تعلیم میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

عاکف کے نزدیک حریت کے نام سے مغربی تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ توہین مذہب کے سوا کچھ نہیں:

مذہب پر یلغار کرتے ہیں دو چار بے ادب اور ان کے لیے تالیاں بجتی ہیں
اور افسوس کہ نسلِ حاضر اسے "حریت وجدان" سمجھ بیٹھی ہے

اقبال کا تعلیمی فلسفہ دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلتا ہے، یعنی وہ روحانی ضروریات کے ساتھ ساتھ مادی و معاشی تقاضوں سے بھی غافل نہیں ہیں۔ اس لیے انھوں نے فنی و صنعتی تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ تاکہ طلبا جدید سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر فنی علوم بھی سیکھیں۔ اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

"تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں میں ایک ایسی قابلیت کا پیدا کرنا ہے جس سے ان میں بہ حسن و جوہ اپنے تمدنی فرائض کے ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔۔۔ مسلمانوں کو

تعلیم کی تمام شاخوں سے زیادہ صنعت کی تعلیم پر زور دینا چاہیے ۔ واقعات کی رو سے
میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جو قوم تعلیم کی اس نہایت ضروری شاخ کی طرف
توجہ نہیں کرے گی وہ یقیناً ذلیل وخوار ہو جائے گی ۔"

عاکف اور اقبال دونوں مغرب کی درسگاہوں میں علوم حاصل کرنے پر زور دیتے ہیں ۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اکتسابِ فن وصنعت اور ٹیکنالوجی سیکھے بغیر اب کوئی قوم فعال قوموں سے قدم ملا کر نہ چل سکے گی کیوں کہ علم وفن کی کوئی قومیت نہیں ہوتی ۔ چناں چہ عاکف فرماتے ہیں:

اکتساب کر لیجیے مغرب کا علم، اخذ کر لیجیے اس کا فن
یہاں تک کہ اس میں پوری مساعی صرف کر دیجیے
کیوں کہ اب ان کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں
کیوں کہ صرف علم وفن کی کوئی قومیت نہیں ۔

عاکف اکتسابِ علم وفن پر زور دینے کے ساتھ ساتھ طالب علموں کو یوں متنبہ کرتے ہیں:

مگر ذہن میں رکھنا میری کچھ دیر پہلے کی تنبیہہ
پورے ادوارِ ترقی کو پار کرنے کے لیے
اپنی "ماہیتِ روحانی" تمھاری رہبر بن جائے
اس لیے کہ سلامتی کی امید اس کے بغیر بیہودہ ہے

عاکف کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے اور یہ مخالفت اس کی رگ و پے میں اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا بجا اس پر ایک ضرب رسید کر دیتے ہیں ۔ عاکف کے کلام کو دیکھ کر اس بات کا پتا چلتا ہے کہ عاکف کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا ۔ اسی لیے عاکف مغربی تہذیب کے خطرات سے مشرقی اقوام کو آگاہ کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ مغرب کی تقلید و پیروی ان کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہوگی ۔ وہ جب بھی مغرب کی بات کرتے ہیں تو بعض اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں یعنی مغرب، مغربی تہذیب، مدنیت، عصرِ حاضر ۔ ان سے ان کی مراد وہ سب کچھ ہوتا ہے جن کو اقبال مغربی سیاست، تعلیم، فکر، تمدن وغیرہ کے عنوانات کے تحت گنواتے ہیں:

ان کو دیکھ کر سمجھ لو کہ جس کو تہذیب کہتے ہیں کیا شے ہے
تھو کو عصر حاضر کے نقاب پوش وجدان پر

اقبال نے جدید تعلیم کی غرض و غایت پر غور کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ تعلیم محض مادی اور محدود نوعیت

کی ہے۔جب کہ علم کا مقصد معاش کے ساتھ قلب و ذہن کی وسعت بھی ہے۔موجودہ طریقۂ تعلیم مسلمانوں کی قومی اور تاریخی زندگی سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا!

اقبال کے نزدیک جدید نظام تعلیم میں ایک اور خرابی یہ ہے کہ مغربی تعلیم نیا انسان کی خودی، اعتماد اور مشرقی روایات کو ختم کر دیا ہے۔ناامیدی اور بےیقینی کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر احساسِ کمتری اور شعورِ پستی پیدا ہو جاتا ہے۔

اقبال! یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!

اقبال قدیم اور جدید دونوں نظاموں سے غیر مطمئن اور مایوس ہیں۔انھوں نے دونوں کو مسترد کر دیا ہے کیوں کہ ان سے نہ تو فرد کی شخصیت بنتی ہے نہ ہی علمی تشخص اور ملت کے لیے مفید بننے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ
نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد!

مذکورہ بالا اعتراضات کے باوجود اقبال تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے بلکہ اس پر بہت زور دیتے تھے۔اقبال تعلیم کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح کرتے ہیں کہ تعلیم محض مجرد معلومات کے حصول کا نام نہیں بلکہ یہ کچھ واضح مقاصد اور مفاہیم رکھتی ہے۔وہ تعلیم برائے زندگی کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم زندگی کو آراستہ و پیراستہ کرتی ہے اور اسے منفی و تخریبی قوتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور یہ سب کچھ خودی کے بغیر ممکن نہیں ہے، لہٰذا اقبال کے نزدیک تعلیم کا ایک بہت بڑا مقصد استحکامِ خودی ہے۔

علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

اقبال کے نزدیک تعلیم کا ایک بڑا مقصد خدا تعالیٰ کی پہچان ہے۔ وہ مذہبی و دینی تعلیم کو بے حد اہمیت دیتے ہیں۔ چناں چہ تعلیم خواہ کیسی ہو، متعلم کا رشتہ مذہب سے استوار رہنا چاہیے۔ اقبال کے دور میں جدید نظامِ تعلیم میں مذہب کا کوئی مقام نہ تھا۔ دینی اور اخلاقی اقدار ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ چناں چہ علامہ اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف!

یہی بات عاکف کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ عاکف کے نزدیک لفظِ مدنیت اور مغرب جو تعلیم، سیاست، مذہب جیسی قدروں کا احاطہ کرتا ہے، اسلامی ممالک کے لیے دانت پیس رہا ہے:

''مدنیت'' تمھارے لیے عرصے سے دانت پیس رہی ہے
پہلے تو ٹکڑے ٹکڑے کرنا، پھر نگلنا چاہتی ہے

اقبال ایسے علم کے خواہش مند ہیں جو انسان کو تحریک پر آمادہ کرے، عملی جدوجہد پر ابھارے اور تسخیرِ کائنات میں اپنا کردار ادا کرنے کے قابل بنائے۔ وہ ہمیشہ حق و صداقت کا علمبردار اور باطل کا مخالف ہو۔ اقبال کے فلسفۂ تعلیم کے بارے میں حتمی بات یہی کہی جا سکتی ہے کہ ''اقبال کے نظریۂ تعلیم کے لیے کلیدی حیثیت صرف اس نکتے کو حاصل ہے کہ تعلیم کو مسلمان بنایا جائے۔''

مجموعی طور پر بلا خوف و تردد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال اور عاکف میں جدید یا مغربی تعلیم پر اعتراضات میں حیرت انگیز حد تک مماثلت ہے چوں کہ دونوں کی شاعری اور فکر کا سرچشمہ اسلامی تصورات اور قرآنی تعلیمات ہیں۔ اس لیے وہ تعلیم جو اسلامی تصورات کے خلاف ہے، اسے مسترد کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

محمد معروف شاہ
جموں و کشمیر

کیا اقبال عجمی تصوف کے مخالف تھے؟

اقبال کو عام طور پر عجمی تصوف کے مخالف کے طور پر گردانا جاتا ہے اس تاثر کے لیے کسی حد تک اقبال بھی ذمہ دار ہیں۔ اکثر ماہرین اقبالیات نے اقبال کی ایرانی یا عجمی تصوف پر تنقید کو ان کے کلام اور خطبات کے تناظر میں سمجھنے کی بھرپور کوشش نہیں کی ہے۔ اس مقالہ میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ اقبال عجمی تصوف کو اسلام میں اجنبی پودا تصور نہیں کرتے ہیں اور ان کو ہم عجمی متصوفیانہ مفکرین کی صف میں کھڑا دیکھ سکتے ہیں اور ان کو کچھ صوفیا پر تنقید یا تصوف کو بیرونی اثرات سے پاک کرانے یا اسلامائز کرنے کی سعی انھیں عجمی صوفیا کی صف سے الگ نہیں کرتی ہے۔ ان کا اختلاف عجمی صوفیا سے دراصل تعبیر کا اختلاف ہے اور بڑی حد تک نزاعِ لفظی۔

اس مقالے میں اقبال اور تصوف پر ہوئی پرانی بحث اور ان کی اس موضوع پر مختلف تحریروں کو کھنگھالنا اور اصل حوالوں سے نقل کرنا نہیں بلکہ ایک مختلف زاویے سے ان اہم نکات کا تجزیہ کرنا ہے جن کو عام طور پر اس سلسلے میں اٹھایا جاتا ہے اور اقبال کی مبینہ تصوف (بالخصوص عجمی تصوف) دشمنی پر ان کی جو مختلف تحریریں ناقابل تردید شہادت کے بطور پیش کی جاتی ہیں، ان کا ایک مختصر جائزہ لینا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کرنا ہے کہ وہ مجموعی طور پر خود ایک عجمی صوفی نظر آتے ہیں۔

اقبال نے عجمی صوفی شاعری کو مخرب اخلاق کہا۔ اگرچہ اسلوب میں تو حافظ ان کے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ ان کے متعلق جو انھوں نے شدید تنقیدی زبان استعمال کی تھی وہ اب تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ ایسی تنقید پر برصغیر کے اکثر تصوف پسند حلقے شدید برہم ہوئے اور اقبال کو حافظ ہی کا نہیں تصوف کا دشمن قرار دیا گیا۔ تصوف کے کچھ بنیادی تصورات جن میں نفی خودی، توحیدِ وجودی، قرآن کی باطنی تعبیر شامل ہیں، رد کیے، یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے عجمی تصوف کو دورِ انحطاط کے ساتھ جوڑ دیا۔ یہ بھی مسلمہ ہے کہ انھوں نے ابن عربی کے مختلف نظریات کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے لیے صوفی مابعد الطبیعات میں 'تنزّ لات ستہ'، قدمِ ارواحِ کاملہ جیسے نظریات صحیح نہیں ہیں۔ آپ کی شاعری میں ملا کی طرح صوفی بھی اکثر منفی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ انھیں تصوف کو فلسفہ بنانے پر اعتراض عمر بھر رہا۔ خدا کا عرفان ان کے نزدیک روایتی تصوف کے فلسفیانہ سانچے کے بغیر بھی، وحدت الوجود یا اس کی روایتی فلسفیانہ تعبیر کو قبول کیے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا

باعث عجمی تصوف کو قرار دیتے ہیں۔اقبال کے کچھ مشہور جملے اور وہ سارے بیانات جو ان کی عجمی تصوف کے تئیں ناقدانہ اندازِ فکر کے غماز ہیں، کو زیرِنظر رکھ کر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ وہ عجمی تصوف کے بڑے مفکرین میں سے ہیں؟ سب سے پہلے ہم اقبال کے بنیادی تصورات کے متعلق جن کا تعلق ان کی صوفیانہ فکر سے ہے، کچھ نکتے پیش کرتے ہیں۔

اقبال کا مرکزی نکتہ تصورِ خودی ہے۔احساسِ خودی صوفیانہ فکر کی اساس ہے۔اگر اس بات پر خاص زور دیا جائے کہ ''میں'' کہنے کا حق حقیقت میں اللہ کو ہے، اور بندے کو تب ہے جب وہ بقاباللہ کے مقام پر پہنچے۔ اقبال کے نزدیک بھی خودی تب ہی مستحکم ہوتی ہے جب اسے خدا کا قرب نصیب ہو۔اقبال نے، جیسا کہ میکش اکبرآبادی نے لکھا ہے، بقاباللہ کے لیے خودی کا لفظ استعمال کیا اور انسان کامل کے لیے مردِ مومن کی اصطلاح۔

یہ بات اگر چہ صحیح ہے کہ صوفیانہ لٹریچر میں خودی کو ختم کرنے کی بات کہی گئی ہے اور لفظ خودی عام طور پر منفی معنوں میں مستعمل ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اقبال اسی منفی تصور خودی کو مستحکم کرنے کی بات کر رہے ہیں۔صوفیانہ ادب میں کہیں کہیں پر خودی کو مستحسن معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔اس بات پر بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ اقبال نے تکبر کے معنی میں اس کا استعمال کیا ہے یا فرعونی خودی کی وکالت کی ہے۔اگر چہ شجاع الحق کو Forgotten Truth میں یہ تسامح ہوا ہے۔اقبال نے دراصل عبد اور معبود نفس اور روح، محدود اور لامحدود اور اضافی اور مطلق کے مابین فرق کو ملحوظ رکھنے کے لیے اس بات پر شدت سے زور دیا ہے۔تمام اکابر صوفیا نے عبد اور معبود کے بنیادی فرق کو ملحوظِ نظر رکھا ہے اور ابن عربی نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ بندہ اور خدا ایک نہیں ہیں۔ان کے الفاظ میں خدا کتنا ہی تنزل اختیار کرے بندہ نہیں بنتا اور بندہ کتنی ہی ترقی کرے خدا نہیں بن سکتا۔توحید وجودی کے معنی ہرگز یہ نہیں کی خدا اور بندہ ایک ہو جاتے ہیں، شریعت منسوخ ہو جاتی ہے، ثواب اور گناہ کی تفریق مٹ جاتی ہے اور انسان غیر مکلف ہو جاتا ہے۔ابنِ تیمیہ کی ابن عربی پر تنقید بڑی حد تک غلط فہمی اور غلط معلومات کا نتیجہ ہے۔آج جب کہ ابن عربی پر کافی کام ہو چکا ہے، یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال متاخرین کو وحدت الوجود کے متعلق بڑی غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔اقبال بھی آخر عمر میں اس انتہائی نازک فرق کو پوری طرح پہچان گئے تھے جو وحدت الوجود کی صحیح اور ملحدانہ تعبیر میں ہے اور اس کے متعلق خاموشی ہی اختیار کرنے کو کہتے تھے۔

اقبال آخر عمر میں وجودی ہو گئے تھے یا نہیں اس بات پر الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔اقبال کے ہر دور کے کلام میں قریب قریب اسی منہاج، اسی ضابطۂ اخلاق کی بات کہی گئی ہے جو اکابر صوفیا کے ہاں ہمیں ملتا ہے۔''اسرارِ خودی'' میں جس ضابطۂ اخلاق اور پابندیِ شریعت کی بات کہی گئی ہے وہی اکابر صوفیا کے ہاں بھی

ہے ۔اقبال کوتصوف کے فلسفہ بننے پر اعتراض تھا اور یہ اعتراض اکابر صوفیا کو بھی ہے اور بحیثیت فلسفہ تصوف پر نا قدانہ نگاہ ڈالی جاسکتی ہے ۔شہودیوں کا وجودیوں سے اختلاف دراصل اسی فلسفہ کے حوالے سے ہے ۔تصوف اکابر صوفیا کے لیے اخلاص فی العمل ہی کا نام ہے اور فلسفیانہ مسائل پر موشگافی تصوف کا بنیادی طور پر Mandate ہے ہی نہیں ۔تصوف کا مقصود اللہ سے قرب، بقاباللہ یا معرفت الٰہی ہے ۔اس کے لیے وجودی یا شہودی ہونا غیر متعلق مسئلہ ہے ۔اخلاقیات پر وجودیوں اور شہودیوں کے مابین کوئی بنیادی نزاع ہے ہی نہیں ۔شریعت کی پابندی دونوں کے ہاں اصولی طور پر مسلّم ہے عبد و معبود، ہدایت وضلالت، نیکی و گناہ، حلال وحرام کا فرق دونوں نظریوں میں ملحوظِ نظر رکھا گیا ہے ۔

یہ بحث بھی ہمارے بنیادی اذعا پر کوئی اثر نہیں ڈالتی ہے کہ وحدت الشہود یا وحدت الوجود میں سے کون سلوک کی اعلیٰ منزل ہے ۔مقصد اگر قرآنی اصطلاح میں فلاح یا عام اصطلاح میں نجات ہے یا صوفیانہ اصطلاح میں عرفان الٰہی تو یہ بات کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں کہ سالک کو سب کچھ ایک دکھے یا خالق سے اپنی مغائرت کا احساس ہو ۔ایک ہی سالک مختلف حالتوں میں دونوں طرح کی کیفیات سے گزر سکتا ہے جب ہم غیر کی طرف نگاہ مرکوز کریں اور خود کا احساس ختم ہو جائے تو اس کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ بندگی کی جہت سے ماورائیت ہو جاتی ہیں ۔شاید یہ بات ہر شخص وہ صوفی ہو یا نہیں پر منطبق ہوتی ہے کہ وہ کبھی شہودی ہو جاتا ہے اور کبھی وجودی ۔جب کچھ خاص لمحات میں ہم دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو جاتے ہیں اور عارف و معروف میں فاصلے ختم ہو جاتے ہیں، تو ہم وجودی ہو جاتے ہیں ۔لیکن یہ کیفیت لمحاتی ہوتی ہے اور پھر ہم معلوم دنیا میں واپس آتے ہیں تو ہم شہودی بن جاتے ہیں ۔یہ دونوں تجربات ہیں اور دونوں عام معنوں میں وقوفی cognitive نہیں ۔ تصوّف اور دوسرے سری فلسفوں اور مذاہب کے مطابق Experiencer بیچ میں ہٹنا چاہیے تب ہی اللہ یا حقیقت کلی عرفان ممکن ہے ۔خدا کا عرفان کوئی ایسی چیز نہیں کہ جسے متعین کیا جاسکے یا جس کا ٹھیٹ معنوں میں تجربہ کیا جاسکے ۔ ستن اور پیوستن کی اصطلاحیں جو اس سلسلے میں وضع کی گئی ہیں حقیقی اختلاف کو ظاہر نہیں کرتی ۔ وصال مطلق معنوں میں کبھی ہوتا ہی نہیں ہے اور نہ ہی کسی بڑے عجمی یا غیر عجمی صوفی نے اس کا دعوی کیا ہے ۔ وائٹ ہیڈ نے اپنی مشہور کتاب ''دورِ جدید میں سائنس'' میں سری نظریہ کی ترجمانی کرتے ہوے خدا کو ناممکن الحصول تلاش Unattainable quest سے تعبیر کیا ہے ۔اگر ہم ذرا غور کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کسی ایسی شے کا نام نہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ وہ یہ ہے یا وہ ہے اور جس کا ہم تصور کر سکیں یا جس کا تجربہ کر سکیں ۔خدا کو پانا کسی Feeling یا جذبے کا نام بھی نہیں ہے ۔خدا کیا ہے؟ اس کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں ۔ایک بات طے ہے کہ وہ زندہ حقیقت ہے مومنین کے لیے ۔وہ محیط ہے، ہر لمحہ اس کی شان نرالی ہے ۔وہ زندگی کی غیوبیت

Mystery ہے۔ اس کا ظہور چار سو ہے، ہر چیز اسی سے ہے۔ زندگی، ہر دم رواں جاوداں زندگی جو ہر آن نئے رنگ میں دکھتی ہے، جو ہر لمحہ آگے کی اور کسی نامعلوم منزل کی طرف گامزن ہے دراصل اپنے اندر خدا کی صفات کی جلوہ گری ہے۔ ہر طرح سے محدود انسان کے لیے خدا کی لامحدودیت کا مکمل تجربہ ممکن نہیں جیسا کہ اسلام کے اس عقیدے کہ خدا کا دیدار اس دنیا میں ممکن نہیں ہے، سے متشرح ہوتا ہے۔ آخرت میں بھی ان معنوں میں دیدارِ خداوندی ممکن نہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ وصال اپنے مطلق معنوں میں ہو گیا۔ اللہ تو آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور جیسا کہ غزالی نے وضاحت کی ہے وہ نور ہے جس سے آنکھیں دیکھ پاتی ہیں وہ نہ آسمان میں، نہ زمین میں نہ ان سے پرے کوئی مخصوص شے ہے۔ Theology، Autology ہے۔ جیسا کہ مشہور عالم مذاہب و سریت آنند کمارا سوامی سریت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے تھے۔ بندہ بندگی یا عبودیت سے مطلق معنوں میں ورائیت کبھی بھی نہیں حاصل کر پاتا ہے۔ شانِ بندگی دے کر شانِ خداوندی لینا کسی بھی سری مفکر یا صوفی کے نزدیک ممکن نہیں۔ اگر خدا مطلق شعور اور وجود کا نام ہے تو یہ زماں و مکاں میں قیدِ جسم سے بندھے بندہ کے لیے ناممکن الحصول ہے۔ بندہ سے اضافیت کی حد بندی کسی بھی طریقے سے ہٹائی نہیں جا سکتی۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ صوفیا نے عشق کی فراوانی، اس کی افزودگی اور ابدیت کی بات کی ہے۔ صوفی محبت سے عبارت ہے۔ صوفی کا محبوب کبھی کھل کر سامنے نہیں آتا۔ اسی لیے محبت کا عمل کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ذاتِ خداوندی گہرائیوں میں ان گنت پردوں کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ ان گہرائیوں میں کسی بھی شخص یا ولی کی مکمل رسائی کبھی ممکن نہیں۔ صوفی کو دائمی محبت اور نہ ختم ہونے والی تلاش ہے۔ وصال ہر آن بس ہونے کو ہوتا ہے لیکن ہوتا نہیں۔ صوفی شاعری میں اسی لیے شکایتیں ہیں۔ شنکر جیسے ویدانتک وجودی کے لیے بھی مناجات کے بغیر چارہ نہیں۔ ابن عربی جو اسلام میں وجودیوں کے سرخیل تسلیم کئے جاتے ہیں کو بھی گڑ گڑانے سے کبھی مفر نہ ہوا۔ حضور ﷺ کا عبادت میں انہماک اس حد تک تھا کہ پاؤں متورم ہو جاتے تھے۔ اس لیے اقبال کا صوفیوں سے اس بارے میں کوئی بنیادی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ خود کو فراق کا نمائندہ سمجھتے ہوں اور اکثر صوفیا کو وصال کا۔ یہ ضرور ہے کہ ہر صوفی کو وصال کی تمنا ہے اور اقبال کو بھی ہم کنار یا بے کنار ہونے کی خواہش ہے اور یہ مطلق وصال کی خواہش ہی زندگی کو معنی دیتی ہے۔

یہ بات کہ عجمی تصوف کی شاعری دورِ انحطاط میں ہوئی ہے یا انحطاط اس کے لیے ذمہ دار ہے، تاریخی حقائق سے براہ راست ٹکراتی ہے۔ سید حسین نصر نے اس الزام کا تشفی بخش جواب دیا ہے ہر تہذیب میں دورِ عروج میں سرّی شاعری ہوئی ہے۔ سری یا صوفیانہ شاعری اعلیٰ قسم کی تخلیقی کاوش ہے۔ بحیثیت آرٹ اس کا منفرد مقام ہے۔ حافظ کی شاعری کی جمالیاتی اہمیت تاج محل اور الحمرا سے کم نہیں۔ اگر صوفی شاعری سلا دیتی ہے تو آرٹ کے اکثر مظاہر بھی ایک خوش آئند سکر کی کیفیت ناظرین یا سامعین پر وارد کرتے ہیں (سکر کو صرف بے

ہوشی کے معنی میں لینے کی ضرورت نہیں ہے، یہ روح کی آسودگی بھی ہے۔) فن خواہشات اور جذبات کا ٹھہراؤ ہے جیسا کہ جوائس نے اپنی مشہور ناول A Portrait of the Artist as a Young Man میں وضاحت کی ہے۔ مشرقی جمالیات کا بھی یہی رجحان ہے خوبصورتی ایک قدر بڑی حد تک اسی لیے ہے کہ وہ انسان کو زماں و مکاں سے ماورائیت کا حسین احساس دیتی ہے۔ روح کے نہاں خانوں میں جہاں انبساط ہی انبساط ہے، ہمیں لے جاتی ہے۔ سارے مذاہب کا مشترکہ نظریہ ہے کہ نجات کے لیے عمل نہیں بلکہ روحانی آسودگی، Becoming نہیں Being بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ محبت بھی تو خوبصورتی کی ایک قسم ہے۔ موسیقی کی مسلّمہ اہمیت کے پیچھے وہ سکر کی کیفیت ہی ہے جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔ کیا محبت یا عشق جس کے اقبال موئید ہیں، کو سکر کی ذیل میں نہیں سمجھا سکتا؟ ذکر و فکر، سوز و ساز، عبادت و مناجات سب میں ایک لطیف قسم کی سکر جیسی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کا حسن اسی سکر کی وجہ سے ہے جسے اقبال حافظ کا زہر کہتے ہیں۔ معرفت تو ایک شراب ہی ہے۔ جب محبوبِ ازلی جھلکیاں دکھاتا ہے تو کس زلیخا کے بس میں ہے کہ ہوش بحال رہے۔ محبوب کی ایک جھلک دیکھ کر انگلیاں تو کیا عاشق تو سینے تک چھلنی کر دیتے ہیں۔ ممتا اور پیار کے مختلف رنگوں کا حسن ان میں سکر کا عنصر ہے۔ Transcendence، جو مذہب کی جان ہے، میں سکر کی وجہ سے کشش ہے۔

عجمی صوفی شاعری کو اصولی طور پر مخربِ اخلاق نہیں کہا جا سکتا۔ اکابر صوفیا کی زندگیاں اعلیٰ اخلاق کا نمونہ آج تک تصور کی جاتی ہیں۔ اسلام میں اخلاقیات پر سب سے اہم کام صوفیا ہی کا رہا ہے۔ وعظ کی محفلوں میں رنگ صوفیا کے تذکروں سے بھرا جاتا ہے جن میں اعلیٰ اخلاق کا درس ہے۔ حلال و حرام کی تفریق کا سب سے زیادہ لحاظ صوفیا نے کیا ہے۔ حسن بصری سے شیخ علوی تک سب اکابر صوفیا کمال احتیاط کی زندگی گزارتے تھے۔ تصوف کی تقریباً ساری کتب میں اس کو تصوف کا اہم عنصر قرار دیا گیا ہے۔ یہ صوفیا کا اجماع ہے کہ اتباعِ رسول ﷺ کے بغیر معرفت نہیں۔ شریعت کو طریقت کے لیے پہلا زینہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ کمزور طبیعت کے لوگوں نے تصوف کا سہارا لے کر اخلاقی گمراہیاں روا رکھی ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تصوف کی ذات پر الزام دھرا جائے۔

یہ الزام کہ تصوف کے نام پر دین کی باطنی تفسیر کی گئی اور جہاد کو کالعدم قرار دیا گیا، تاریخی طور پر بلا جواز ہے۔ بڑے بڑے صوفیا نے جہاد میں حصہ لیا۔ جابر حکمرانوں کو کھری کھری سنائیں اور ان کے عتاب کا شکار ہوئے۔ دورِ جدید میں بھی کچھ جہادی تحریکوں کے روحِ رواں صوفیا رہے ہیں۔ دین کی باطنی تفسیر جو ظاہر کو فریبِ محض کہہ دے، شاید ہی کسی عجمی صوفی سے منسوب ہے۔ باطنیوں کی شدید تنقید ابن تیمیہ جیسے لوگوں نے ہی نہیں کی بلکہ غزالی اور ابن عربی نے بھی۔ اقبال نے خود لکھا ہے کہ انھوں نے تاریخِ تصوف لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن کام

ادھورا رہ گیا، جو مفروضے ان کے ذہن میں تھے، تاریخ میں ان کے لیے شہادت ملنا دشوار ہے۔ باطنیوں نے بھی تلوار کو نیام میں رکھنے کی بات نہیں کہی۔ جہادِ اصغر اور اکبر کا فرق حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔ اسلام میں دیگر مذاہب کی طرح جہاد بالنفس فرض عین ہے، جس کی بدولت ایمان کی حلاوت، قرب الٰہی یا معرفتِ الٰہی ممکن ہو جاتا ہے۔

پچھلی چند دہائیوں میں تصوّف پر کیے گئے کام سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ یہ مفروضہ کہ تصوف جس کے برگ و بار عالم اسلام میں بالعموم اور عالم عجم میں بالخصوص پھوٹ پڑے، سرزمین اسلام میں اجنبی پودا ہے، مستشرقین کی اختراع ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ اب تقریباً حتمی طور پر ثابت کر چکا ہے کہ سریت ہر دین کی جان ہے۔ ظاہر پرستی Exotericism دین میں نئی چیز ہے، دین کی distortion ہے۔ روایت پرست مفکرین نے مذہب اور سریت کے مابین رشتے کی وضاحت کی ہے۔

اقبال کے جملے کہ تصوف وجودی اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے کو تصوف کا وجود ہی سرزمیں اسلام میں اجنبی پودا نقل کیا گیا اور اکثر ناقدین نے اس جملے کو ان کی واضح تحریروں، ان کی زندگی اور ان کے اور بنیادی متصوفانہ خیالات کی روشنی میں دیکھنے کی زحمت نہیں کی اور اس کو ان کی تصوف دشمنی پر محمول کیا، اگرچہ علامہ نے اس کی پرزور تردید کی تھی۔ اگرچہ خود اقبال نے بعد میں ایک لحاظ سے وجودی تصوف کی بھی بازیافت کی تھی اور ان کے ہاں بھی عجمی تصوف سے منسوب نظریہ وحدت الوجود اور تنزلات کی بازگشت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم ان کی شاعری سے کم اور ان کی نثر بالخصوص ان کی ''تشکیلِ جدید'' سے کافی شہادتیں فراہم کریں گے۔ شاعری سے یہاں اس لیے کم استشہاد کریں گے کہ وہاں ہر قسم کے نظریے کے لیے کچھ نہ کچھ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔ صرف نمونے کے لیے یہ چند اشعار پیامِ مشرق سے:

من از بود و نبود خود خموشم اگر گویم کہ ہستم خود پرستم

اور

تلاش او کنی، جز خود نہ بینی تلاش خود کنی، جز او نہ نیابی
نوا در ساز جاں، از زخمہ تو چساں در جانی واز جاں برونی
نفس آشفتہ موجے از یم اِوست نے ما نغمہ ما از دمِ اوست
حریمش آفتاب و ماہ و انجم دل آدم درِ نکشادہ او
چہ گویم نکتہ زشت و نکو چیست زباں لرزد کہ معنی پیچدار است
بروں از شاخ بینی خار و گل را دروں او نہ گل پیدا نہ خار است

گر چہ یہ بات اکثر نقادوں نے تسلیم کی ہے کہ ان کی شاعری میں بتدریج روایتی یا عجمی تصوف کی طرف مراجعت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ آخر عمر میں یوسف سلیم چشتی کے بقول پوری طرح وجودی ہو گئے تھے۔ ''تشکیلِ جدید'' کے یہ جملے کس قدر واضح ہیں ''یہ دنیا اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ، اس شے کی میکانکی قوت سے لے کر جسے مادے کا ایٹم کہتے ہیں انسانی انا کے تصور کی بالکل آزادانہ حرکت تک انائے اعظم کا خود کو ظاہر کرنا ہی'' اور ''اس انانیت کے ظہور کے درجے ہیں۔'' خطبۂ صدارتِ مسلم لیگ میں کہا تھا ''مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست، روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں''۔ ''تشکیلِ جدید'' میں ابن عربی کے اہم جملہ ''الحق محسوس والخلق معقول'' کو صحیح مان کر حوالہ دیتے ہیں۔ بایزید بسطامی کے بیان کو جو آغازِ آفرینش کے متعلق دیا گیا ہے ''جیسا تب تھا ویسا آج بھی ہے'' اور جس کے معنی تقریباً وہی ہیں جو متہم شدہ نظریۂ ابدیتِ عالم سے نکلتے ہیں، کو بھی صحیح مان کر وہاں حوالہ دیتے ہیں۔ قدمِ ارواحِ کاملہ تو اس سے بہت چھوٹی بات ہے۔ قدمِ ارواح کا نظریہ دراصل قرآنی آیت: ''نفخت من الروحی'' سے براہ راست مستنبط ہوتا ہے۔ اگر انسان میں ایک ایسا عنصر ہے جو عرفان الٰہی کو ممکن بناتا ہے جیسا کہ تمام سری ہدایات جو مختلف مذاہب میں ہیں، کا مشترکہ ادّعا ہے تو قدمِ ارواحِ کاملہ کے نظریہ پر اعتراض کیوں؟ مذہبی تجربہ جو اقبال کی تشکیلِ جدید میں بنیادی دلیل کے طور پر استعمال ہوا ہے اور ان کا تصورِ عشق جس بنیاد پر کھڑا ہے، وہی چیز قدمِ ارواحِ کاملہ کے حاملین بھی اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی ملحوظِ نظر رہے کہ تمام سری فلسفے نفس کو فانی اور روح کو غیر فانی مانتے ہیں۔ مسلم مفکرین نے نفس اور روح کے مابین نازک لیکن اہم فرق کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ نفس کے تقدم کا کوئی بھی مذہب اور صوفی مفکر قائل نہیں لیکن روح میں الوہی عنصر جس کے قدیم ہونے پر سب متفق ہیں، کی موجودگی کی وجہ سے تخلیق شدہ ماننے سے انکاری ہیں۔ دراصل مذاہب کے درمیان نظریۂ تخلیق اور نظریۂ ارواح کے حوالے سے بنیادی فرق نہیں ہے، جیسا کہ روایت پسند مفکرین نے صراحت کے ساتھ واضح کیا ہے۔ قرآن میں نفس اور روح کو ایک ہی معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اگر چہ اس موضوع پر خامہ فرسائی کرنے والے کچھ لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے۔ اقبال نے بھی نفس اور روح کے نازک لیکن بنیادی فرق کو کہیں کہیں ملحوظِ نظر نہیں رکھا ہے۔

وجودیوں پر یہ اعتراض کہ وہ عالم کو دھوکہ سمجھتے ہیں نہ کہ حق کا مظہر، سراسر غلط ہے۔ یہ الزام بھی غلط ہے کہ تصوف میں رہبانیت کو تعلیم ہے۔ عجمی تہذیب بحیثیت مجموعی ارضی تہذیب ہے۔ اس لیے رہبانیت کو زیادہ جگہ بھی نہیں دی۔ سارے ایرانی حکما و صوفیا زمین سے بڑی حد تک وابستہ رہے ہیں۔ اکابر صوفیا نے رہبانیت کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ اکثر صوفیا شادی شدہ تھے۔ اور لوگوں کے ساتھ خوب ملتے جلتے تھے۔ کچھ دیر تک خلوت میں سب صوفیوں کو رہنا پڑتا ہے لیکن خلوت بذاتِ خود مقصود نہیں۔ غاروں میں رہنا بالعموم صوفیوں کے نزدیک

مذموم ہے ۔ابن عربی نے صراحت کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے کہ اعلیٰ منزل یہ ہے کہ جلوت میں بھی خلوت نصیب ہو۔حضور ﷺ پہلے پہلے خلوت پسند کرتے تھے، بعد میں جب اللہ کی حقیقت اور واشگاف ہوئی تو انھیں خلوت و جلوت میں یکساں یکسوئی حاصل ہو جاتی تھی ۔ابن عربی نے اس طرف ہماری توجہ دلائی ۔ترکِ دنیا کا الزام شاید کچھ کمزور طبیعت کے صوفی نما لوگوں پر لگایا جاسکتا ہے،لیکن اکابر صوفیا جن کا زیادہ تر تعلق عجم سے ہی ہے، اس الزام سے بری ہیں ۔صوفیوں کا قول ''ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولا ترکِ ترک'' اقبال کو تسلیم ہے ۔انکے ہاں ''خلوت آغاز است وجلوت انتہا است'' ہے ۔صوفیا نے کبھی بھی ذاتِ الٰہی کی تنزیہی حیثیت کا انکار نہیں کیا اور انھوں نے اگر تشبیہ پر زور دیا ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ Pantheism کا الزام لگایا جاسکتا ہے ۔تمام صوفیا نے بشمول منصور حلاج کے ذاتِ باری کی ماورائیت یا تنزیہہ کی بات کی ہے ۔اس سلسلے میں ابن عربی نے فصوص وفتوحات دونوں میں غیر مبہم الفاظ میں تنزیہہ کی بات کی ہے ۔

اقبال کا یہ بیان کہ دین میں باطنی معنی تلاش ہی نہ کیے جائیں یا وہ وہاں ہے ہی نہیں، قابل قبول نہیں ہے ۔مجموعی طور پر امت نے ٹھیٹ ظاہریت کبھی تسلیم نہیں کی ۔یہ تنقیدی دبستانوں کے اس مسلّمہ نظریے کہ الفاظ کے معنی تہہ درتہہ ہو سکتے ہیں، کے خلاف بھی جاتا ہے ۔اگر اقبال صوفیانہ روایت کے تناظر میں ہی اپنی بات رکھتے ہیں تو تاویل اور سری یا باطن رخی تفسیر وتفہیم اپنانے سے گریز کیسے کر سکتے ہیں ۔پیام مشرق کا مبلغ یا حکیم اقبال اور خطبات کا متصوف فلسفی اقبال جگہ جگہ اس کا استعمال کرتا ہے ۔اقبال کے ہاں ہبوطِ آدم ہو یا اسرا یا معراج یا مہدی یا آثار قیامت یا معاد و جنت وجہنم یا کفر وسلام کے غالب تصورات باطن رخی تفسیر یا تاویل کا واضح اثر ملتا ہے ۔باطن رخی تفہیم کی یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

تو اے شیخ حرم شاید ندانی جہان عشق را ہم محشرے است
گناہ و نامہ و میزان ندارد نہ او را مسلمی نی کافری ہست
ز رازی معنی قرآں چہ پرسی ضمیر ما بآیاتش دلیل است
خرد آتش فروزد، دل بسوزد ہمیں تفسیر نمرود و خلیل است

فلسفہ ہے ہی باطن کی طرف مراجعت ۔مشرق کا حکیم ہونا بھی اسی مراجعت کا متقاضی ہے ۔اس امت کا حکیم ہونا جس کے تقریباً سارے بڑے لوگ مجاز سے حقیقت کے مراجعت کے داعی ہوں یا عرفان یا تصوف سے متاثر ہی نہیں ،اس کے امیں بھی ہوں، کیسے ممکن ہے کہ اقبال اس سے اصولی طور باغی ہوں؟ سوز عشق سے الکتاب کا مطالعہ داخلی سری یا باطن میں چھپے لولوئے لالہ ہی ڈھونڈ نکالنے کا وسیلہ تو ہے ۔

اقبال کی اس رائے کو قبول نہیں کیا جاسکتا کہ صوفیا نے توحید کی ضد کثرت کو سمجھا اور شرک کو نہیں سمجھا۔

اگرچہ اقبال نے خود لاموجود الااللہ کہہ کر اس اعتراض کو تقریباً زائل کیا ہے، اس سلسلے میں کچھ اور نکات کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ صوفیا نے کثرت کا اور اضافی معنی میں اس کی خدا سے غیریت کا کبھی انکار نہیں کیا۔ فوق الصور ذات مختلف صورتوں میں ہی ظاہر ہوتی ہے۔ غیب الغیب یا ذات الذات خواہش ظہور کے بغیر صوفی کے مطلب کی چیز ہے ہی نہیں۔ اس سے نہ محبت کی جا سکتی ہے، نہ اسے دعا دی جا سکتی ہے۔ صوفیا کا نہ صرف کثرت کے وجود (اضافی ہی سہی) اور ایک لحاظ سے غیریت پر نہ صرف پورا پورا ایمان ہے، بلکہ اس کو پورے ہوش کے ساتھ بغیر اپنے Reference کے دیکھنے کو، خدا کو دیکھنے سے تعبیر کیا ہے۔ دورِ جدید کی ایک سریت پسند مصنفہ سمان ویل نے خدا کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی 'God is attention without distraction'۔ صوفی کا مطمح نظر خدا کی آنکھ سے عالم رنگ و بو اور دوسرے عالموں کو دیکھنا ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ توحید کے ایک مابعد الطبیعاتی معنی ہیں، جو توحید کی سب سے اعلیٰ درجہ کی معرفت سے عبارت ہے۔ چوں کہ مابعد الطبیعات تعریفاً حقیقت کا عرفان ہے، جیسا کہ روایت پسند مابعد الطبیعاتی صوفیا اور صوفی مفکرین نے صراحت کی، اس لیے کلمہ یا توحید کے مابعد الطبیعاتی معنی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس ساری بحث کے باوجود اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اقبال کو تصوف سے کچھ اصولی اختلافات رہے ہیں۔ شاید سب سے اہم اختلاف ان کی انفرادیت پسندی ہے۔ تصوّف کی روایت انفرادیت پسند نہیں رہی ہے۔ احساسِ خودی ہر شخص کا ایک سطح پر ذاتی احساس ہی ہوتا ہے اور عرفان نفس سے ہی عرفان خداوندی ممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن روح Spirit/Nous ایک فوق الشخصی جوہر ہے جسے فرد کے خول میں محصور نہیں کیا جا سکتا اس لیے روایتی تصوف میں انفرادیت پسند فلسفہ کے لیے زیادہ گنجائش نہیں ہو سکتی۔ مابعد الطبیعیات میں بھی حقیقتِ مطلق یا سچائی میں فرد کے میلانات، جذبات و احساسات کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ فنا کے حصول کے لیے ضبط نفس کی منزل دراصل انفرادیت کے احساس کو ختم کرنے کے لیے ہے۔ اگرچہ آخری معنی میں خدا ایک فرد کی شخصی دریافت ہی ہوتی ہے لیکن حقیقتِ مطلق فرد کی کمزوریوں یا تحدیدات سے منزا ہوتی ہے۔ فرد ایک تحدید کا نام ہی ہے۔ چوں کہ اقبال کی انفرادیت پسندی ان کی مجموعی فکر پر زبردست اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی مابعد الطبیعات اور ان کے فلسفے کے دوسرے اجزا روایتی صوفی مسلک سے کسی حد تک مختلف سمت میں رخ کرتے ہیں۔

اقبال کا خدا کو انا کہنا صرف ایک حد تک صحیح ہے کیوں کہ جہاں تک ذات الذات Essence/Godhead/Absolute کا تعلق ہے اس کے متعلق لفظ خودی کا اطلاق صحیح نہیں ہے۔ اقبال Anthropomorphism سے پوری خلاصی حاصل نہیں کر پائے۔ اگر ہم ان کو فنافی الرسول کے مقام سے

متصف مانیں جیسا کہ ایک اقبالیاتی ماہر کی رائے ہے تو بھی وہ ایک کامل صوفی جو فنافی اللہ بھی ہوتا ہے، کے دعویدار نہیں۔

یہاں پروٹگنسٹین کا thinking Essentialist پر واز عجمی اور عربی تصوف کی Catagories پر چسپاں کر کے اور اس حوالے سے ان کے تصور Family Resemblence کا اطلاق اقبال سے منسوب عجمی تصوف کا مفروضہ اور اس بنیاد پر اس کی تنقید کا سقم واضح ہوتا ہے۔

وحدت الوجود کی طرف اقبال کی مراجعت عجمی تصوف کے تئیں ان میں بنیادی فکری تبدیلی کا غماز ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جس چیز کو حقیقی قرآنی تصوف کا نام دیتے ہیں، کیا وہ ایک مخصوص تعبیر کی پیداوار نہیں؟ اسلام کے تقریباً تمام صوفیا اور اکثر علما اپنے زعم میں تو قرآنی تصوف ہی کے قائل ہیں اور یہ ''عجمی پودا'' اسلام ہی کی مٹی سے نمو پاتا ہے۔

اصولی طور پر اس نزاع کو اس طرح حل کر سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک محمود تصوف وہ ہے جس میں ان کے خودی کے فلسفے پر چوٹ نہ آتی ہو ان کے تصور زماں پر بھی آنچ نہ آئے جس میں دوئی کسی نہ کسی معنی میں موجود رہے اور انا کے تحقق کی ضمانت ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا عجمی اسلامی تصوف کے کبار نمائندے اقبال کو یہ سب ضمانتیں دے پاتے ہیں؟ اقبال کا جواب ہاں ہے۔ رومی جو روایتی عجمی تصوف بشمول اس کے وحدت الوجودی فلسفے ہی کے قائل ہیں، میں اگر یہ ضمانتیں نہ ملتی تو ان کے راہ رفیق و راہ ساز کیسے قرار پاتے؟ کیا جنید اور منصور اور شیخ جیلاں ان کے مرد کامل کے نظریہ کے نقیض ہیں؟ کیا نظام الدین اولیا اور ہجویری خودی کے محافظ نہیں؟ اور سرہندی جو سرخیل عجمی صوفیا کی روایت کے امیں ہیں، ان کو اپنے آدرشوں کے ضامن نہیں لگتے؟ قرآنی تصوف وہی ہے جس میں اقبال کے مندرجہ بالا نکات کا تحفظ ملتا ہے اور کبار صوفیا نے شاہراہ عام جسے شریعت کہتے ہیں، کا مکمل لحاظ کر کے اقبال کے دوئی کے سانچے سے جڑے تصورات کو اپنی جگہ تسلیم کیا ہے۔

تصوف اصولی طور پر نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایرانی اور تورانی، حجازی اور عجمی کی تفریق چہ معنی دارد؟ تصوف کو اس کے روایتی نمائندوں نے الدین القیم یا انسان کی ازلی روحانی سرشت کے طور پر سمجھا ہے۔ اسے قوموں کے عروج و زوال، کسی مخصوص نظریہ یا عمل یا سانچے کے زاویوں سے نہیں پرکھا جا سکتا۔ تصوف کی جو مختلف تعبیریں اور تعریفیں منقول ہیں، چند کا ذکر یہاں بات کو واضح کرے گا۔ تصوف محبت اور وجود یا شعور کی خود کی یافت سے عبارت ہے، تزکیہ و احسان ہے، حق کی حضوری ہے،، علم مقامات یا تزئین اخلاقیات ہے، زندگی کے بے پایاں امکانات اور اس کے روئے زیبا کی تلاش ہے۔ یہ حسن پیدا کردن یا حسن کی فراوانی یا تخلیق ہے۔ یہ خدا کی آنکھ سے ہر چیز کو دیکھنے کی سعی ہے یا ہر چیز میں خدا دیکھنا ہے۔ سرمستی و خامشی ہے، فقر کی

میری کا شعور ہے، خدمتِ خلق اور شہادتِ حق یا خیر خواہی ہے۔ یہ کسی کی دید میں تڑپنے اور ان کو جان، پھر جان جاں اور پھر جان جاناں کرنے کا نام ہے، وجود کا انبساط یا اس کی رعنائی کی یافت ہے۔ یہ زندگی کو سود و زیاں سے پرے جینے کا نام ہے۔ یہ من کی دنیا میں ڈوب کر حکمت کے خزانوں کی یافت ہے۔ صدق و خلوص ہے۔ ایمان کو عرفان بنا کر اس کی حلاوت چکھنے کا نام ہے۔ یہ ذوقی و جودیاتی، وجدانی طریقوں سے حق الیقین یا دیدار کو حاصل کرنا ہے۔ یہ لمحۂ حاضر میں جینا ہے۔ یہ ہر کام کو بہترین طریقے پر کرنا ہے، بلکہ کام کے ساتھ ایک ہونا ہے، جب فاعل و مفعول کا فاصلہ ختم ہوتا ہے، اور اس طرح کام کی حلاوت پانا ہے۔ جب تصوف ان سے عبارت ہے اور اقبال اور کبار صوفیا کے ہاں ان کی بازگشت ملتی ہے اور ان کا نام کچھ بھی ہے خوشبو تو تصوف کی ہی ہے۔ اور اس کے نام پر ہی ہر چیز و عمل کو پرکھا جاتا ہے اور خراج وصول کیا جاتا ہے، نہ کہ اس کو دوسرے پیمانوں سے تولا جاتا ہے۔ عرب و عجم کا سوز و ساز اور انسان کی تکریم تو اسی سے ہے۔ یہی وہ نظر اور روشنی ہے جو ہر چیز کو منور کرتی ہے۔ اسی کے طالب سب پیغمبر اور اولیاء ہیں۔ تنقید اس کے نام پر، نہ کہ اس کی کی جاتی ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ کوئی بھی بڑا مسلم مفکر خود کو تصوف کی تابناک روایت سے الگ رکھ سکے۔ اسلام کی تہذیبی میراث میں تصوف انتہائی اہم جز ہے۔ تاریخ اسلام میں تصوف کی روایت بڑی گہری ہے اور ابن تیمیہ جیسے لوگ بھی ایک روایتی سلسلہ میں بیعت تھے اور ان کے تلامذہ نے بھی سلوک پر کتابیں لکھیں۔ اقبال کی زندگی تو حب رسول اور حب اولیا سے عبارت تھی۔ ان کو اکثر صوفیا سے زبردست عقیدت تھی، تصوف کے جتنے بھی بڑے نام ہیں، تقریباً سب کا نام احترام سے لیتے تھے۔ کچھ کے مزارات پر حاضری بھی دیتے تھے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ نطشے کو عجمی ہندی صوفیانہ روایت کے امین شیخ سرہندی کا مرید بنانے کی بات کرنے والا اور سرخیل عجمی صوفیا رومی، سید علی ہمدانی، بایزید اور حلاج وغیرہ کے واسطوں سے زمانہ وسطیٰ کے روایتی صوفیانہ Mindset کے احیا کے وکیل اقبال، تصوف یا سریت کی تاریخ کے ایک اہم اور درخشندہ ستارے ہیں۔ انھیں ہم عجمی صوفیا کی صف میں نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری
ہندواڑہ، کشمیر

جموں و کشمیر میں اقبال شناسی

کشمیر کی سیاسی اور سماجی تاریخ میں علامہ اقبالؒ کی بلند قامت شخصیت نمایاں مقام کی حامل ہے۔ انھوں نے نہ صرف گلشنِ کشمیر کے دل فریب نظاروں، فلک آسا کہساروں، ترنم ریز آبشاروں اور حسین وجمیل مرغزاروں کے دلکش حسن کی منظرکشی کرتے ہوئے

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب

جیسے متعدد اشعار اور نظمیں لکھ کر جنتِ کشمیر کی حسین فضاؤں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے بلکہ فرزندِ کشمیر ہونے کی بنا پر کشمیر ان کی روح کی گہرائیوں میں سمایا ہوا تھا۔ جس کا اندازہ ان اشعار سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اُس باغِ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

یاد رہے کہ کشمیر صدیوں سے محکومی، پسماندگی اور بے چارگی کا ہدف رہا۔ یہ فرزندِ کشمیر علامہ اقبالؒ ہی تھے جنھوں نے کشمیر کے درد کو شدت سے محسوس کر کے ایک مخلص رہنما کی حیثیت سے، کشمیریوں کی سیاسی محکومی، معاشی بدحالی اور نفسیاتی دباؤ کی داستانِ الم اقوامِ عالم کے حریت پسند ایوانوں تک پہنچانے میں تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا۔ چناں چہ ایک جگہ جذباتی لہجے میں فرماتے ہیں

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدردیٔ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

آہ ! یہ قومِ نجیب وچرب دست وتر دماغ

ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

درجہ بالا حقائق کی روشنی میں جب جموں وکشمیر میں اقبالؔ شناسی کی خدمات کا سوال ذہن میں ابھرتا ہے تو اس کی بہت سی جہتیں سامنے آتی ہیں، جس طرح علامہ اقبالؔ کو کشمیر اور کشمیریوں کے ساتھ قلبی انس تھا اسی طرح کشمیری بھی اپنے اس مخلص رہنما کی احسان مندی کا اعتراف مختلف زاویوں سے کرتے آئے ہیں، جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کشمیر کے پیر و جواں کے ذہنوں پر علامہ کا نام و پیام کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ چھایا رہتا ہے۔

جہاں تک جموں وکشمیر میں اقبالؔ شناسی کی خدمات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کی زندگی میں اردو میں جو پہلی کتاب کلامِ اقبالؔ پر تحریر ہوئی تھی تحقیق کے مطابق وہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے مولوی احمدالدین کی کتاب ''اقبالؔ پر ایک نظر'' ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اس کتاب کے شائع ہونے سے کتابی صورت میں اقبالؔ شناسی کی روایت کی بنیاد پڑ گئی۔

جموں وکشمیر میں اقبالؔ شناسی کی خدمات میں جن شاعروں، مفکروں، عالموں، دانش وروں، محققوں اور مورخین و ناقدین نے علامہ اقبالؔ کے فکروفن اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر قابل قدر خدمات انجام دیے ہیں' ان میں منشی محمدالدین فوقؔ، مہجور کاشمیری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، کلیم اختر، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر حامدی کاشمیری، سید علی شاہ گیلانی، پروفیسر محمد امین اندرابی، پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری محمد یوسف ٹینگ، حکیم منظور، پروفیسر غلام رسول ملک، غلام نبی خیالؔ، پروفیسر مرغوب بانہالیؔ، پروفیسر ظہورالدینؔ پروفیسر محمد اسداللہ وانی، ڈاکٹر بدرالدین بٹ، پروفیسر سید حبیب، عبداللہ خاورؔ، پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی' ڈاکٹر نذیر احمد شیخ، پروفیسر بشیر احمد نحوی، پروفیسر تسکینہ فاضل، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ جن مفکروں اور ناقدوں نے ملازمت کے سلسلے میں کشمیر میں اقامت کے دوران اقبالؔ شناسی میں خاطر خواہ اضافہ کیا ان میں پروفیسر آلِ احمد سرورؔ، پروفیسر خوندمیری، پروفیسر سراج الدین، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر قدوس جاوید وغیرہ کی خدمات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ درج بالا اقبالؔ شناسوں نے اقبالؔ اور اقبالیات کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل کام کیا ہے اور علامہ کی دانش وری، تخلیقیت، شخصیت، بصیرت، فکر و نظر، تنقیدی شعور اور سیاسی آگاہی جیسے پہلوؤں پر بصیرت افروز مقالات اور کتابیں لکھی ہیں۔ یہاں پر میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہنا چاہوں گا کہ اقبالؔ شناسی کی تاریخ میں علامہ کی شخصیت اور فکروفن پر جو کام کشمیر میں ہوا ہے وہ اقبالؔ کے تئیں بہترین خراج عقیدت کے مترادف ہے۔ اکیسویں صدی

میں اقبالیات کے حوالے سے کشمیر میں جو کتابیں سامنے آئی ہیں میرے خیال میں ان میں چند کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔جن میں ''اقبالؒ کا تخلیقی شعور''(پروفیسر حامدی کاشمیری)''''اقبال تخلیقیت،جمالیات اور مابعد جدید شعریات''(پروفیسر قدوس جاوید)''اقبالیات کے نئے گوشے''(پروفیسر اکبر حیدری)''اقبال اینڈ دی انگلش رومانٹکس''(پروفیسر غلام رسول ملک)''جامعہ کشمیر اور اقبالیات''''اقبال اور عالم عربی''(ڈاکٹر بدرالدین بٹ)''اقبال اور مسائل تصوف''(پروفیسر بشیر احمد نحوی)''اقبال اور ان کے معاصر شعرا و ادبا''(پروفیسر تسکینہ فاضل)''نظریہ اجتہاد اور اقبال''(ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی)وغیرہ شامل ہیں۔ان تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی امور میں اختلاف ہونے کے باوجود یہ کتابیں مطالعۂ اقبالؒ کے تعلق سے نئے امکانات کی نشان دہی بھی کرتی ہیں اور اقبالیات کے دانش وروں اور ناقدوں کو دعوتِ فکر بھی دے رہی ہیں۔مثلاً اکتشافی تنقید کے بنیاد گزار پروفیسر حامدی کاشمیری کی تنقیدی کتاب ''اقبالؒ کا تخلیقی شعور'' میں مطالعۂ اقبالؒ کے پیش نظر روایتی انداز کی تفہیم و تشریح کے برعکس کلام اقبالؒ کا فنی اور تخلیقی تجزیہ پیش ہوا ہے۔اسی طرح پروفیسر قدوس جاوید کی تنقیدی تصنیف ''اقبالؒ تخلیقیت،جمالیات اور مابعد جدید شعریات''اقبالیاتی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے،کیوں کہ اس میں جدید تنقیدی تھیوریز کے پیش نظر اقبالؒ کے تخلیقی شعور کی بلندی،تخلیقی کارگزاری اور شعری جمالیات کی تشکیل پزیری کو ناقدانہ بالغ نظری سے موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔
کتاب ''خطبات اقبال پر ایک نظر'' میں پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی نے علامہ اقبالؒ کی شہرہ آفاق تصنیف ''The Reconstruction of religious thought in islam'' کے مبادی مسائل اور مباحث پر دانش ورانہ گفتگو کی ہے۔اسی طرح ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی کی کتاب ''نظریۂ اجتہاد اور اقبال'' میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت اور علامہ اقبال کے تصورِ اجتہاد پر تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نگاہ سے بصیرت افروز روشنی ڈالی گئی ہے۔

کشمیر میں اقبال فہمی اور اقبالؒ شناسی کو فروغ دینے میں کچھ اداروں کا رول بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ان میں جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، اقبالؒ اکادمی کشمیر اور اقبالؒ انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی وغیرہ شامل ہیں۔اقبالؒ انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی وہ واحد ادارہ ہے جو اقبال فہمی اور اقبالؒ شناسی کے میدان میں تحقیقی و تنقیدی،تالیفی و تصنیفی اور مجلسی و تدریسی سطح پر تاریخی کردار ادا کر رہا ہے۔

اس ادارے سے عصرِ حال تک سو سے زائد افراد نے اقبالیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔علامہ اقبالؒ کے کلام و پیام کو عام قاری تک پہنچانے میں کشمیر سے شائع ہو رہے اخبارات اور رسائل کی خدمات بھی قابل داد ہیں۔اس تعلق سے اخبارات میں آفتاب، سرینگر ٹائمز، کشمیر عظمیٰ، گریٹر کشمیر، قومی وقار، مومن، تعمیل ارشاد اور رسائل میں اقبالیات، بازیافت، شیرازہ، حکیم الامت وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس

سلسلے میں دوردرشن، کیندرسرینگر اور ریڈیو کشمیر سرینگر کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔

محکمہ تعلیم جموں وکشمیر کا یہ قدم بھی قابل ستائش ہے کہ پچھلے چند برسوں سے یہ محکمہ ریاستی سطح پر تعلیمی اداروں میں یومِ اقبالؔ کی تقاریب منعقد کرا رہا ہے۔تاہم سرکاری سطح پر ہائر اسکینڈری سے لے کر کالج سطح کے نصاب میں کلامِ اقبالؔ کو ترجیحی بنیادوں پر شامل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان اداروں میں زیرِ تعلیم افراد بھی صحیح معنوں میں اقبالؔ کے مذہبی، اخلاقی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی و ادبی افکار سے روشناس ہوسکیں۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد آخر پر میں اس حقیقت کا اظہار کرنا مفید سمجھتا ہوں کہ کشمیر کی نئی نسل جس جوش و جذبے کے ساتھ اقبالیاتی سمیناروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں اور اس میں کلامِ اقبالؔ کو پڑھنے، سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا جو رجحان نظر آ رہا ہے وہ کشمیر میں کلامِ اقبالؔ کی مقبولیت کا تسلی بخش ثبوت بھی پیش کر رہا ہے اور اقبالؔ شناسی کے روشن تر امکانات کا جواز فراہم کرتے ہوئے علامہ کے اس مشہور شعر کی معنوی عکاسی بھی کر رہا ہے کہ

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

☆☆☆☆

ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی (ابوظہبی)

تصویر میں جھلک ہو حجابِ جمال کی
صورت گری میں ہے یہی صورت کمال کی

فرصت کبھی ملی تو بتائیں گے ہم تمھیں
کیسے تمھارے بعد طبیعت بحال کی

تعبیرِ خوابِ رم انھیں معلوم ہی نہیں
لائے ہیں جو نکال کے آنکھیں غزال کی

کرتے ہو بے سبب مرے اسلاف کی ہتک
پھر وجہ پوچھتے ہو مرے اشتعال کی

مکر و فریب، ظلم و ستم ہو چلا سوا
کب آئے گی کمک ترے جاہ و جلال کی

فرماں رسا ہے مثبت و منفی کا زیر و بم
تمہید بس یہی ہے عروج و زوال کی

ہم پر لگا رہے ہیں وہ الزام رات دن
کرتے ہیں جو تجارتیں قتل و قتال کی

اے برف ساز دے مری اس بات کا جواب
کیسے بنی جنوب میں بستی شمال کی

ہر انتہائی قرب کی حد پر ہے فاصلہ
خدمت گزارِ ہجر ہے ساعت وصال کی

کیا واقعی ہوئے ہیں کبھی ملتوی امور
کب منتقل ہوئی ہے گھڑی انتقال کی

عاصمؔ غریبِ شہر ہوا جب کبھی فروخت
قیمت نہیں چکائی گئی بال بال کی

☆☆☆☆

ظہورالاسلام جاوید (دبئی)

جہاں پہ طے ہو اَنا کو زوال کیا ہو گا
شکستِ دل کا وہاں احتمال کیا ہو گا

اے زندگی مجھے سارے جواب آتے ہیں
ہوں منتظر تیرا اگلا سوال کیا ہو گا

ہوا غروب جو سورج تو چاند نکلا ہے
زوال ایسا اگر ہے کمال کیا ہو گا

نہ سرخیِ لبِ خنجر نہ تابِ نوکِ سناں
کشید اس طرح حسنِ خیال کیا ہو گا

زمیں کے ساتھ جو گردش میں ساتھ ساتھ رہے
وہ ماہتاب کہیں پر ہلال کیا ہو گا

کوئی بھی پرسشِ حالات کیا کرے جاویدؔ
مسافرت میں غریبوں کا حال کیا ہو گا

☆☆☆☆

عشرت آفرین (امریکا)

ہماری ماؤں نے دکھ سہے تھے جو ہم نے لکھے
نہ اب سنئے ہیں نہ جب سنئے تھے جو ہم نے لکھے

جو ہم نہ لکھتے تو کون لکھتا الم ہمارے
کہیں نہیں یہ لکھے گئے تھے جو ہم نے لکھے

خراب و خستہ تھا حال طومار خانِ دل
یہ چند اوراق بچ رہے تھے جو ہم نے لکھے

کہانیاں اصل میں لکھی ہی نہیں گئی ہیں
کٹے پھٹے چند حاشیے تھے جو ہم نے لکھے

وہ چٹھیاں جو جلائی جاتی رہی ہیں صدیوں
وہ دکھ کے بے نام سلسلے تھے جو ہم نے لکھے

درونِ خانہ وہ آنسوؤں سے لکھے گئے خط
کہ نام ان پر نہیں لکھے تھے جو ہم نے لکھے

ہمارے چاروں طرف جو بکھرے ہوئے تھے دکھ سکھ
ہمارے دکھ سے بہت بڑے تھے جو ہم نے لکھے

شفیق مراد (جرمنی)

گفتگوئے یار میں تھا شاعری کا ذائقہ
بات کرنے کا ہمیں بھی ہو گیا تھا حوصلہ

باندھ کر رختِ سفر جب جانب منزل چلے
زندگی کو ہم نے دیکھا سلسلہ در سلسلہ

نارسائی زیست میں کیوں چل رہی ہے ساتھ ساتھ
جس قدر میں بڑھ رہا ہوں ،بڑھ رہاہے فاصلہ

فون پر سمجھا تھا میں، آواز شاید کٹ گئی
درحقیقت کٹ رہا تھا دل کا دل سے رابطہ

حسنِ رفتہ کی جھلک مجھ کو دکھاؤ، جب کہا
ٹوٹ کر پاؤں میں میرے آگرا تھا آئینہ

عشق کی شدت مقدر حسن کا ٹھہری مرادؔ
دے دیا ترتیب مل کر زندگی کا زائچہ

☆☆☆☆

اقبال طارق (بحرین)

بکھری ہوئی حیات ہے پتھر نہ ماریے
یہ عمرِ التفات ہے پتھر نہ ماریے

سایہ فگن ہے ہم پہ ابھی زلفِ عنبریں
وقتِ تجلیات ہے پتھر نہ ماریے

دل ہے حسین چیز اسے پیار کیجیے
شیشے کی کائنات ہے پتھر نہ ماریے

حسن و جمالِ یار کی رعنائیوں کی خیر
دنیائے حادثات ہے پتھر نہ ماریے

کچھ انتظار کیجیے صبحِ بہار کا
غم کی سیاہ رات ہے پتھر نہ ماریے

اک درد ناک گیت ہے حسنِ جمالِ شب
ذوقِ جمالیات ہے پتھر نہ ماریے

طارقؔ کہا ہے ساغر و مینا نے ہم سے آج
ہر سو ہماری ذات ہے پتھر نہ ماریے

مظفر احمد مظفر (لندن)

خمارِ چشمِ فسوں ساز صبح و شام رہے
نہ میکدہ نہ صراحی نہ دورِ جام رہے

عجیب ڈھنگ سے گزرا ہے عرصۂ ہستی
شکست خوردہ رہے ہیں نہ با مرام رہے

نفس نفس نے صدائے شکستِ دل کو سنا
قدم قدم غمِ الفت کے اِژدہام رہے

یہ سچ کہ حکمِ رہائی پہ اعتبار نہ تھا
جو زیرِ دام تھے طائر وہ زیرِ دام رہے

یہ اوجِ تشنہ لبی ہے یا ارتقائے طلب؟
کہ پی کے سات سمندر بھی تشنہ کام رہے

یہ اور بات کہ ہم لوٹ آئے رستوں سے
ہمارے بعد جو آئے وہ شاد کام رہے

وہ ذرّے راہِ وفا میں رہے تھے جو پامال
ہجومِ شوق میں مائل بہ انتقام رہے

نشاطِ جشنِ بہاراں تمھیں مبارک ہو
مآلِ خندۂ گل ہی ہمارے نام رہے

یہ کیسا دورِ محبت ہے اے تحیّرِ عشق!
صلیب و دار کے باقی نہ اہتمام رہے

دلیلِ صبحِ ازل ہو ترے جمال کی آنچ
"ترے خیال سے روشن چراغِ شام رہے"

تھکن سے چُور مظفرؔ رہے ہیں پائے خِرد
پہ اہلِ قافلۂ عشق تیز گام رہے

☆☆☆☆

جیم جاذل (لندن)

مجھ سے اونچا ترا قد ہے، حد ہے
پھر بھی سینے میں حسد ہے، حد ہے
میرے تو لفظ بھی کوڑی کے نہیں
تیرا نقطہ بھی سند ہے، حد ہے
تیری ہر بات ہے سر آنکھوں پر
میری ہر بات ہی رد ہے، حد ہے
عشق میری ہی تمنا تو نہیں
تیری نیت بھی تو بد ہے، حد ہے
زندگی کو ہے ضرورت میری
اور ضرورت بھی اشد ہے، حد ہے
بے تحاشہ ہیں ستارے لیکن
چاند بس ایک عدد ہے، حد ہے
اشک آنکھوں سے یہ کہہ کر نکلا
یہ ترے ضبط کی حد ہے، حد ہے
شاعری پر ہے وہ اب تک غالب
نام میں جس کے اسد ہے، حد ہے
روک سکتے ہو تو روکو جاذلؔ
یہ جو سانسوں کی رسد ہے، حد ہے

ریاض شاہد (بحرین)

لگائی کس نے صدا پر صدا کوئی تو تھا
جو تُو نہیں تو نہاں دوسرا کوئی تو تھا

درونِ گنبدِ جاں شور سا مچا ہوا ہے
نکل کے سینے سے میرے گیا کوئی تو تھا

کسی نے مجھ سے کہا پھر سے آ گیا ہے تُو
تمھارے شہر میں پہچانتا کوئی تو تھا

دعا تو مانگی بہت پر قبولیت نہ ہوئی
تو گویا مجھ سے بھی یارو خفا کوئی تو تھا

یہ کس کے ٹوٹنے کی سن رہا ہوں آوازیں
جو مجھ میں ٹوٹا وہ شیشہ نما کوئی تو تھا

یہ صحنِ دل جو اچانک سے ہو گیا خالی
تمھاری بزم سے شاہدؔ اٹھا کوئی تو تھا

☆☆☆☆

ناہید ورک (امریکہ)

درد ہونٹوں میں جو دبا رہے گا
ہجر کا ذائقہ بنا رہے گا

تُو مرا دکھ سمجھ نہیں سکتا
رنجِ لاحاصلی جو تھا، رہے گا

میرے تیرے ستارے ملتے ہیں
سو تعلق کا سلسلہ رہے گا

ایک پودا لگایا خواہش کا
اور سمجھی سدا ہرا رہے گا

مجھ کو معلوم ہے کہیں نہیں میں
تو اگر ہے کہیں، بتا، رہے گا؟

تیری آنکھوں کے رنگ کہہ رہے تھے
میرے رنگوں سے فاصلہ رہے گا

بول کیسے تجھے معافی دوں
تُو ہمیشہ ہی بے وفا رہے گا

فرزانہ خان نیناں (مانچسٹر، برطانیہ)

آئنے بنانے میں دیر کتنی لگتی ہے
اور ٹوٹ جانے میں دیر کتنی لگتی ہے

انتظار ہے تیری آنکھ کے اشارے کا
کشتیاں جلانے میں دیر کتنی لگتی ہے

صرف ایک لمحے میں اجنبی شناسا تھا
بات کو بڑھانے میں دیر کتنی لگتی ہے

میں سلگتی رہتی ہوں بس ترے لیے ورنہ
آگ کو بجھانے میں دیر کتنی لگتی ہے

کتنی گھاس اگ آئی میرے گھر کے رستے میں
راہ کو مٹانے میں دیر کتنی لگتی ہے

زندگی کی زنجیریں پل میں ٹوٹ جاتی ہیں
اس کے قید خانے میں دیر کتنی لگتی ہے

خوبصورت اک منظر دیکھ کر کہیں نیناں
خود کو بھول جانے میں دیر کتنی لگتی ہے

عابد رشید (شکاگو، امریکا)

بات سے بات یوں نکلتی گئی
تھم گیا وقت رات چلتی گئی

بے ثباتی جسے سمجھتے تھے
اِک نئی زندگی میں ڈھلتی گئی

جب سے خود پر ہوا یقیں مجھ کو
میری تقدیر خود بدلتی گئی

زندگی کیا ہے ایک ردِعمل
جو چلا اس کے ساتھ چلتی گئی

ڈھال بن کر وہ ساتھ ساتھ رہی
جو دعا ہاتھ سے پھسلتی گئی

ہاتھ مَلتے زمیں میں جا سوئے
ہاتھ پر ہاتھ وہ بدلتی گئی

سارے بندھن تو درگزر کے تھے
کُچھ یونہی اپنی بات چلتی گئی

قطرہ قطرہ جب آسماں برسا
اپنا محور زمیں بدلتی گئی

کیا کسی اور سے گلہ کیجے
وہ جو بدلا تو رُت بدلتی گئی

اس نے پَر دے دیے مجھے عابدؔ
جب زمیں پاؤں سے نکلتی گئی

☆☆☆☆

اشفاق کاشف (ہیوسٹن،امریکا)

صاف اس کو سنائی دیتا ہے
میں جو کہتا ہوں بات چپکے سے

بات سے بات کو نکالتا ہے
وہ بدلتا ہے بات چپکے سے

وہ جو چاہے تو کھیل الٹ جائے
جیت بن جائے مات چپکے سے

پار کر لیں گے ایک دن ہم بھی
دنیا کا پل صراط چپکے سے

اس کے ہلکے سے اک اشارے سے
چل پڑیں شش جہات چپکے سے

شام کی سبز شاخوں پر طائر
پڑھ رہے ہیں صلوٰۃ چپکے سے

کس طرح فتح کر لیا تو نے
دل کا یہ سومنات چپکے سے

لشکری کر رہے ہیں ہاؤ و ہو
بہہ رہا ہے فرات چپکے سے

پیالہ بھر دیتا ہے مرا کاشف
دیتا ہے کوئی ساتھ چپکے سے

☆☆☆☆

احمد عرفان (نیویارک، امریکا)

خدا کے گھر کو میں اور اچھا بنا رہا ہوں
کہ اس کے آنگن میں سبز پودے لگا رہا ہوں

یہ ایک مسجد ہے اور پرانی بنی ہوئی ہے
میں جس میں بیٹھا خدا کو دکھڑے سنا رہا ہوں

ذرا سا ٹھہرو کہ روح پھونکوں گا اس میں اپنی
ابھی تو مورت میں اپنے جیسی بنا رہا ہوں

میں صبح دریا سے مل کے آیا ہوں، یار خوش تھا
میں شام صحرا سے دوست ملنے کو جا رہا ہوں

میں خود سے ہنس ہنس کے بات کرتا ہوں اس لیے کہ
اداس چہرے کو مسکرانا سکھا رہا ہوں

بنا رہا ہوں گرا کے دیوارِ خستہ احمدؔ
یتیم بچوں کا میں خزانہ چھپا رہا ہوں

☆☆☆☆

عشرت معین سیما (برلن، جرمنی)

پتوں نے شور اتنا مچایا ہوا کے سنگ
بارش میں پیڑ پھر بھی نہایا ہوا کے سنگ

تاروں نے آسماں نہ سجایا تو کیا ہوا
جگنو نے اپنا رقص دکھایا ہوا کے سنگ

کاغذ کی اک پتنگ نے گر کر زمین پر
بچوں کو خوب خوب ہنسایا ہوا کے سنگ

پاؤں میں بیڑیاں مرے سورج نے ڈال دیں
ناچا خوشی سے ہے مرا سایا ہوا کے سنگ

شامِ فراق ڈھل گئی خوشبو بکھر گئی
آنچل کسی نے اپنا اڑایا ہوا کے سنگ

کھڑکی بھر آسمان سے لا حدِ کائنات
شوقِ نظر میں کوئی سمایا ہوا کے سنگ

اک برگِ گل نے شاخ پہ جیسے جنم لیا
بوئے وفا نے جشن منایا ہوا کے سنگ

بارش ہے ، چاندنی ہے کہ تتلی ہے شوخ رنگ
دیکھوں میں چھت پہ کوئی ہے آیا ہوا کے سنگ

سیماؔ چراغ ہیں تو بجھیں گے کسی بھی دم
آندھی میں کون اپنا پرایا ہوا کے سنگ

☆☆☆☆

انور ظہیر رہبر (برلن جرمنی)

کارِ دنیا میں بہت نام ہمارے دل کا
ابھی دیکھو گے بہت کام ہمارے دل کا

نام پر تیرے دھڑکتا تھا مگر جانے کیوں
نام تو نے کیا بدنام ہمارے دل کا

نہ لگاتے اسے دنیا ترے ہنگام میں گر
برا ہوتا بڑا انجام ہمارے دل کا

اب یہی روگِ جدائی ہے ہمارا جیون
اب یہی سکھ، یہی آلام ہمارے دل کا

نہ ستارے ہیں ، نہ پتھر، نہ ہی جگنو رہبر
پھر بھی روشن ہے ہر اک گام ہمارے دل کا

☆☆☆☆

فیروزہ مجید(پلوامہ،کشمیر)

آنکھ سے ٹپکے خون کو پانی لکھتی ہوں
دل کی زمیں پر عجب کہانی لکھتی ہوں
بیٹھ کے بوڑھی ماں کے لرزاں قدموں میں
بچپن کی اک خواب کہانی لکھتی ہوں
دل کا شہر ہو یا ہو اپنے شہر کا دل
دشت غالبؔ کی ویرانی لکھتی ہوں
اگتے سورج ڈوب گئے ہیں پانی میں
میں تیرے اشکوں کی روانی لکھتی ہوں
حال ہمارا جہل کے اندھیارے میں گم
اپنے پرکھوں کی تابانی لکھتی ہوں
گونگے رشتوں کی انجانی راہوں میں
آوازیں جانی پہچانی لکھتی ہوں
جس دن اٹھاؤں رہ سے کسی کی اک کانٹا
اس دن کی میں شام سہانی لکھتی ہوں
دیکھوں جب بھی سوزاں شمع راتوں کو
اپنے جذبوں کی ارزانی لکھتی ہوں

فرہاد جبریل (ابوظہبی)

یہاں مَیں ایک زمانہ ہی جی کے جاؤں گا
مَیں جانتا ہوں یہاں وقت مختصر ہے مرا

کسی بہانے مرَض میرا خون چوستا ہے
جو دردِ دل تھا وہی آج دردِ سر ہے مرا

نکلنا چھوڑ گئے سانپ آستینوں سے
یہ مر گئے ہیں یا اِن کے دلوں میں ڈر ہے مرا

تِری اڑان میں شامل ہوں میرے لختِ جگر
ترے پروں میں کہیں ایک بوڑھا پَر ہے مرا

مرے وجود پہ اتنا ہی بوجھ ڈالنا تھا
ترے ڈرامے میں کردار جس قدر ہے مرا

اب اِتنے عجز پہ تو تھوڑی بھیک بنتی ہے
تمھارے پاؤں پر کاسہ نہیں یہ سر ہے مرا

یہ دیکھنا ہے بجھاتا ہے کون پیاس مری
نظر ہے ساقی پہ تو ہاتھ جام پر ہے مرا

اِدھر سے مِل تو گیا ہے ادھر کسی صورت
مگر یہ رابطہ اب تک اِدھر ادھر ہے مرا

ابھی سے دو دو فرشتے ہیں میرے دوش پہ کیوں
ابھی تو خیر سے آغازِ خیر و شر ہے مرا

ہے آنکھ چپ تو مرے دل میں اشک جاری ہیں
الگ مزاج کا اظہارِ خشک و تر ہے مرا

بس ایک ہچکی لگی اور کھیل ختم ہوا
سمجھ لو سارا تماشہ ہی سانس بھر ہے مرا

ردائے گریہ مَیں فرہادؔ کس لیے اوڑھوں
کسی کے غم سے اگر اشک معتبر ہے مرا

☆☆☆☆

صابرامانی (سعودی عرب)

نہیں رہوگے تو کچھ نبھانا نہیں پڑے گا
یہ سر کٹا لو کہ پھر اٹھانا نہیں پڑے گا

یہ جنگ ہوگی تمام غازی شہید ہوں گے
کسی کو میداں سے لوٹ جانا نہیں پڑے گا

خدا کی مانو تو دال روٹی ملا کرے گی
کسی کو مٹی میں ہل چلانا نہیں پڑے گا

کہیں رہوں گا تو چھت ضرورت رہے گی میری
سفر کروں گا تو گھر بنانا نہیں پڑے گا

یہ چابیاں ہیں مرے خزانے کی پاس رکھ لے
مجھے دوبارہ اسے چھپانا نہیں پڑے گا

اسی گلی میں تمام لوگوں کے گھر بنیں گے
کسی کو ملنے کہیں پہ جانا نہیں پڑے گا

قسم خدا کی میں کوئی شکوہ نہیں کروں گا
تجھے محبت میں کچھ نبھانا نہیں پڑے گا

فہیم اختر (لندن، برطانیہ)

سوال یہ ہے بھلا کیسے اعتبار کرے
کسی سے کیسے کوئی اس جہاں میں پیار کرے

مری طرف نہ چلائے وہ تیر تہمت کے
اسے کہو کہ مجھے یوں نہ شرمسار کرے

کسی کی جان کی کچھ قدر ہی نہیں جس کو
اب ایسے پہ کیوں کوئی اپنی جاں نثار کرے

وصالِ یار کی حسرت میں اے فہیم اختر
جو ہجر زاد ہو کب تک یوں انتظار کرے

☆☆☆☆

سلمان جاذب (مسقط)

خود سے کوئی مکر گیا ہو گا
عشق دریا اتر گیا ہو گا

نہیں دیکھا کوئی گریباں چاک
ایک مجنوں تھا مر گیا ہو گا

پھر رہا ہے جو اک بگولہ سا
خواب اس کا بکھر گیا ہو گا

اس لیے کرچیاں ہیں چاروں طرف
آئنے سے وہ ڈر گیا ہو گا

اب اسے یاد کیا دلائیں ہم
کر کے وعدہ مکر گیا ہو گا

☆☆☆☆

سید صداقت علی (کویت)

احباب کے مارے ہیں مقدر کے نہیں ہم
گھر گرچہ ہمارے ہیں مگر گھر کے نہیں ہم

تم چاند فلک کے ہو سو ہو حسن پہ نازاں
ہم لوگ زمیں زاد برابر کے نہیں ہم

وہ وقت کہ ہر ایک نظارہ تھا ہمیں سے
یہ وقت کہ اب ایک بھی منظر کے نہیں ہم

ہم مل تو نہیں سکتے مگر ساتھ چلیں گے
دریا کے کنارے ہیں سمندر کے نہیں ہم

جذبوں کی صداقت سے کرے صرفِ نظر جو
مداح کسی ایسے سخنور کے نہیں ہم

☆☆☆☆

ڈاکٹر سلیم محی الدین
پار بھانی، بھارت

زبان اورنگ آبادی : اردو کی پہلی ادبی زبان

دکن میں اردو کا آغاز و ارتقا لسانی تاریخ کا حیرت انگیز ترین وقوعہ ہے۔ علاؤ الدین خلجی جادو کی چھڑی لہراتا ہوا ۱۲۹۶ء میں دکن پہنچا۔ دیوگیری سے بے حد و بے حساب دولت لوٹ کر واپس لوٹتے ہوئے وہ ایک زبان یہاں کے باشندوں کے لیے چھوڑ گیا۔ یہی نہیں آموختے کے لیے ملک کافور کو وقتاً فوقتاً بھیجتا رہا۔ تدریس زبان کا آخری مرحلہ محمد بن تغلق کی ۱۳۲۷ء میں آمد کے بعد سے ہوا۔ گویا ان ۳۱/ برسوں کے دوران دکن میں اردو زبان ارتقا پذیر ہوئی۔ ورود علائی کے ساتھ ہی یہاں کے باشندے اردو بولنے لگے اور تغلق کے آتے آتے یہاں اس زبان میں ادب تخلیق ہونے لگا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ دکن کی دوسری مہم ۱۳۰۸ء میں براہ دیوگیری ورنگل جاتے ہوئے طوطی ہند امیر خسرو بھی ملک کافور کے ہمراہ تھے۔ ملک کافور کی اس مہم کے وہ عینی شاہد تھے۔ علاؤ الدین خلجی کی پہلی مہم کے متعلق بہت ساری معلومات بھی ہمیں طوطی ہند امیر خسرو اور تاریخ کے فرشتہ محمد قاسم فرشتہ سے ملتی ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ خلجی کی دکن مہم ۱۲۹۶ء کی ۲۶/فروری سے ۲/جون کے درمیان چار مہینوں اور پانچ دنوں پر مشتمل تھی وہ محض ۲۵/دن دیوگیری یا دولت آباد میں رہا۔ کیا یہی وہ یادگار ۲۵/دن ہیں جو دکن میں اردو کے ارتقاء کی تاریخ رقم کرتے ہیں؟

زبان و ادب کے سنجیدہ طالب علم ہونے کے ناطے ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کہ کسی زبان و ادب کے ارتقا کے عوامل کیا ہوتے ہیں۔ کیا کوئی فوجی حملہ کسی زبان کے ارتقا کا سبب ہوسکتا ہے۔ زبان تو تہذیب کا ہرکارہ ہوتی ہے۔

اردو زبان کے آغاز کے مختلف نظریوں پر بحث کرتے ہوئے ہم اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اردو زبان میں ادبی آثار پہلی بار مراٹھواڑہ کی سرزمین میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اکثر لسانی مورخ مراٹھواڑہ کی لسانی و ادبی حیثیت کے معترف تو ہیں لیکن اسے ایک لسانی و ادبی اکائی کا درجہ دیتے ہوئے اس کی علاحدہ شناخت متعین کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ مراٹھواڑہ بلکہ تمام تر دکن میں اردو کے آغاز کو علاؤ الدین خلجی کے حملہ دیوگیر ۱۲۹۶ء سے جوڑا جاتا ہے، جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ خلجی کے حملہ دیوگیر سے سو سال قبل اس علاقے میں بزرگانِ دین کی آمد کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا اور وہ یہاں کی مٹی میں

رچ بس کرلوگوں کے دلوں کو تسخیر کر چکے تھے۔ بارہویں صدی عیسوی میں مراٹھواڑہ پہنچنے والے جن بزرگان دین کا پتہ چلتا ہے ان میں حضرت سید میراں حسینؒ (وفات ۱۱۸۸ء)، حضرت سید علاؤ الدینؒ (وفات ۱۲۵۳ء) اور حضرت سید حسام الدین تیغ برہنہؒ (وفات ۱۲۸۱ء) ہیں(۱)۔ عوارف المعارف کے مصنف اور سہروردیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (وفات ۱۲۳۴ء) کے مرید حضرت باباشرف عراقیؒ بھی ایک ایسی ہی مثال ہیں، جو مراٹھواڑا سے ہوتے ہوئے حیدرآباد پہنچے تھے۲۔ حضرت مومن عارف باللہ کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ مومن عارف باللہ خلجی کی آمد سے سالوں قبل دولت آباد پہنچ چکے تھے۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

''علاؤ الدین کے حملہ دیوگیری سے کچھ پہلے شمال کے مسلمان صوفی اس نواح میں آنے لگے تھے۔ چناں چہ مومن عارف باللہ اور ان کے بہت سے معتقدین اسی زمانے میں دیوگیر آئے تھے اور قلعہ کے مقابل پہاڑی کے دامن میں قیام کیا تھا۔ آپ کا قیام یہاں کافی عرصہ تک رہا اور یہیں انتقال بھی ہوا۔ چناں چہ آپ کا مزار پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس سے ملحق ایک مسجد اور خانقاہ بھی بنی ہوئی ہے۔ اس نواح میں آپ کے بارے میں کچھ روایتیں بھی مشہور ہیں۔ آپ کے مزار کی پائیں ایک خاتون کا بھی مزار ہے اور یہ راجہ رام دیو کی لڑکی کا مزار بیان کیا جاتا ہے، جو آپ کی معتقد ہوگئی تھی۔''۳

جہاں تک زبان کے ادبی آثار کا تعلق ہے، خلجی سے قبل نام دیو (متوفی ۱۳۵۰ء) کے ہندی/ ہندوی اشعار مراٹھواڑہ کی فضا میں گونج رہے تھے اور نام دیو سے بھی قبل سنت گیانیشور (متوفی ۱۲۹۲ء)، جو خلجی کی مراٹھواڑہ آمد سے چال سال قبل پرلوک سدھار چکے تھے، صاف وشستہ ہندی/ ہندوی/ دکنی میں اپنے خیالات کچھ یوں ظاہر کر رہے تھے:

سب گھٹ دیکھو مانک مولا
کیسے کہوں میں کالا دھولا
نیچ رنگ سے نیارا کوئی
لینا ایک اور دینا دوئی (۴)

ڈاکٹر سہیل بخاری تو گیانیشور کو بلاتکلف اردو کا پہلا شاعر قرار دیتے ہیں۔ بقول ان کے:

''ہمیں اپنی زبان کے ادبی آثار پہلی بار مراٹھواڑہ میں نظر آتے ہیں جہاں کا سفر اس

نے بھگتوں کے ساتھ کیا ہے۔ چناں چہ اردو کے پورے پورے جملے اور فقرے ہمیں
پہلی بار بھگتوں کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں اور ان میں مرہٹی کے شاعر گیانیشور کو اردو
کا پہلا شاعر کہا جاسکتا ہے۔''۵

نام دیو مراٹھواڑہ میں ہندی/ ہندوی/ دکنی اور زبان اورنگ آبادی کا اول استناد ہے۔ اس کے ہندی پدوں کی شہرت برصغیر پر محیط تھی۔ اس کے کئی شلوک سکھوں کے مذہبی گرنتھ" گروگرنتھ" میں شامل ہیں۔ نام دیو مراٹھواڑہ کا امیر خسرو ہے۔

ملاحظہ فرمائیں

مائی نہ ہوتی باپ نہ ہوتے، کرم نہ ہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے تم نہیں ہوتے کون کہاں تے آتا
چندر نہ ہوتا، سُور نہ ہوتا ، پانی پون ملایا
شاستر نہ ہوتا، وید نہ ہوتا، کرم کہاں تے آیا ۶

یا یہ کہ:

من میری سوئی تن میرا دھاگا
کھیچر جی کے چرن ناما شمپی لاگا ۷

گیانیشور اور نام دیو کی زبان انتہائی صاف وشفاف ہے اور برج بھاشا، کھڑی بولی، پنجابی اور دکنی سے مختلف بھی۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس زبان پر اگر کسی دیگر زبان کے اثرات نظر آتے ہیں تو وہ مراٹھی کے اثرات ہیں۔ یہ وہی زبان ہے جو مراٹھواڑہ میں خلجی اور تغلق کی آمد سے قبل ادب کا حصہ بن چکی تھی (اگر کوئی فرق تھا تو رسم الخط کا تھا جو دیوناگری تھا) اسی لیے مراٹھواڑہ کی زبان وادب کو ایک لسانی وادبی اکائی کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ بے شک یہاں کی زبان پر دکنی ومراٹھی کے کچھ اثرات پائے جاتے ہیں لیکن اس کے خمیر میں اپنے علاحدہ وجود کو منوانے کی تمام تر صلاحیت موجود ہے۔ ان تمام شواہد کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ دکن کے علاقے مراٹھواڑہ میں اردو کا آغاز خلجی وتغلق کی آمد سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس کی پذیرائی عوامی سطح پر ہوئی اور حکمراں اسے محض فارسی رسم الخط عطا کرنے کے خطاوار ہیں۔

اردو رسم الخط میں مراٹھواڑہ کی لسانی وادبی انفرادیت کی پہلی مثال شاہ اشرف بیابانی (۱۴۵۹ءتا ۱۵۲۸ء) ہیں۔ ایک طرف جہاں شمال میں امیر خسرو ایک جگنو کی طرح چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں وہیں شاہ اشرف محض ایک صدی بعد مراٹھواڑہ کی سرزمین پر ایک شمع جلائے نظر آتے ہیں۔ وہ نہ صرف مختلف اصناف

سخن میں خود طبع آزمائی کرتے ہیں، بلکہ مختلف اصناف کی تبلیغ و تدریس بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

بحر ہے دریا آب فراخ کلام
موزوں ہے ڈالی شاخ
نیم بیت کو مصرع بول

بحر ہے دریا آب فراخ
کلام موزوں ہے ڈالی
شاخ نی بیت کو مصرع بول
دو مصرع کی بیت ہے کھول
رباعی کیا چو مصرع جان
مخمس کیا؟ پنج مصرع خوان
چند بیت کو قطعہ تو جان
از شعر و غزل سے کاٹ کے آن
کم از پنج بیت نہ آوے غزل
ہو ذکر فراق محبت مثل
قصیدہ غزل کا اوّل مطلع
تخلص آخر بیت کا مقطع
ردیف بعد از قافیہ آر
ایک گھوڑے پر دو سوار

ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ اشرف بیابانی کی اس نظم ''واحد باری'' کے متعلق کہتے ہیں کہ:

''اس میں مصنف زیادہ سے زیادہ عام بول چال کی زبان سے قریب رہنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے، اسی لیے محاورے زبان میں از خود در آتے ہیں۔ یہ خصوصیت اشرف کی ہر تصنیف میں موجود ہے اور اس دور میں با محاورہ زبان لکھنے کا یہ عمل اسے ایک انفرادیت بخشتا ہے۔'' 9

اشرفؔ کے فوری بعد اردو غزل کی پہلی توانا آواز حسن شوقیؔ کا ظہور بھی اسی علاقے میں ہوا۔ شوقیؔ کی

غزلوں میں بھی زبان و بیان کی صفائی کے ناقابل یقین شواہد موجود ہیں۔ یہ زبان اپنے عہد کی زبان سے آگے نظر آتی ہے۔ یہ اورنگ آبادی زبان ہے[9]

بن گل کیا بلبل، او گلبدن کہاں ہے
جن مَن ہریا ہمارا، سو من ہرن کہاں ہے

نین کے پاؤں کر جاؤں، سجن جب گھر بلاوے مجھ
نہ جاگوں گی قیامت لگ، اگر گل لگ سلاوے مجھ

یہ وہی ''اورنگ آبادی زبان'' ہے جس سے ولیؔ کی غزل کا خمیر اٹھا۔ حسن شوقیؔ اک طرف جہاں امیر خسروؔ کے بعد اردو غزل کی روایت کے دوسرے سب سے اہم نمائندے کے طور پر ابھرتا ہے۔ وہیں زبان کی سطح پر بھی وہ اپنے عہد میں سب سے منفرد و ممتاز نظر آتا ہے

۔اس کے بعد کی نسل کے شعرا کی زبان دکنی آمیز ہونے کی بنا پر نامانوس لگتی ہے، جب کہ حسن شوقیؔ کے بیشتر اشعار آج بھی نہ صرف قابل فہم بلکہ اثر انگیز بھی ہیں۔

ولیؔ کی زبان'' زبان اورنگ آبادی'' کی سب سے عمدہ اور سب سے زیادہ ستھری شکل ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالستار صدیقی:

> ''یہ وہی زبان ہے جو ولیؔ کے زمانے میں بولی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا دیوان دہلی پہنچا تو دہلی والوں نے اسے سر آنکھوں پر رکھا۔ شاعروں نے اس کی غزلوں پر غزلیں کہیں اور زبان دانوں نے اس کے کلام کو سند پکڑا۔ اگر اس کے دیوان میں کہیں دو چار لفظ دلی کی اس وقت کی زبان سے مختلف پائے ہوں گے تو ان کو چاہے شاعر کا اختراع جانا چاہے اس کی زبان کا پرانا پن یاد کنیت، پر اسے عیب نہیں مانا۔ آج بھی کہ دلی کا تعلق چھوٹے دیڑھ دو سو برس ہو چکے اورنگ آباد کی زبان کو دہلی کی زبان سے بہت مناسبت باقی ہے اور دکن کے اور حصوں کی زبان سے وہ الگ دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے زیادہ صحیح ہوگا کہ ہم ولیؔ کی زبان کو ''اورنگ آبادی'' کہیں، دکن کے باقی حصے میں اب سے سو دیڑھ سو برس پہلے تک جو زبان رائج تھی، اور جو اب بھی بولی جاتی ہے، اسے دکنی یا دکھنی کہنا نادرست نہ ہوگا''[10]

زبان اورنگ آبادی کا اگلا پڑاؤ عزیز اللہ ہمرنگ اورنگ آبادی کی تفسیر ''چراغ ابدی'' (۱۸۰۶ء) ہے جس کے

دیباچے میں وہ کہتے ہیں:

''اگرچہ بعض عزیزوں نے زبان دکنی و ہندی آمیز میں تفسیر جز آخیر کی لکھے ہیں، لیکن بہ سبب الفاظ دکنی کے لطف زبان ہندی کا پورا نہیں پاتا اور دل یاروں کا واسطے اس مطالعے کے رغبت کم لاتا۔ اس واسطے خاطر قاصر میں اس فقیر کی آیا کہ تفسیر جز اخیر کی زبان ہندی میں بالفعل اورنگ آباد کے لوگوں کا محاورہ ہے لکھے اور بعض فوائد کہ دوسرے تفسیروں میں نہیں ہیں، کتب معتبرہ سے جمع کر کے میں داخل کرے کہ عوام اس سے، باوجود قلت بضاعت کے، فائدہ تمام اٹھاویں اور اس فقیر کو دعائے مغفرت میں یاد لاویں۔''[11]

زبان اورنگ آبادی کے سب سے اہم حمایتی ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ اس کی تعریف کچھ یوں بیان فرماتے ہیں۔

''یہاں میں اصطلاح زبان اورنگ آبادی کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ اس اصطلاح سے میری مراد وہ دکنی نہیں ہے جو آج اورنگ آباد میں بولی جاتی ہے، یا ولی یا سراج کے زمانے میں بولی جاتی رہی ہوگی، بلکہ اس سے مراد وہ ادبی زبان ہے، جسے ولی نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے استعمال کیا اور جس کا منجھا ہوا آخری اور مکمل نمونہ ہمیں کلام سراج میں ملتا ہے۔''[12]

آج ہم جس علاقے کو مراٹھواڑہ کہتے ہیں وہ دراصل ایک صوبہ تھا جسے صوبہ خجستہ بنیاد اورنگ آباد کے نام سے جانا جاتا رہا ہے۔ اس علاقے میں زبان و ادب اور لب و لہجے کی سطح پر بھی لسانی یکجہتی و یگانگت نظر آتی ہے۔ مراٹھواڑہ آج بھی زبان و ادب اور لب و لہجہ کی سطح پر اسی ''زبان اورنگ آبادی'' کے زیر اثر نظر آتا ہے۔ زبان و ادب کی ایسی فقید المثال خدمات کے عوض ہی کسی علاقے کے ادب کو ''دبستان'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب گلکنڈہ اور بیجاپور کو دبستان قرار دیا جاسکتا ہے تو اورنگ آباد کو کیوں نہیں؟ اورنگ آباد کو ''دبستانِ اورنگ آباد'' سے موسوم کرتے ہوئے نقاد و محقق ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے اپنی تصنیف ''دبستانِ اورنگ آباد : تحقیقی اور تنقیدی معروضات'' میں مراٹھواڑا کے لسانی و ادبی امتیازات کا تجزیہ کرتے ہوئے دبستانِ اورنگ آباد کی وضاحت کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

''دبستان کا تصور شہر کے حدود اربعہ تک محدود نہیں ہوتا۔ وہ ان اثرات کے دائرۂ نفوذ کو محیط ہوتا ہے، جن سے اس دبستان کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ یہ ایک ادبی

تصور ہے جغرافیائی نہیں۔ دبستان اورنگ آباد پورے مراٹھواڑہ اور آس پڑوس
کے علاقوں کا احاطہ کرتا ہے۔"[۱۳]

ڈاکٹر جینا بڑے نے دبستانِ اورنگ آباد کے چار اہم امتیازات اس طرح بیان کیے ہیں۔(۱) دکن میں اردو کا آغاز اورنگ آباد سے وابستہ ہے۔(۲) دکن کا آخری دور بھی اورنگ آباد ہی سے جڑا ہے۔(۳) دہلی اور دکن کے مقابلے میں اورنگ آباد کی زبان کی اپنی انفرادیت ہے۔(۴) شمال کی شعری روایت ولیؔ کی شعری روایت کی توسیع ہے، اس علاقے کی بول چال کی زبان آج بھی دکن کے دیگر علاقوں سے مختلف ہے اسی کا عکس یہاں کے ادب میں نظر آتا ہے۔نقادانِ فن اسے ارضیت سے تعبیر کرتے ہیں۔لیکن مٹی کا قرض چکانے کے لیے جینے والوں کی سرزمین مراٹھواڑا میں ارضیت کا مطلب نری علاقائیت یا مقامیت نہیں ہے۔ یہ اپنے وسیع ترسیاق وسباق میں اپنی مٹی اور اپنے معاشرے کے انسلاک سے عبارت ہے۔بقول ڈاکٹر ارتکاز افضل:

> "ہمارے شاعر اور ادیب اس بات کی شعوری کوشش نہیں کرتے کہ علاقائیت
> سے اپنا دامن بچائیں بلکہ قاضی سلیمؔ، بشر نوازؔ، احسن یوسف زئیؔ، محمود شکیلؔ، رفعت نوازؔ
> وغیرہ کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ علاقائی تہذیب وثقافت کی نیرنگی
> ان کے اسالیب میں جان ڈال دیتی ہے۔"[۱۴]

مراٹھواڑا کے شعرا، ادبا زندگی اور ادب کے متعلق ایک صحت منداور مثبت رویے کے حامل رہے ہیں۔انھوں کبھی کسی ازم یا نظریے کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔اپنے ان ہی امتیازات کے باعث مراٹھواڑا کے شعر و ادب کو "دبستانِ اورنگ آباد" سے موسوم کرنا محض ایک ادبی دیانت کا مظاہرہ ہوگا۔زبان اورنگ آبادی کو اردو کی پہلی ادبی زبان کہنے میں ہم اس لیے بھی حق بجانب ہیں کہ اردو کی پہلی تصنیف کدم راؤ پدم راؤ اور نو سرہار اس علاقے میں اس وقت تصنیف کی گئی جب شمال میں اردو اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی تھی۔ شمالی ہند میں اردو کا پہلا مستند نمونہ افضل کی بکٹ کہانی کی شکل میں ملتا ہے جو کدم راؤ پدم راؤ سے دو سو سال بعد اور نو سرہار سے سو سال بعد لکھی گئی ہے۔جب کہ اس عرصے میں اورنگ آباد میں اشرف بیابانی، دیدار فانی، حسن شوقی اور دکن میں قلی قطب، وجہی، غواصی اور عبدل کے ہاتھوں اورنگ آبادی اور ساتھ ہی ساتھ دکنی ادبی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھیں۔یہی نہیں چودھویں صدی عیسوی میں اردو یہاں ہندوی کے نام سے بہمنی سلطنت کی سرکاری زبان کا درجہ بھی حاصل کر چکی تھی۔

حوالے

۱۔ "The Deccan in the 15th Centurey" by M.A.Aziz, P-5701

۲۔ فوائدالفواد۔نول کشوراڈیشن۔صفحہ ۲۰۲۔

۳۔ مضمون ''دکنی زبان'' مصنف عبدالقادر سروری، مشمولہ ''اردو زبان کی تاریخ'' مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ۔اول ایڈیشن۔

مطبوعہ ۱۹۹۵ء صفحہ ۱۷۸۔

۴۔ ''ہندی ساہتیہ کا اتہاس'' آچاریہ شکل ۱۵/رواں ایڈیشن۔صفحہ ۱۲۴۔

۵۔ مضمون ''اردو زبان کا آغاز وارتقا'' مصنف ڈاکٹر سہیل بخاری، مشمولہ ''اردو زبان کی تاریخ''۔ مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ۔صفحہ ۱۱۶۔

۶۔ ''مقدمہ تاریخ زبان اردو''۔مسعود حسین خان۔سرسید بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۸۲ء۔صفحہ ۱۵۷

۷۔ ''مقدمہ تاریخ زبان اردو''۔مسعود حسین خان۔سرسید بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۸۲ء۔صفحہ ۱۵۷

۸۔ ''تاریخ ادب اردو''۔جلد اوّل۔جمیل جالبی۔صفحہ ۱۷۵۔

۹۔ ''تاریخ ادب اردو''۔جلد اوّل۔جمیل جالبی۔صفحہ ۱۷۶۔

۱۰۔ ''ولی کی زبان'' عبدالستار صدیقی مضمون مشمولہ ''کلیات ولی''۔مرتبہ نورالحسن ہاشمی۔صفحہ ۳۰۔

۱۱۔ ''کتب خانہ جامع مسجد کے مخطوطات''۔ڈاکٹر حامد اللہ ندوی۔ایڈیشن ۱۹۹۱ صفحہ ۳۵۔

۱۲۔ ''زبان اورنگ آبادی''۔ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ۔مطبوعہ مئی ۲۰۰۶ء۔صفحہ ۱۸۔۱۷۔

۱۳۔ ''دبستان اورنگ آباد : تحقیقی وتنقیدی معروضات''۔ڈاکٹر معین الدین جینابڑے۔۲۰۰۷ء۔صفحہ ۵۷۔

۱۴۔ ''سلیم کی شعری کائنات''۔ڈاکٹر ارتکاز افضل، مشمولہ ''وابستہ'' شعری مجموعہ سلیم محی الدین۔صفحہ ۶۔

☆☆☆

کرامت اللہ غوری
کینیڈا

عہد حاضر میں اردو ادب کے سماجی رویے

یہ کہنا تو ایک مسلمہ حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ دنیا میں کسی بھی زبان کا ادب خلا میں پروان نہیں چڑھا کرتا!

کوئی بھی تخلیق کار، وہ چاہے کینوس پر اپنے تاثرات رنگوں اور لکیروں میں ابھار رہا ہو یا قرطاس پر الفاظ کے پیکر نثر یا نظم میں تراش رہا ہو، اپنے گردوپیش کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور انھیں اپنا ذریعۂ اظہار بناتا ہے۔ وہ دور جب انسان غاروں میں رہا کرتا تھا، اس لیے کہ اسے غار سے باہر کی دنیا سے ڈر لگتا تھا اور خوف آتا تھا، اس وقت بھی اس نے اپنے مسکن میں جو خطوط ناہموار دیواروں پر نقش کیے، ان میں بھی وہی تمام شکلیں تھیں جو وہ غار سے باہر کی دنیا میں دیکھتا تھا!

ایک اور روشن حقیقت یہ بھی ہے کہ اپنے ماحول اور معاشرے کا جذب قلم کار یا تخلیق نگار پر اس وقت زیادہ اثر کرتا ہے جب حالات نامساعد ہوں، دشواریاں درپیش ہوں، ایسے وقت میں ہر انسان کے لیے جینا ایک دشواری بن جاتا ہے لیکن ایک قلم کار، شاعر یا ادیب، کے بیانیہ کے لیے وہ ماحول ایک ایسا چیلینج پیش کرتا ہے جو اس کی تخلیقی صلاحیت کو جہاں آزماتا ہے وہیں اسے صیقل بھی کرتا ہے! دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا بہترین ادب نامساعد حالات میں ہی تخلیق ہوا ہے اور عالمی ادب کی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ کشاکش حالات نے ہی ہر ادب میں وہ شگوفے کھلائے ہیں اور وہ گلکاریاں کی ہیں جنھیں ہم کلاسیکی ادب کے تحت شمار کرتے ہیں اور جن پر دنیا کا ہر ادب ناز کرتا ہے!

فرانس کا کلاسیکی ادب اس دور میں تخلیق ہوا جب شہنشاہیت کی مطلق العنانی کے پیروں تلے دبے اور کراہتے ہوئے مفلوک الحال عوام اپنے بنیادی انسانی حقوق کو ترس رہے تھے۔ یہ مزاحمتی ادب تھا جس نے ان میں بالآخر وہ روح پھونکی جس نے اٹھارویں صدی کے اواخر میں فرانس کے عظیم انقلاب کو جنم دیا!

روسی زبان کا بہترین ادب، جس نے ٹالسٹائی، دوستووسکی اور چیخوف جیسے زعیم قلمکار پیدا کیے اس دور میں تخلیق ہوا جب روس کے بھوکے ننگے عوام زار روس کی آمریت کے دور میں جی نہیں رہے تھے بلکہ سسک رہے تھے۔ تاریخ دان اس فیصلے پر متفق ہیں کہ روس کے انشا پردازوں اور قلمکاروں نے ہی

بولشو یک انقلاب کے لیے راہ ہموار کی تھی جس نے بالآخر روس سے شہنشاہی استحصال کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیا!

انگلستان کا آفاقی ادب انیسویں صدی کے اس دور میں تحریر ہوا جسے تاریخ وکٹورین ایج کے نام سے جانتی ہے۔ یہ ادبی شہکار، جو چارلس ڈکنز اور تھامس ہارڈی جیسے عظیم قلم کاروں کے ذہنِ رسا کی پیداوار تھے، اس سماجی گھٹن کے خلاف اعلانِ بغاوت تھے جس نے انگلستان کے معاشرے کو ہندو سماج کی طرح طبقات میں بانٹا ہوا تھا اور سماجی ناہمواریاں فیصلۂ تقدیر و مشیت سے تعبیر کر کے روا رکھی جاتی تھیں!

ہمارے اپنے اردو ادب کی تاریخ شاید سب سے زیادہ اس حقیقت کی غماز ہے کہ بہترین اور زندہ جاوید ادب یا تو اس دور میں تخلیق ہوا جب برصغیر پاک و ہند میں فرنگی استعمار کی یلغار کے سامنے ایک طرف تو ہندوستان کی آزادی سلب ہو رہی تھی اور دوسری طرف ہزار برس کے ہندو مسلم سماجی میل ملاپ سے جنم لینے والی گنگا جمنی تہذیب کو بھی ایک ایسے بدیسی سیلاب کا سامنا تھا جو اس کی بنیادوں تک کو بہا لے جانا چاہتا تھا۔ غالب کے خطوط، جو انھوں نے اپنے معاصرین کو اس دور میں تحریر کیے جب تین سو برس کی مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا، غدر کے بعد کی سماجی اور معاشرتی بدحالی اور ابتلا کا بہترین آئینہ ہے!

لیکن اردو ادب کا سب سے درخشاں باب بیسویں صدی کے پہلے نصف میں لکھا گیا جب فرنگی استعمار سے نجات پانے کے لیے ہندوستان کی سیاسی تنظیمیں اور جماعتیں برسرِ پیکار تھیں۔ یہ وہ دور تھا جس میں ایک طرف سیاسی رہنما اور قائدین اپنی زبانوں سے لسانی اور سیاسی جہاد میں مصروف تھے تو وہیں ترقی پسند تحریک کے جھنڈے تلے اردو ادب کے بہترین دماغ وہ ادب تحریر کر رہے تھے جسے بلا شبہ اور بلا خوفِ تردید مزاحمتی ادب کہا جا سکتا ہے۔ وہی زمانہ تھا جس میں ایک طرف ابراہیم جلیس اگر چالیس کروڑ بھکاری جیسا ناول لکھ رہے تھے تو نظم کے میدان میں شاعرِ انقلاب، حضرتِ جوش ملیح آبادی اور مجاز لکھنوی آزادی کے ترانے گا رہے تھے اور نوجوانوں کے خون میں حرارت پیدا کر رہے تھے!

یہ سوال ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ آخر مزاحمتی دور میں وہ کون سی کشش یا مقناطیسیت ہوتی ہے جو فنکاروں اور تخلیق کاروں کے اذہان کو گدگداتی ہے اور ان کو آفاقی ادب تخلیق کرنے کی تحریک دلاتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک دشمن، جیسے فرانس اور روس میں شہنشاہیت تھی اور ہندوستان میں فرنگی سامراج تھا، ایک ایسا ہدف پیش کرتا ہے جس کے خلاف ادبی شہکار تخلیق ہوتے ہیں۔ یہ ہدف تخلیق کاروں کے لیے ایک مرکز، یا ایک پلیٹ فارم کا کام دیتا ہے اور اجتماعی سوچ کو جنم دینے کا موجب بھی بنتا ہے!

آج ہم جس عصرِ حاضر میں جی رہے ہیں وہ ٹکنولوجی کا دور ہے اور زندگی کی دیگر جہتوں کی طرح اس

ٹکنولوجی نے ادب اور تخلیق کاری کے میدان میں بھی اپنے لیے جگہ بنالی ہے۔

ایک اعتبار سے تو یہ مثبت پیش رفت ہے کہ تخلیق کاروں نے اپنے بیان اور اظہار کے لیے انٹرنیٹ جیسی سہولت کو فراخ دلی سے اپنالیا ہے۔شاید تخلیق کاروں کو تاریخ کا یہ سبق یاد تھا کہ سولھویں صدی میں یورپ میں چھاپہ خانہ یا پرنٹنگ پریس کی ایجاد کو اس وقت کی سب سے بڑی حکمراں طاقت،سلطنتِ عثمانیہ کے مفتیوں نے شیطانی اختراع کہہ کر جو رد کیا تھا اس نے مسلم دنیا کو مغرب کے مقابلے میں علم و ہنر کے میدان میں صدیوں پیچھے دھکیل دیا تھا!سو یہ پیش رفت،اردو ادب میں انٹرنیٹ کو وسیلۂ ابلاغ کے طور پر اپنانے کا عمل،مثبت رویہ کی نشاندہی کرتا ہے!

لیکن انٹرنیٹ کی پذیرائی اور اس کے بطن سے جنم لینے والے سوشل میڈیا نے ادب کے لیے بڑے مسائل بھی پیدا کر دیے ہیں!

سوشل میڈیا کی سب سے بڑی کمزوری تو یہ ہے کہ اس میں اس مرکزیت کا کوئی وجود اور تصور نہیں ہے جس نے بہت سی زبانوں اور معاشروں میں،جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے،ادبِ عالیہ کو تخلیق کیا اور زبان کے سماجی اور معاشرتی قد کاٹھ کو اونچا کیا تھا!

سوشل میڈیا میں ہر لکھنے والا مکمل طور پر آزاد ہے بلکہ کئی اعتبار سے تو مادر پدر آزاد ہے!یہ بے محابا اور بلا روک ٹوک آزادی اس لیے ہے کہ مرکزیت ناپید ہے اور ہر شخص آزاد ہے کہ وہ جو چاہے لکھے اسے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہے۔آج سے دس بیس برس پہلے تک ادبی تخلیقات کے میدان میں دستور یہ تھا کہ کوئی نیا قلم کار اگر کچھ لکھتا تھا تو اس کی تخلیق کسی رسالہ یا اخبار کے مدیر کی کسوٹی پر پرکھی جاتی تھی اور ہر کس و ناکس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کسوٹی پر سے بے پرکھے ہوئے گذر جائے۔!

ہمیں یاد ہے کہ بچپن میں جب لکھنا شروع کیا تو کسی رسالے یا اخبار کے مدیر کو اپنی تخلیق بھیجنے کے بعد دنوں دعائیں مانگتے گذر جاتے تھے کہ یا اللہ ایڈیٹر صاحب کو مہربان کر دے کہ وہ ہماری نگارش پر سرخ قلم سے کانٹا نہ بنائیں بلکہ سیاہ روشنائی والے قلم سے اس پر ٹک مارک لگا دیں!

جب تک کسوٹی تھی،بلکہ کسوٹیاں تھیں،تو ادب میں معیار تھا۔اور کسوٹیاں میں یوں کہہ رہا ہوں کہ ایک بار جب تخلیق چھپ کر سامنے آجاتی تھی تو اس کے بعد اسے نقاد کے بنائے ہوئے پل صراط کو بھی پار کرنا ہوتا تھا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ نقاد مہربان بھی ہو بلکہ اکثر نقادوں کا معاملہ تو رقیب روسیاہ جیسا ہوتا تھا!

بہ الفاظِ دیگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کسوٹی یا کسوٹیوں کی وجہ سے ادب میں شیرازہ بندی بھی تھی اور معیار بھی تھا۔انٹرنیٹ سے فیض یاب ہونے والے سوشل میڈیا نے ان سب رکاوٹوں کو پامال کر دیا ہے اور اب اظہار و

بیان کا میدان اس مسطح زمین کی مانند ہے جس پر جو چاہے اپنا ہل چلا کر اس میں جو چاہے بیج بو سکتا ہے اور اپنی پسند کی فصل اگا سکتا ہے یا اگر اسے شہ سواری کا شوق ہے تو پھر اس ہموار زمین پر اپنے گھوڑے دوڑا سکتا ہے!

نتیجہ اس آزادی کا یہ ہے، اور شاید یہ کہنا خلافِ تہذیب نہیں ہوگا، کہ ٹکنولوجی اور ایجاد نے ادب میں گھوڑوں اور گدھوں کو ایک ہی استھان پر باندھے جانے کی سہولت مہیا کردی ہے اور سوشل میڈیا کے شاور اس سہولت سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔ وہ گنگا جل صرف پی ہی نہیں رہے بلکہ جی کھول کے گنگا نہا بھی رہے ہیں!

یہاں ایک جملۂ معترضہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انٹرنیٹ پر سہولتیں مہیا کرنے والے ادارے، جنھیں سروس پرووائڈر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اپنی طرف سے ان کی ویب سائٹ پر پوسٹ کی جانے والی یا لگائی جانے والی نگارشات یا گزارشات پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ، اور خاص طور پہ حکومتوں کی طرف سے سوشل میڈیا کے بیجا استعمال کے خلاف اٹھائے جانے والے اعتراضات کے جواب میں، اپنی احتسابی ذمہ داری اور نگرانی کے قوائد کو سخت بناتے جا رہے ہیں جس کے پیش نظر مرکزیت کے عدم وجود کا اعتراض شاید بجا نہیں ہے!

لیکن اس استدلال میں وزن یوں نہیں رہتا کہ سروس پرووائڈر کی نگرانی صرف اس حد تک ہے کہ جو کچھ پوسٹ کیا جاتا ہے اس کی زبان درست ہو اور فحش الفاظ یا گالم گلوچ کا استعمال نہ ہو۔ اس کے علاوہ ان کا احتساب زیادہ اس حوالے سے ہوتا ہے کہ جو پوسٹ کیا جا رہا ہے اس میں مذہبی عصبیت اور فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے یا تشدد اور انتہا پسندی پر ابھارنے کے لیے مواد نہ ہو!

جہاں تک ادب اور ادبی تخلیقات کا سوال ہے تو ان میں انٹرنیٹ کی سہولت مہیا کرنے والے اداروں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ سروس پرووائڈر کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ جو نثر انٹرنیٹ پر لکھی جا رہی ہے اس کا ادبی معیار کیا ہے یا جو شاعری ہو رہی ہے وہ شعر گوئی اور سخن وری کی کسوٹی پر پورا اترتی ہے یا نہیں! اس حوالے سے وہاں کوئی قبلہ نہیں ہے، کوئی کعبہ نہیں ہے جس کا رخ کر کے اس مرکز سے اپنی وابستگی یا وفاداری کا اظہار کیا جائے۔

مرکزیت اور کسوٹی کے واضح فقدان نے ادب کے میدان میں ایک انتشار کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی رویوں کو بھی بری طرح سے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے!

نقل مکانی یا ہجرت کے عمل کے بارے میں یہ کہاوت عام ہے کہ ہجرت کے بعد سب سے پہلی قربانی زبان کی ہوتی ہے اور نئے ماحول میں آنکھ کھولنے اور پروان چڑھنے والی نسل اس زبان سے اگر فوری نہیں تو آہستہ آہستہ نابلد ہوتی جاتی ہے جو اس کے بڑوں کی زبان اور ذریعۂ اظہار ہوا کرتا تھا!

یہی کچھ انٹرنیٹ کو وسیلۂ اظہار بنانے والے اردو ادب کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ مادر پدر آزادی نے ایک طرح کی انارکی کو جنم دیا ہے جس میں کوئی کسی کو جواب دہ نہیں ہے اور ہر شخص کو مکمل آزادی ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اب تک کی مروجہ ادبی اقدار کی پابندی کرے یا نہ کرے!

اردو نثر میں، جو فی زمانہ اس قماش کی کسی بھی فکر یا تحریک سے تہی ہے جس نے، مثال کے طور پر، بر صغیر جنوبی ہند کی تقسیم سے پہلے کی دہائیوں میں ہماری تاریخ ساز اور تاریخی ترقی پسند تحریک کو جنم دیا تھا اور جس میں اردو زبان کا ادبِ عالیہ تخلیق ہوا تھا، فکری انتشار پھر بھی اتنا اور اس حد تک نہیں ہے جتنا اردو شاعری کے میدان میں پایا اور دیکھا جا سکتا ہے!

ہمارے اردو ادب میں ویسے بھی بوجوہ، اگرچہ ان وجوہات پر روشنی ڈالنے کا یہاں محل نہیں ہے، شاعری اور سخن وری کو ہمیشہ سے زیادہ دخل رہا ہے اور یہ روایت اس انٹرنیٹ کے بعد میں بھی برقرار ہے، قائم و دائم ہے بلکہ اس کی مقبولیت اور پذیرائی میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اب ہر وہ فرد جسے سخن گوئی کا زعم یا وہم ہے اپنی شاعری جب چاہے، جہاں چاہے پوسٹ کر سکتا ہے!

ماضی میں اپنی تخلیقات کو قارئین کے نظر نواز کرنے کے لیے کسی رسالہ یا جریدہ، یا اس کے بعد کسی اخبار، کے مدیر کی کسوٹی کی محتاج تھی لیکن اب یہ قباحت جاتی رہی ہے۔ پہلے مبتدی سخنور کسی استاد کو کلام دکھایا کرتا تھا، اس خیال سے کہ قافیہ اور وزن کی درستی کے بغیر مدیر کی قینچی سے بچنا محال ہوتا تھا لیکن اب انٹرنیٹ نے ان تمام بندشوں سے آزادی عطا کر دی ہے!

پہلے اپنا کلام سنانے کے لیے مشاعروں میں شرکت حاصل کرنا ہی مبتدی شاعروں کے لیے ایک پل صراط سے گزرنے کے برابر ہوتا تھا لیکن اب مشاعرہ کی سہولت انٹرنیٹ پر فیاضی سے دستیاب ہے۔ بہت دل چسپ بات ہے کہ تا حال قابو میں نہ آنے والی کووڈ کی وبا نے جہاں فرد کی آزادی کو طرح طرح سے محصور کیا ہوا ہے اور بقول شخصے زمین تنگ ہو گئی ہے، وہیں زوم جیسی انٹرنیٹ کی سہولت نے شعرا کے لیے جیسے عالم بالا سے من و سلویٰ اتار دیا ہے! انٹرنیٹ پر مشاعروں کی بھرمار ہے اور وہ سہولت دستیاب ہے جس کا چند برس پہلے تک تصور بھی محال تھا۔ یعنی نہ کہیں جانے کی ضرورت رہی نہ کسی کو بلانے کی زحمت۔ اب گھر بیٹھے عالمی مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں جن میں دنیا کے ہر کونے سے شعرائے کرام کی شرکت بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گئی ہے! نہ ہلدی کی ضرورت نہ پھٹکری کی لیکن رنگ خوب چوکھا آتا ہے!

راقم الحروف کی شریکِ حیات وفن، پروین سلطانہ صبا کے یہ اشعار زوم کی سہولت کاری سے رچائے جانے والے مشاعروں کی کیا خوب عکاسی کر رہے ہیں:

کتنا آساں ہو گیا ہے مرحلہ یہ زوم سے
ہو رہی ہے کچی پکی شاعری بھی دھوم سے
ہاں مگر کچھ پختہ شاعر بھی ہیں ان کی بھیڑ میں
گفتگو میں جن کے جملے بھی لگیں منظوم سے
اے صبا ان سب کو جھولی بھر کے مل جائے گی داد
چاہے پختہ کار ہوں، یا ہوں کوئی معصوم سے

ایک اعتبار سے ان جدید سہولتوں کا خیر مقدم نہ کرنا تنگ نظری اور رجعت پسندی کی دلیل ہوگا۔ان سہولتوں نے ادب کی ترسیل کے لیے جو خیر مقدمی فضا پیدا کی ہے وہ بلا شبہ گراں قدر ہے اور اس کا اعتراف کھلے دل سے کرنا چاہیے لیکن وسائل کے اس ہجوم اور ازدحام میں ادب کا معیار اسی طرح
مجروح ہو رہا ہے جیسے ایک وطن سے دوسرے وطن نقل مکانی میں زبان کی ہلاکت ہوتی ہے!

اب نہ نثری تخلیقات کے لیے کوئی معیار بچا ہے نہ سخن وری کی کسوٹی برقرار رہی ہے بلکہ مغرب میں رہنے والے اور بزعمِ خود تخلیق کار کہلانے والے، افراد کے لیے تو زرِمبادلہ کی سہولت اور دستیابی نے ایک ایسا دریچہ کھول دیا ہے جس کے لیے دورِ ماضی میں جنم لینے والے تخلیق کار ترسا کرتے تھے!
بات اب صرف شعری مجموعوں کی کثرت اور تواتر تک نہیں رہ گئی بلکہ کلیات تک پہنچ گئی ہے!
پہلے یہ ہوتا تھا کہ ان زعیم شعرا کے کلام کی کلیات ہی ادب کے خزانے کی زینت بنا کرتی تھیں جنھوں نے سخن کے اوراق پر اپنے ان مٹ نقوش مرتسم کیے ہوتے تھے اور یہ کام عام طور سے ان کے اس دنیا سے پردہ کر جانے کے بعد ہوتا تھا جب ان کا کوئی مداح، شاگرد یا کنبے والا عزیز ان کے تمام سرمایۂ کلام کو مجتمع کر کے کلیات کی صورت میں انھیں یک جا کر دیتا تھا لیکن اب یہ پیش رفت عام نظر آتی ہے کہ سخن ور بزعمِ خود ہی یہ فریضہ ادا کر دیتا ہے۔اس کی حیات میں ہی بلکہ اس کی ادبی حیات کے ابتدائی برسوں میں ہی یہ کام پورا ہو جاتا ہے!
یوں لگتا ہے جیسے اسے یہ خطرہ لاحق ہو کہ اس کے بعد یہ بار کوئی اور نہیں اٹھا سکے گا!

معاملہ اگر کلیات تک ہی رہتا تو بھی غنیمت تھا لیکن میدانِ سخن میں گھوڑے دوڑانے والے شہ سواروں کے حوصلے تو اب یہاں تک پہنچے ہیں کہ ان میں سے کچھ بزعمِ خود اس طرح کے دعوے بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے شاعری کی ستر مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔چند ایک سخن ور تو نئی اصنافِ سخن کی ایجاد کا دعوی بھی کرتے پائے گئے ہیں اور ایجادِ بندہ کے ثبوت میں اپنی زنبیل فرہنگ سے ان کو انوکھے اور کانوں کو غیر مانوس نام بھی عطا کر چکے ہیں۔ہم میں اپنی بے بضاعتی کے اعتراف میں البتہ آج تک یہ ہمت پیدا نہیں ہو سکی کہ ان

قادر الکلام،شعر وسخن کے جدت طراز موجدوں سے ان کی ایجادات کی وجہِ تسمیہ جان سکیں!

راقم الحروف نے کوئی دو برس پہلے پاکستان میں انگریزی زبان کے سب سے بڑے اخبار، ڈان، کے ادبی صفحات کے لیے ایک مضمون تحریر کیا تھا جس کا عنوان تھا ڈالر کے شاعر! وجہ تسمیہ اس عنوان کی یہ تھی کہ مغرب میں بسنے والے شعرا میں ایک بڑی کھیپ ایسے سخن وروں کی ہے جو آج شعر کہنا شروع کرتے ہیں تو دیکھتے ہی دیکھتے، چند برس میں، صاحب دیوان ہو جاتے ہیں بلکہ کچھ حضرات تو ایسے زود گو نکلتے ہیں کہ چند برس میں ان کی کلیات بھی منصۂ شہود پر آجاتی ہیں۔

جو ہو رہا ہے وہ ایک طرح کا ان کے ڈالروں کی کمائی کا چمت کار ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ڈیڑھ دو لاکھ روپے میں سو ڈیڑھ سو صفحات کا دیوان چھپ جاتا ہے۔ ڈیڑھ دو لاکھ اس بے چارے، اور عام طور سے مفلوک الحال، شاعر کے لیے جو پاکستان یا ہندوستان میں رہ کر ہی اپنا رزق کما رہا ہے، ایک بہت بڑی رقم ہے لیکن ڈالر میں کمائی کرنے والے مبتدی شاعر کے لیے کوئی بڑی رقم نہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار ڈالر میں تین سو کتابیں کون سی مہنگی ہیں؟ پھر اللہ نے وسائل دیے ہوں تو کتاب کی تقریبِ رونمائی بھی بڑی دھوم دھام سے ہو جاتی ہے۔ سامعین کے ساتھ ساتھ تعریف وتوصیف کے پل باندھنے والے خیر خواہ نقاد بھی مل جاتے ہیں! بہ الفاظِ دیگر ڈالر سخن وری کی گاڑی کو زمین پر گھسٹنے نہیں دیتا بلکہ اس کے پر لگا دیتا ہے کہ وہ اڑ جائے!

مجھے یاد ہے کہ میرے اس مضمون کی اشاعت نے بہت سے مقامی زعمائے سخن کی تیوریوں پر بل ڈال دیے تھے۔ کچھ بل تو آج تک نہیں نکلے! سو قصہ مختصر، مشاعرے موسمی پھل کی طرح عام ہیں، بلکہ موسم کی قید و بند سے آزاد ہو چکے ہیں، لیکن وہ جو ہمارے مشاعروں سے وابستہ ایک تہذیب تھی، ایک ثقافت تھی، اس کی بندش بہت ڈھیلی بلکہ معدوم ہوتی جا رہی ہے!

ہو یہ رہا کہ انٹرنیٹ پر شاعری کی اس خود رو فصل کی آب یاری کرنے والا ایک خود ستائشی سماجی کلچر اگر ایک طرف نمو پا رہا ہے تو دوسری طرف ستائش باہمی کی جڑیں بھی دن بہ دن مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ تخلیق کار کو اب کسی نقاد کی پرواہ نہیں رہی کیوں کہ اول تو نقاد ہی ناپید ہیں، دوسرے نقاد کی جگہ اب تعریفوں کے پل باندھنے والے یاروں دوستوں بلکہ فیس بک کے احباب نے لے لی ہے جن کی پلٹنیں تیزی سے پیدا ہو رہی ہیں!

انٹرنیٹ کے شعرا کو اب صرف اس سے دلچسپی ہوتی ہے کہ ان کی شاعری کو لائیک کرنے والے کتنے ہیں۔ سو ادب کی کسوٹی اب صرف ایک رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ کسی تخلیق کو کتنی لائیکس ملتی ہیں۔ سو چا جائے تو ہمارے ادب میں اس رجحان سے وہ درباری کلچر واپس آ رہا ہے جسے تنقید نگاروں کا خیال یہ تھا کہ ترقی پسند تحریک نے ہمیشہ کے لیے دفنا دیا تھا! اور تو اور لائیک کے دیوانوں نے ایک اور سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے اور

وہ یہ کہ غیر معیاری کلام اور تک بندی کو معروف شعرا کے نام سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا ادبی جوا ہے جو انٹرنیٹ پر عام کھیلا جا رہا ہے۔ کھلاڑی یہ پانسہ یہ سوچ کر پھینکتا ہے کہ کسی نے اگر غور نہیں کیا اور توجہ نہیں کی تو اس کا جعلی سکہ بازار میں اسی کے نام سے چل جائے گا!

انٹرنیٹ پر تخلیقات کی یہ چمت کاری یا سحر انگیزی محض شاعری کے شعبہ تک محدود نہیں ہے بلکہ نثر کے میدان میں بھی کچھ کلا کاروں نے جدید ٹیکنولوجی کی مدد سے عجیب و غریب کارنامے سر انجام دیے ہیں! ٹیکنولوجی کی ایک سہولت کا نام ہے فوٹو شاپ، جس سے استفادہ کر کے نہ صرف تصاویر میں ردو بدل کیا جا سکتا ہے بلکہ تصاویر میں ان کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو اصل تصویر میں نہیں تھے!

انٹرنیٹ کے تخلیق کاروں کا قبیلہ پھیلتا جا رہا ہے لیکن وہ جو قبیلہ کی روایات تھیں جن میں سرِ فہرست ایک سردار یا امیر کا ہونا قبیلہ کی شیرازہ بندی کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا تھا، ناپید ہوگئی ہیں اور جب تخلیق کے معیار خود سرنگوں ہو جائیں، یا گر جائیں، تو پھر ادب کی قدر بھی گھٹ جاتی ہے۔ پرانی کہاوت ہے نا کہ عزت کمائی جاتی ہے، اپنے آپ کو منوانا ہو تو کچھ ایسا کرنا پڑتا ہے جو دیکھنے والوں، اور ادب کی رعایت سے، پڑھنے والوں کو متاثر کر سکے لیکن عصرِ حاضر کے انٹرنیٹ کے عادی تخلیق کار عزت سے زیادہ نام، اور وہ بھی فوری، کمانے کی طرف زیادہ مائل دکھائی دیتے ہیں۔ زور معیار پر نہیں اس پر ہے کہ کم سے کم وقت میں لائیک کرنے والے مداحوں کا گروہِ کثیر پیدا کیا جائے جو صرف آنکھ بند کر کے لائیک کا بٹن دبانا جانتے ہوں اور اسی کو تخلیقِ فن گردانتے ہوں!

ادب کے بازار میں فی زمانہ مال بہت ہے، بڑی افراط ہے، لیکن مصنوعات کا معیار ایسا ہے کہ منڈی بدنام ہو رہی ہے اور اسی بدنامی کے سبب اس بازار کا رخ کرنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں لیکن بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ بازار کے تاجروں کو اس کا شعور اور احساس نہیں کہ ان کی معیشت تباہ ہو رہی ہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

☆☆☆

ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد
صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی (بھارت)

اردو لوک گیتوں کے امتیازی اوصاف

لوک گیت لوک ادب کی اہم شاخ ہے جس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ اس میں انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام موضوعات بیان کیے جاتے ہیں۔ لوک گیت میں عوام کے جذبات کا فطری اور براہ راست اظہار ہوتا ہے۔ یہ عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہنے والا وہ ادبی سرمایہ ہے جو کبھی ضبطِ تحریر میں نہیں آیا، اس لیے آج تک لوک گیتوں کی کوئی تحریری شکل دستیاب نہیں ہوئی۔ اس میں انسان کے دلوں کی آوازیں واضح طور پر سنی جا سکتی ہیں۔ جس میں انسان کے سادہ جذبات بیدار نظر آتے ہیں اور اجتماعی خوشیوں اور غموں کا اظہار ہوتا ہے۔ انسان اپنی خوشیوں کا جسمانی اظہار رقص کے ذریعے اور زبانی اظہار گیت کے ذریعے کرتا ہے۔ دراصل جب انسان بے انتہا خوش ہوتا ہے تو کچھ نا کچھ گنگناتا ہے اور جب کبھی خوشی کی انتہا ہوتی ہے تو اپنے جسمانی اعضا کو بھی حرکت دینے لگتا ہے۔ یہیں سے رقص کا آغاز ہوتا ہے اور جب ان جذبات کو گیت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے تو اسے لوک گیت کہتے ہیں۔

لوک گیت زمانی اعتبار سے اتنے ہی قدیم ہیں جتنی خود انسانی تہذیب۔ قدیم عہد میں لوگ اپنی خوشیوں کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے تھے اور ان کی اس خوشی میں معاشرے کا ہر فرد شامل رہتا تھا۔ اس موقع پر سارے لوگ ناچ گا کر اپنی خوشیوں کا اظہار کرتے اور غموں میں بین کرتے تھے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو جب انسان کا وجود عمل میں آیا تو سب سے پہلے اس نے اپنی بات سمجھانے کے لیے اشاروں کا استعمال کیا۔ بعد میں زبان وجود میں آئی جب زبانی شکل میں اس نے اپنی بات کو پیش کیا تو سب سے پہلے اس نے نظم کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا یعنی شعری زبان کا استعمال کیا۔ جب یہی وسیلۂ اظہار شعری پیکر میں ڈھلنے لگے تو لوک گیت کا وجود عمل میں آیا۔ لوک گیت کے ابتدائی نمونے ہمیں قدیم مذہبی مقدس کتابوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وید، پران اور اپنشد میں لوک گیت کے ابتدائی نمونے موجود ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوک گیتوں کی روایت بہت قدیم ہے۔ ویدوں میں سب سے پہلے گاتھا اور گاتھن لفظ استعمال ہوا ہے جس سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لوک گیتوں کی روایت دورِ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ پراکرت اور اپ بھرنش زبانوں میں بھی لوک گیت کے نمونے دستیاب ہیں۔

سب سے پہلے لوک گیت کب وجود میں آیا؟ اس کا پختہ ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ کیوں کہ لوک گیتوں کا کوئی قلمی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے جس کی بنیاد پر لوک گیت کی ابتدا اور ارتقا کی کہانی بیان کی جاسکے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ویدوں سے لوک گیت کی روایت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں میں اس کے ابتدائی نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں، البتہ ان گیتوں میں پیش کردہ معاشرہ اور نظام سیاست کو دیکھتے ہوئے یہ ضرور اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان گیتوں کا تعلق کس عہد سے رہا ہوگا۔ یہ لوک گیت نہ نئے ہوتے ہیں نہ پرانے بلکہ ان کی جڑیں ماضی میں پیوست ہوتی ہیں۔ لوک گیت ہمارا قومی سرمایہ ہے جس کا نمونہ مختلف مواقع پر اکثر و بیشتر ہمارے گھروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوک گیتوں کی زبان ضرور بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر ان سب کا بنیادی جذبہ ایک ہی ہے کیوں کہ لسانی تفریق کی وجہ سے ایک ہی لوک گیت مختلف مقامات پر مختلف طریقے سے گایا جاتا ہے جس کی وجہ سے الفاظ اور آوازوں میں واضح طور پر فرق دکھائی دیتا ہے مگر ان کے جذبات و خیالات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ عام طور پر لوک گیت مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں:

i۔ بچے کی پیدائش کے موقع پر گائے جانے والے مختلف اقسام کے گیت

ii۔ شادی بیاہ کے موقع پر گائے جانے والے گیت

iii۔ موسموں اور تہواروں سے مناسبت رکھنے والے گیت

iv۔ پیشہ ورانہ افراد کے گیت

مذکورہ بالا امور پر بحث کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لوک گیت کے لفظ، ہیئت اور تعریف پر ایک نظر ڈالی جائے۔

انگریزی ادب میں لوک گیت اور لوک کتھاؤں کے لیے Ballad لفظ استعمال ہوا ہے، Ballad کا مادہ دراصل لاطینی زبان کا لفظ (بے لارے) ہے رابرٹس گریبس نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق Balle لفظ سے ہے اس کا مطلب اس گیت سے تھا جو گیت رقص کرتے وقت گایا جائے مگر بعد میں اس کا استعمال ہر طرح کے گیتوں کے لیے ہونے لگا۔

لوک گیتوں کی تعریف:

Understanding Poetry کے مصنف جیمس ریوس لوک گیت کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

''لوک گیت عوام کے جذبات کا براہ راست اور فطری اظہار ہوتے ہیں، یہ عوام کے

ذہن میں محفوظ رہنے والا وہ ادبی سرمایہ ہے جو ضبط تحریر میں نہیں آتا ہے۔''۲۔ص ۲۱

Everyman Encyclopaedia میں لوک گیت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"Folk songs fill a need. The word deal with topic such as love, play, work and big and little happening in the Singer's locality"

(VI th Edition VOI-S, 1978 P-302)

پنڈت رام نریش ترپاٹھی لوک گیت کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

''ان پڑھ دیہاتیوں کے دلوں سے نکلے ہوئے وہ جذباتی بول جو شعری اور لسانی پابندیوں سے آزاد ہوں پھر بھی ان میں لحن اور ایک قسم کا میٹھا سر ہے۔''۳

(پنڈت رام نریش ترپاٹھی۔گرم گیت۔کویتا کومدی۔ص ۴)

اڑیسہ کے مشہور لوک ادیب K. B. Das لوک گیت کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

"عوام کے دلوں سے نکلے ہوئے بول جو غیر اختیاری طور پر اضطراری حالت میں کسی المناک یا طربناک جذبے سے تاثر کے بعد نکل جاتے ہیں"۔۴

(بحوالہ اظہر علی فاروقی۔اتر پردیش کے لوک گیت۔ص ۱۸)

ڈاکٹر مجیب الاسلام لوک گیت کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"لوک گیت عوامی ادب کی وہ مشہور صنف سخن ہے جو انسانی پیدائش سے ظہور میں آئی۔ اس کی جغرافیائی حد بندیاں تو ضروری ہیں۔لیکن اس کے باوجود یہ عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہنے والا وہ قیمتی سرمایا ہے جسے ضبط تحریر میں نہیں لایا جاتا تھا۔ یہ ان عوام کے داخلی جذبات کا فطری اظہار ہے۔اس کا خاص کام خواتین کے جذبات کا بے اختیار اور ان کے بھرپور احساسات کا بیان ہوتا تھا"۔۵

(مرتبہ۔پروفیسر قمر رئیس،اردو میں لوک ادب۔ص ۲۸۴)

اس طرح لوک گیتوں کی بیان کردہ تعریفوں کی بنیاد پر لوک گیتوں کے واضح نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ان تعریفوں کو پڑھنے کے بعد ان کی تاریخ کا عکس بھی واضح طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔لوک گیت ہماری ماضی کی زندگی کا عکاس ہے جس میں عوام کے جذبات،خیالات ونظریات کا گہرا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں عوام کی سادگی اور معصومیت واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے چوں کہ اس کا ماخذ انسان کا دل ہوتا ہے اس

لیے ایک دل کی بات دوسرے دل پر گہرا اثر کرتی ہے۔لوک گیت کے چند الفاظ ہماری زندگی کے تاریک پہلوؤں کو روشن تر بنا دیتے ہیں۔اس میں پوری قوم کی تہذیب وتمدن کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔عموماً لوک گیتوں میں سنجیدگی، سادگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔لیکن کبھی کبھی گیتوں میں گہرا طنز بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔لوک گیتوں کی کوئی تحریری شکل دستیاب نہیں ہے۔یہ زیادہ تر سینہ بہ سینہ ایک شخص سے دوسرے شخص تک پہنچتا رہتا ہے۔لوک گیت اور ہماری تہذیب وتمدن کے درمیان ایک گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔اسی لیے لوک گیتوں میں ایک مخصوص سماج کا عکس واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ان لوک گیتوں میں سماج اور انسانی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔لوک گیتوں کی نوعیت انفرادی کے ساتھ اجتمائی بھی ہے۔کیوں کہ اس میں مشترکہ طور پر پورے سماج کے رسم ورواج،عقائدوتوہمات اور عادات واطوار کا بیان ہوتا ہے اور ان لوک گیتوں کی تخلیق میں پورے معاشرے کے لوگ شامل رہتے ہیں۔اس میں چھوٹے بڑے، اعلیٰ وادنی،امیر وغریب اور روٴساوامرا سبھی کا ذکر ملتا ہے۔عام طور پر دیہاتی زندگی کے ہر پہلو کا گیتوں میں ذکر ملتا ہے۔اگر ہم لوک گیتوں کو دیہاتی لوگوں کا منظوم تذکرہ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔جیسا کہ اظہر علی فاروقی نے لکھا ہے :

> "یہی وجہ ہے کہ لوک گیت کہنے پر عام طور پر وہ گیت سمجھے جاتے ہیں جو دیہاتیوں کی زندگی کے ترجمان ہوں۔اور دیہاتی سماج کی نمائندگی کریں اور جس پر شہری زندگی اور تمدن کی چھاپ نہ ہو اور شاید اسی لیے لوک گیت کی اصطلاح سے پہلے ان کے لیے گرام گیت لفظ مستعمل رہا ہے۔"[۷]

(اتر پردیش کے لوک گیت۔ص ۱۷)

لوک گیتوں کی تاریخ

لوک گیتوں کی تاریخ پر نظر ثانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوک گیتوں کی روایت بہت قدیم ہے۔یہاں تک کہ علما کا خیال ہے کہ یہ لوک گیت رگ وید سے قبل بھی گائے جاتے تھے۔کیوں کہ رگ وید میں لوک گیتوں کا ذکر کہیں مقام پر ملتا ہے۔رگ وید کب تصنیف ہوا اس کی تاریخ آج تک طے نہیں کی جا سکی،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوک گیتوں کی روایت بہت قدیم ہے۔رگ وید کے بعد مختلف مذہبی مقدس کتابوں مثلاً ارڑیک برہمن، پران،مہابھارت اور رامائن وغیرہ میں بھی مختلف موقعوں پر گیت گانے کا ذکر ملتا ہے۔کسی راجا کی ستائش اور یگہ کے موقع پر بھی گیت گانے کا رواج عام تھا۔جس کا ذکر کرتے ہوئے اظہر علی فاروقی لکھتے ہیں :

> "عہد قدیم میں کسی فرماں روا کی کارگزاریاں،اس کے فلاح و بہبود کے کارناموں کی

ستائشی گاتھا بہت کچھ تبدیل ہو کر عوام کے زباں زد ہو جاتے تھے اور پیڑھی در پیڑھی اور سینہ بہ سینہ چلتے رہتے تھے۔ جو بعد میں جن گاتھا یا لوک گیت کے نام سے مشہور ہوئے ۷۔" ص ۱۹

قدیم عہد میں یہ گیت ان ستائشی گاتھاؤں کے علاوہ شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی گائے جاتے تھے۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ دیوتاؤں کا ذکر کیا جاتا تھا۔ پارسی دھرم کی مذہبی کتاب "اویتا " میں بھی پارسی مذہب کے بنیادی اصولوں کو گیتوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ گوتم بدھ کی پیدائش کے متعلق جاتک کتھاؤں میں بھی خوبصورت گیت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وکرم سنوت کی تیسری صدی میں جس وقت پراکرت زبان اپنے عروج پر تھی اس زبان میں بے شمار لوک گیت تخلیق کیے گئے۔ راجا شالی واہن کے عہد میں لوک تخلیق کرنے اور گانے کا ذکر کئی مورخوں نے کیا ہے۔ یہاں تک کی اس راجا نے تقریباً سات سو گیتوں کا تحفظ بھی کیا تھا۔

بالمیکی راماین میں پروشوتم رام کی پیدائش کے وقت عورتوں کے ذریعے گیت گانے کا ذکر ملتا ہے۔ اس موقع پر گیت گانے اور رقص کرنے دونوں کا بیان تاریخ میں موجود ہے۔ کالی داس نے راجا دلیپ کے دربار میں گانے اور طوائفوں کے ذریعے رقص کیے جانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں محنت مزدوری کرتے وقت ایک ساتھ جمع ہو کر گیت گانے کا رواج عام تھا۔ سنسکرت کے مشہور شاعر وجکا نے ایک عورت کے ذریعے موسل سے دھان کوٹتے وقت خوبصورت گیت گانے کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ ایک عورت کھانا بنا رہی ہے مگر لکڑی کے دھوئیں سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہا ہے۔ اس معمولی سے موقع پر بھی گیت گانے کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ اس طرح اگر ہم دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ گیت گانے کا رواج زمانہ قدیم سے آج تک جاری و ساری ہے۔

ان گیتوں کا سلسلہ مختلف ادوار سے ہوتے ہوئے مسلمانوں کے ہندوستان آنے تک جاری و ساری رہا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد یہاں ایک نئی زبان وجود میں آنے لگی جسے بہت بعد میں اردو کے نام سے موسوم کیا گیا لیکن اس درمیان بھی مقامی بولیوں میں لوک گیتوں کا چلن تھا کیوں کہ فاتح اپنے ساتھ کوئی زبان لے کر نہیں آتا بلکہ وہ بہت حد تک مفتوح کی ہی زبان اور رسم و رواج سے گھلنے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح غیر ملکیوں اور مقامی افراد کے میل جول سے ایک مخلوط زبان وجود میں آئی مگر یہاں کے مقامی اثرات کی بنیاد پر ترکی اور فارسی زبان میں بھی گیتوں کا چلن ہوا یہاں تک کہ امیر خسرو کے عہد میں یہ اثرات واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس نئی زبان میں انھوں نے ایسے گیت تخلیق کیے جسے ہم لوگ گیت کہہ سکتے ہیں۔

جیسے قوالی، رنگ شریف، خیال اور قال وغیرہ راگوں کی ایجاد کی۔نمونہ کے لیے ان کا یہ مکھڑا دیکھیے :

دھیرے بہو ندیا مورے پیا ہیں اترت پار
گھی کے دینا بارو نندیا ہمرے گھر آئے محمد ﷺ بانرا

امیر خسرو سے یہ سلسلہ چلتا ہوا مغلیہ عہد تک پہنچا اور شہزادہ سلیم کی شادی کی تقریب میں دیسی بولیوں میں راجپوتوں کے ذریعے گیت گانے کا ذکر ملتا ہے جو اس طرح ہے :

تم ساہنشاہ ہم آپ کے داس
رہے کرم شاہ کا ٹوٹ نہ جائے آس

یہ سن کر اکبر نے جذباتی انداز میں کہا:

ہم شاہنشاہ سہی پھر بھی آپ کے بھائی
اور راجکماری محل کی آبرو اور چوکھٹ کی لاج

اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ مغلیہ عہد میں ترکی اور فارسی گیتوں کے علاوہ مقامی گیت بھی مختلف موقعوں پر گائے جاتے تھے۔مثلاً شادی بیاہ، سنسکاروں اور دوسری تقریبات کے موقعوں پر ان گیتوں کا چلن عام تھا۔ گیتوں کے رشتہ کو انسانی تہذیب وتمدن سے جوڑتے ہوئے اظہر علی فاروقی نے لکھا ہے :

''بہر کیف گاتھا کا وجود بالکل نظر آتا ہے اور انسان میں جذبہ قدیم عہد سے پایا جاتا ہے اگر بنی نوع انسان اور شاعری دونوں ہم عمر کہے جاسکتے ہیں تو لوک گیتوں اور بنی نوع انسان کی ہم عمری میں بھی کوئی شبہ پیدا نہ ہونا چاہیے۔''۸۔ص ۲۱

لوک گیتوں کے امتیازی اوصاف

لوک گیتوں کے کئی ایسے امتیازی اوصاف ہیں جو انھیں مروجہ شاعری سے الگ مقام عطا کرتے ہیں جیسے ان لوک گیتوں میں ردیف اور قافیہ کی قید و بند نہیں ہوتی بلکہ دیہاتی لوگوں کے جذبات کا برملا اظہار ہوتا ہے۔اس میں وزن کی کوئی قید نہیں ہے۔بلکہ گیت پڑھتے وقت حسب ضرورت گیت کی لے کو کھینچ تان کر پڑھنے سے وزن برابر ہو جاتا ہے۔چوں کہ لوک گیتوں کا عوام کے دلوں سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اس لیے ان گیتوں میں پیچیدگی نہیں پائی جاتی بلکہ جیسی ان کی سیدھی سادی زندگی ہوتی ہے ویسے ہی وہ سیدھے سادے الفاظ بھی میں اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔اسی لیے لوک گیت کی ایک تعریف یہ بھی ملتی ہے کہ''لوک گیت سیدھے سادے عوام کے دلوں سے نکلے ہوئے وہ احساسات و جذبات ہیں جو شعری اور لسانی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان میں بلا کی تاثیر ہوتی ہے۔''

لوک گیتوں کا سب سے اہم وصف یہ ہے کہ اس کا تخلیق کار گمنام ہوتا ہے کیوں کہ عام طور پر ان گیتوں کی تخلیق پورا معاشرہ مل کر کرتا ہے اس لیے اس کو کسی ایک شخص سے منسوب کرنا قطعی مناسب نہ ہوگا اور گیتوں میں چوں کہ تخلص کا بھی التزام نہیں ہوتا اس لیے ان گیتوں کے تخلیق کار کا علم نہیں ہو پاتا۔ کیوں کہ لوک گیت غیر شخصی اور گم نام ہوتا ہے یہ انفرادی نہیں بلکہ ایک اجتماعی صنف ہے اور نہ کبھی اسے ضبط تحریر میں لایا گیا۔ یہ صنف سینہ بہ سینہ رواں دواں ہے اور انسان کے دل و دماغ مین محفوظ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بہت سی چیزیں ایسے لوگوں سے منسوب کر دی گئی ہیں جن کا تعلق اس سے دور کا بھی نہیں ہے۔ اس کی بہترین مثال امیر خسرو کے بہت سے گیت، غزل، قوالی اور رلاونیاں ہیں جنھیں اکثر و بیشتر امیر خسرو سے منسوب کر دیا گیا ہے لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان چیزوں کا امیر خسرو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

رابرٹ گریبس نے لکھا ہے:

> ''موجودہ سماجی حالات میں کسی ادیب و شاعر کا گم نام ہونا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اسے اپنی تخلیق کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں شرم آتی ہے، یا پھر ڈر لگتا ہے، لیکن قدیم سماج میں یہ صرف تخلیق کار کے نام کی بے توجہی کے سبب ہوتی تھی۔''9

(The Old Enlish Ballads P-12)

لیکن گیتوں کے متعلق بہت سے علما نے اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ ان لوک گیتوں کا کوئی خالق ضرور رہا ہوگا۔ کچھ مغربی مفکرین بھی لوک گیتوں کا خالق کسی ایک شخص کو تسلیم نہیں کرتے ہیں لیکن جب تک ہمارے پاس مکمل شواہد موجود نہ ہوں ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کی گیتوں کا خالق کوئی ایک شخص ہے یا پورا معاشرہ۔ بہر حال آج تک کسی گیت کے تخلیق کار کا علم نہ ہوسکا۔ مگر کچھ اصناف جیسے خیال، لاونی، داد روغیرہ کے سلسلہ میں کسی حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کسی شاعر کی اپنی تخلیق ہیں۔

اکثر و بیشتر لوک گیتوں کے اصل متن کا علم بھی علما کو نہیں ہوتا چوں کہ گیت کا وجود مشترکہ طور پر عمل میں آیا ہے اس لیے اس کے بنیادی متن کی تصدیق کرنا بہت مشکل ہے۔ تخلیق چاہے جو بھی ہو وہ گیت تخلیق کر کے جدا ہو جاتا ہے۔ اب ایسی حالت میں یہ لوک گیت پورے معاشرے کی امانت ہوتا ہے اس میں وقت اور ضرورت کے لحاظ سے ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔ اب ایک ہی گیت لسانی تفریق کی وجہ سے مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ اصل گیت میں جب مقامی الفاظ خلط ملط ہو جاتے ہیں تو گیت کا پورا خاکہ ہی بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے گیتوں میں ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کی رابرٹ گریبس نے لکھا ہے کہ:

''کسی لوک گیت کا کوئی Original Version نہیں ہوتا گو عوام اپنی مرضی کے

مطابق اس میں پھیر بدل کرتے رہتے ہیں اس لیے کسی ایک Version کو ہی اصل
نہیں مانا جاسکتا''۔۱۰

(The Old English Bellads, P-12)

مثلاً ''الہا'' کا اصل مصنف جگنک کو تسلیم کیا جاتا ہے جو بندیل کھنڈ کی بولی میں تخلیق کی گئی۔ مگر الہا جو آج گایا جاتا ہے اس کو دیکھ کر ضرور کہا جاسکتا ہے اس میں اصل متن اتنا طویل نہیں رہا ہوگا جتنا آج گایا جا رہا ہے۔ اس طرح الہا کی طوالت اس کے اصل متن سے کہیں زیادہ ہے۔ بھوجپوری اور میتھلی میں گائے جانے کی وجہ سے اس کے الفاظ میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوک گیتوں کا کوئی بنیادی متن نہیں ہوتا اور نہ ہی آخری شکل ہوتی ہے۔

لوک گیتوں کا پورا سرمایہ زبان زد روایت پر منحصر ہے جو سینہ بہ سینہ نسل در نسل ایک شخص سے دوسرے شخص تک منتقل ہوتا رہتا ہے جو کہ ہمارے زبانی ادب کا اہم حصہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک رسم الخط ایجاد نہیں ہوئی تھی تب تک تمام چیزیں سینہ بہ سینہ ہی چلتی رہی ہیں یہاں تک کہ ہماری مذہبی کتاب قرآن مجید خود زبانی روایت کی دلیل ہے کیوں کہ جب جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور محمدؐ انھیں زبانی یاد کر لیا کرتے تھے، یہ وحی بعد میں قرآن مجید کی شکل میں ہمارے سامنے آئی جس کو بہت بعد میں تحریری شکل میں پیش کیا گیا۔ اس طرح زبانی ادب کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ جو ایک شخص سے دوسرے شخص تک منتقل ہوتی رہی۔ جیسا کہ گومر نے لکھا ہے کہ'' زبانی روایت کسی گیت کی اہم خصوصیت ہوتی ہیں'' اظہر علی فاروقی کا بھی یہی ماننا ہے کہ جو گیت تحریری شکل اختیار کر لیتے ہیں وہ ڈائمنشن سے محروم ہو جاتے ہیں کیوں کہ لوک گیت کا تعلق پڑھنے سے زیادہ گانے سے ہے۔

لوک گیتوں میں سادہ اسلوب اور فطری اثر انگیزی ہوتی ہے کیوں کہ لوک گیت شاعری سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ عروضی نظام کی قید سے پوری طرح آزاد ہے۔ یہ وزن، بحر، ردیف، قافیہ اور دیگر شعری لوازمات سے بالکل پاک ہیں۔ یہ دیہی عوام کے دلوں کا فطری اور براہ راست اظہار ہوتا ہے۔ جس میں ان کے سیدھے سادے اور فطری جزبات و احساسات کا گہرا عکس ہوتا ہے۔ کیوں کہ دیہاتی عوام سادگی پسند ہوتے تھے ایسی صورت میں فنی لوازمات کی پابندی کی ان سے امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی کیوں کہ زیادہ تر دیہاتی ناخواندہ تھے اس لیے ان کی اصناف بھی اس طرح کی پیچیدگیوں سے آزاد ہوتی تھیں۔

ان سے الفاظ کے ساتھ لہجے و تلفظ کی صحیح ادئیگی کی امید کرنا بے سود ہے۔ اس لیے لوک گیتوں کی زبان پر مقامی الفاظ کا اثر واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گیتوں کی زبان دیگر شعری اصناف کی بہ

نسبت مختلف نظر آتی ہے۔گیتوں کی زبان کا امتیاز خاص ہے کہ ان گیتوں میں جو الفاظ آگئے اور ان کے خیالات و جذبات سے مناسبت رکھتے ہیں تو ایسے الفاظ کو انھوں نے قبول کر لیا چاہے بنیادی طور پر وہ لفظ کسی بھی زبان سے تعلق رکھتا ہو۔وہ نہ تو متروکات کے قائل ہیں اور نہ وضع اصطلاحات کے حامی اور نہ ماخذات کا تصور ان کے یہاں کوئی اہمیت رکھتا ہے۔مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گیتوں کی زبان لوچدار Flexible ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے اعتبار سے ڈھال لیتے ہیں۔

لوک گیتوں پر مقامی اثرات کا گہرا عکس ہوتا ہے اور معاشرے سے لوک گیت کا تعلق ہوتا ہے اس معاشرے کی خط و خال کو پوری طرح اجاگر کر دیتا ہے چاہے اس میں کسی طرح کے مضمون کیوں نہ بیان کیے جائیں۔مقامی اثرات کی نمائندگی واضح طور پر نظر آئے گی یہی وجہ ہے کہ جس قوم،نسل،یا ملک میں جو لوک گیت رائج ہوتا ہے وہاں اس میں عوام کے تمام متعلقات کا ذکر خوبصورت طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔کبھی کبھی ان گیتوں مین مقامی تاریخی واقعات کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ان گیتوں کا موسیقی اور رقص سے چولی دامن کا رشتہ ہے کیوں کہ لوک گیت کے لیے Ballad لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے وہ گیت یا گانا جو رقص کے ساتھ پیش کیا جائے، جیسا کہ" بے لارے" کے معنی" ناچنا" ہے اس طرح Ballad گیت کو عام لوگ کورس میں گاتے تھے Exciting and respective music کے بغیر بنایا گیا گیت ادھورا ہے کیوں کہ موسیقی اس کی روح ہے۔

ڈھولک گیت، چہار بیت،قوالی اور لاونی وغیرہ میں موسیقی کو اہمیت حاصل ہے۔اسے اکثر گاجے باجے کے ساتھ ہی گاتے ہیں۔اس دوران ایک شخص کے ذریعے گائے جانے والے گیت کو کورس میں لوگ دہراتے ہیں۔گیت اور موسیقی کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ جہاں کہیں موسیقی کے آلات دستیاب نہیں ہوتے ہیں لوگ ان کی جگہ دوسری چیزوں سے آلاتِ موسیقی کا کام لیتے ہیں۔

لوک گیتوں میں حزن و یاس کی بھی خوبصورت تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔جس میں ہمارے معاشرے کے دردناک پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔کیوں کہ دیہاتی لوگوں کا غموں اور مصیبتوں سے گہرا رشتہ ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر مفلسی اور درد کا شکار رہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے گیتوں میں بھی اس پہلو پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔عام طور پر گیتوں میں عوام کے غم بھی مشترک نظر آتے ہیں۔جیسے خانگی زندگی میں ساس نند کا سلوک، بیٹی کی رخصتی،شوہر سے جدائی اور بانجھ عورت کے گیت دیہاتی لوگوں کے غموں کی عکاسی کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

اشفاق حسین
ٹورنٹو،کینیڈا

کینیڈا میں اردو زبان کی تعلیم

ایک عرصے تک اردو دنیا کے نقشے پر زبان و ادب کے حوالے سے کینیڈا کا نام تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ایسا نہیں تھا کہ یہاں اردو زبان وادب سے محبت رکھنے اور اس کی ترویج و اشاعت میں تن من دھن کی بازی لگا دینے والوں کی کمی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کینیڈا کے اردو داں طبقے اور پاک و ہند کے ''مین اسٹریم لٹریچر'' کے دھارے میں رابطے اور آگاہی کا فقدان تھا اور پھر یہ بھی کہ ثقافتی اور سماجی عوامل بھی اس قدر سازگار نہ تھے جیسا کہ اب نظر آتے ہیں لیکن گزشتہ صدی کی آخری تین دہائیوں نے اس پوری صورتِ حال کو بدل کر رکھ دیا۔واقعہ یہ ہے کہ کینیڈا میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے کچھ کام تو ہو رہا تھا مگر ''مین لینڈ اردو'' کی عام فضاؤں میں اس کا چرچا یقینا بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہی پورے زور وشور سے ہوا۔

کینیڈا میں اردو زبان و ادب کی بتدریج نشوونما کو تین زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلا زاویہ زبان کی ترویج و اشاعت اور درس و تدریس سے متعلق ہے۔ دوسرا پہلو زبان کے ثقافتی حوالے سے ہے جس میں سرِفہرست مشاعروں اور ادبی تقریبات کا انسٹی ٹیوشن ہے اور تیسرا پہلو، ادبی تخلیقات کی نوعیت، ان کا ارتقا اور مین اسٹریم لٹریچر میں ان کی قبولیت اور اہمیت سے متعلق ہے۔اس مضمون میں مختصراً میں صرف ایک پہلو یعنی زبان کی تدریس کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

زبان کی درس وتدریس:

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی جدید تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ اردو زبان میں محفوظ ہونے کی وجہ سے اس زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کینیڈا کی وہ جامعات جہاں جدید اسلامی علوم، جنوبی ایشیائی مسلمانوں کی تاریخ اور برصغیر کی تہذیب وثقافت سے متعلق نصاب کی ترتیب دی جاتی ہے۔وہاں اردو زبان کی درس و تدریس کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔اس سلسلے میں مانٹریال کی میک گل یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا نام سرِفہرست آتا ہے۔اس انسٹی ٹیوٹ کا قیام ۱۹۵۱ء میں عمل میں آیا اور یہاں پر پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر اردو کی تدریس شروع ہوئی جس کی نگرانی پروفیسر عبدالرحمن بارکر کے ذمے تھی۔ بارکر صاحب نے اردو زبان کی تدریس کے لیے آٹھ جلدوں پر مشتمل اردو کی ابتدائی تعلیم کا نصاب، میک گل یونیورسٹی

ہی کے زیر اہتمام ترتیب دیا جو کینیڈا کے علاوہ دوسری امریکی جامعات میں بھی داخلِ نصاب ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے آڈیو کیسٹ کی تیاری میں بھی حصہ لیا جس کے ذریعے اردو بالکل نہ جاننے والے طالب علموں کو بول چال اور گرامر کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

یونیورسٹی کے مالی وسائل میں کمی کی بنا پر اردو تدریس کا یہ سلسلہ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۴ء تک منقطع رہا۔ میک گل یونیورسٹی کے علاوہ ٹورنٹو کے سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز میں پروفیسر عزیز احمد نے اپنے قیام کے دوران یہاں اردو کی تدریس کا پروگرام گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ لیول پر جاری رکھا لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ پودا پھل پھول نہ سکا۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۳ء میں یونیورسٹی آف ٹورنٹو کے **Continuing Education Program** کے تحت اردو زبان کی تعلیم کا سلسلہ بھی چند سال تک جاری رہا۔

ٹورنٹو ہی کی ایک اور یونیورسٹی، یارک یونیورسٹی کے سنٹر فار ساؤتھ ایشین اسٹڈیز اور وینکور میں یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا کے سنٹر فار ایشین اسٹڈیز میں بھی اردو زبان کا کوئی باقاعدہ شعبہ تو نہیں تھا لیکن علوم اسلامی کے تدریسی حوالوں میں یہ زبان ان کے نصاب کا باقاعدہ حصہ ضرور رہی ہے۔

کینیڈا میں یونیورسٹی کی سطح پر اردو زبان کی تعلیم کے سلسلے میں اصل کام نومبر ۱۹۸۷ء میں ہوا، جب میک گل یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں باقاعدہ اردو چیئر کا قیام عمل میں آیا اور منی سوٹا یونیورسٹی کی پروفیسر ساجدہ علوی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ اردو چیئر کے قیام میں میک گل یونیورسٹی کے علاوہ حکومتِ کینیڈا کی ملٹی کلچرل ازم کی وزارت اور حکومتِ پاکستان کا مالی تعاون شامل ہے۔ بلا شبہ اس چیئر کا قیام اردو زبان کی درس و تدریس کے باب میں ایک اہم سنگ میل ہے اور اس ایک کھڑکی کے کھل جانے کی وجہ سے کئی اور راہیں نظر آ رہی ہیں۔

میک گل یونیورسٹی میں اردو چیئر کے قیام کے صرف تین سال کے اندر اندر یعنی ۱۹۹۰ء میں ٹورنٹو کے نارتھ یارک بورڈ آف ایجوکیشن اور نیشنل فیڈریشن آف پاکستانی کینیڈینز کے تعاون سے بچوں کے لیے نئی درسی کتابیں لکھنے کا ایک پروجیکٹ شروع ہوا جو تکمیل کے بعد اب میک گل یونیورسٹی میں اردو نصاب کے طور پر باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے۔

ابھی تک زیادہ تر گفتگو یونیورسٹی کی سطح پر ہونے والی تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق رہی ہے لیکن نقل مکانی کر کے یہاں مستقل سکونت اختیار کرنے والوں کے لیے خاص طور سے ان کے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے حوالے سے کینیڈا کے نظام تعلیم کا ایک انتہائی روشن باب اس کا **Heritage Language Program** ہے۔

اس پروگرام کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی گئی کہ کینیڈا دنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک ہے جہاں مختلف علاقوں، مختلف کلچر اور مختلف زبانوں کے لوگوں کی نقلِ مکانی اور مستقل سکونت کا سلسلہ جاری ہے۔ بڑے پیمانے پر مائیگریشن کے اس عمل سے سماجی، سیاسی اور ثقافتی ناہمواریوں کا پیدا ہونا بھی ایک فطری امر ہے جس کا اظہار کینیڈا کے سیاسی منظر نامے پر آئے دن ہوتا رہتا ہے۔

ماضی قریب میں کینیڈا کی حکومتوں نے برطانوی اور فرانسیسی نسل سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ بھی دوسری قوموں، ان کی ثقافتوں اور ان کی زبانوں کے تحفظ کے لیے عملی اقدامات کیے ہیں اور انہی اقدامات کے نتیجے میں کینیڈا میں ملٹی کلچرل ازم کی وزارت کا قیام اور مختلف زبانوں اور ان کی ثقافتوں اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کو باقاعدہ قانونی شکل دی جاچکی ہے اور اب ملٹی کلچرازم کی پالیسی کینیڈین سیاست اور طرزِ زندگی کا ایک اہم ستون ہے۔

اسی ملٹی کلچرل ازم کی پالسی کے حوالے سے کینیڈین رائل کمیشن نے ۱۹۶۷ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ

> The presence in canada of many people, whose languages and cultures are distinetive, by reason of their birth or ancestry, represents valuable enrichments to the society, that canadian cannot afford to loose..
> Linguistic, variety unquestionable is an advance and its beneficise effects on country are priceless.

ثقافتوں اور زبانوں کے بارے میں اسی مثبت طرزِ فکر کے نتیجے میں کینیڈا کی وفاقی حکومت کی طرف سے Heritage Language Programes بنایا گیا۔ اس میں بہت تفصیل سے اس پروگرام کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر زور دیا گیا ہے۔ وہ تارکین وطن جن کی مادری زبان فرانسیسی یا انگریزی نہیں ہے، ان کے لیے ورثہ زبان کے اس پروگرام میں بڑی کشش ہے۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں یہی وہ پروگرام ہے جس کے تحت مختلف لسانی گروہ، کینیڈا کے بہت سے شہروں میں اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان کی تعلیم دلوا رہے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں جب یہ پروگرام پہلی بار شروع ہوا تو اس وقت ٹورنٹو اور اس کے گردونواح کے تعلیمی اداروں میں پندرہ زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی جس میں اردو زبان شامل نہیں تھی لیکن اب چالیس سے زیادہ

زبانیں پڑھائی جاتی ہیں اور جن میں اردو زبان بھی ایک اہم زبان کے طور پر شامل ہے۔

ابتدا میں اردو زبان کی تعلیم کا یہ سلسلہ کسی حد تک اطمینان بخش نہیں تھا۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی، ابتدائی کتابیں جو کینیڈین ماحول کے مطابق لکھی گئی ہوں ان کا نہ ہونا، جدید تدریسی ماحول کی نایابی اور اس قسم کے دوسرے عوامل سے یہ پروگرام ہمیشہ متاثر رہا ہے لیکن میک گل یونیورسٹی کی اردو چیئر نے اس ضمن میں جو پیش رفت کی ہے اس کی وجہ سے تدریسی طریقۂ کار میں نمایاں تبدیلی محسوس کی جا سکتی ہے۔

☆☆☆☆

ستیہ پال آنند
واشنگٹن، امریکا

غزل کا تصور

حلقہ اربابِ ذوق (واشنگٹن) میں ایک تقریر کا متن

پہلے تو ہمیں 'جدید' کے حوالے سے قدیم کو سمجھنا پڑے گا، یا 'قدیم' کے حوالے سے جدید کو سمجھنا پڑے گا۔ اگر جدید غزل اپنی پوری جسامت میں معرض وجود میں نہ آئی ہو اور گھٹنوں کے بل ہی چل رہی ہو یا اس کے بینر کے نیچے چار پانچ عجیب الخلقت ورثائے صلبی چل رہے ہوں جن میں ہر ایک کی وراثت کا کلیم ابھی ثابت ہونا باقی ہو، تو اس کے حوالے سے قدیم کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہاں، قدیم کو جدید تھیوریوں، نئے تصورات اور اصطلاحوں سے (جو پہلے ناپید تھیں) بہت آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ غزل کا ایک خاص مضمون اس مجموعی قسم سے تعلق رکھتا ہے جسے خود ترحمی کہا جا سکتا ہے، (اور جس کے تحت غزل کے بیشتر اشعار رکھے جا سکتے ہیں) یہ ہے، "تنہائی"، جس کے تحت اس طرح کی ضمنی یا ذیلی یا تحت التحریر مقاطعی اصطلاحات رکھی جا سکتی ہیں۔ عزلت، بیگانگی، اعتکاف، بیراگ، تیاگ، دست کشی، اجنبیت، سُوناپن، اداسی، جوگ وغیرہ۔ یہ جواب لکھ رہا تھا کہ غالب اور میرؔ کے دو اشعار سامنے آئے۔ ایک ہم عصر شاعر کی اپج بھی۔

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
(غالبؔ)

کوئی جہت یاں ایسی نہیں جو خالی ہووے اس سے میرؔ
یہ طرفہ ہے شورِ جرس سے چار طرف ہم تنہا ہوں
(میر تقی میرؔ)

اب ایک ہمعصر شاعر (ظفر اقبال صاحب) کا شعر دیکھیں:

راستہ صحرا سے ہو باہر نکلنے کا کوئی
زندگی کی دھوپ میں مجھ کو شجر درکار ہے
(ظفر اقبال)

چہ آنکہ غالب اور میر کے اشعار ظفر اقبال کے شعر سے بہتر ہیں تو بھی ظفر اقبال کا شعر صرف مصرع اولیٰ میں صحرا سے باہر نکلنے کی خواہش کا اعادہ کرنے کی بنا پر اس چبے چبائے ہوئے استعارے کی سطح پر بھی ایک نئی جہت کی تشکیل کرتا ہے۔ اس شعر میں بھی البتہ شاعر اپنا دامن راستہ، صحرا، دھوپ، شجر، جیسے پارینہ، چبے چبائے ہوئے اور پیش پا افتادہ کلیشے کی قسم کی اصطلاحات سے اپنا دامن بچا نہیں پایا جو literally لاکھوں بار اردو کی غزلیہ شاعری میں استعمال ہو چکے ہیں۔

اب آپ کے تفنن طبع کے لیے بھی اور یہ نکتہ سمجھانے (سمجھانے نہیں!)' کے لیے یہاں اپنی ایک نظم لکھ رہا ہوں جو جنت، دوزخ اور (عالم ناسوت) کے مابین دنیا ''اعراف'' میں بھٹکتی ہوئی ایک روح کی داستان ہے جو مندرجہ بالا دنیاؤں میں جانے کے بجائے اس 'صحرا' میں بھٹکنے کو بہتر سمجھتی ہے۔ دیکھیں اور سمجھیں، داد نہ بھی دیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ نظم پہلے انگریزی میں لکھی گئی:

''خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
کوئی دروازہ نہیں تھا قفل جس کا کھولتا
سر نکالے کوئی سمت الراس بھی ایسی نہیں تھی جس سے رستہ پوچھتا
ایک قوسِ آسماں حدِ نظر تک لاتعلق سی کہیں قطبین تک پھیلی ہوئی تھی
دھند تھی چاروں یگوں کے تابقائے دہر تک۔۔۔
اور میں تھا
اور میں تھا
لاکھ جنموں کی مسافت سے ہراساں بھاگ کر
اعراف کے لاسمت صحرا میں بھٹکتا
کوئی روزن، کوئی در، کوئی دریچہ ڈھونڈتا، پر
یہ بھٹکنا خود میں ہی بے انت، ابدالدہر تھا
ایسی سناتن، قائم و دائم حقیقت
جس سے چھٹکارہ فقط اک اور قالب میں دخولِ عارضی تھا
اس جنم میں جو نئی زنجیر میں پہلی کڑی تھی
ان گنت کڑیوں کی صف بستہ قطاروں سے مرتب
اور میں خود سے ہراساں

یہ کہاں برداشت کر سکتا تھا
جس زنجیر سے میں، تسمہ پا، اک لاکھ جنموں کی مسافت سے صیانت پا چکا ہوں
اس میں پھر اک بار بستہ بند ہو کر چل پڑوں
بے انت جنموں کے نئے پیدل سفر پر؟
ہاں مجھے تسلیم ہے یہ
خانۂ مجنونِ صحرا گردکی بے در مسافت
میرے 'ہونے' اور 'ہونے' کے گزرتے وقت کا دورانیہ
برزخ کے باب و در سے عاری دشت میں ہی
تابقائے دہر تک
جنموں کے دوزخ سے رہائی کے لیے''

میں نے مندرجہ بالا متن کے کچھ حصص کو اپنی کتاب ''کتھا چار جنموں کی'' سے لیا ہے۔ اب ان چیزوں کو ذہن میں رکھ کر غالب کے ایک شعر اور میری نظم پر شمس الرحمن فاروقی کا تبصرہ دیکھیے۔ غالب نے کہا تھا

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

اب میری نظم دیکھیے:

''بندہ پرور، مصرع اولیٰ کو پہلے دیکھ لیں
ہو اجازت گر تو میں اس ضمن میں لب وا کراؤں؟

مرزا غالب:
مصرعِ اولیٰ ہی کیوں یکسر، اکیلا؟ ستیہ پال؟

ستیہ پال آنند:
اس لیے، اے بندہ پرور، مصرعِ اولیٰ ہے یکتا
خود میں ہی کامل، مکمل۔۔۔ اک مقولہ، اک حدیث
مصرعِ ثانی تو اس کی پیروی پر دال ہے

مرزا غالب:
ہاں، کہو جو کچھ بھی کہنا ہے تمھیں، اے ستیہ پال!

ستیہ پال آنند:

ہے پسندیدہ تصوف کا علاقہ آپ کا، بندہ نواز
میں بھلا اس ضمن میں کہنے کی جرات کیا کروں
ہاں اگر یہ آپ کی مرضی ہے تو سنیے، حضور
مدرسہ ہائے تصوف صاد کرتے ہیں سبھی
آفرینش کے سبھی اجزا کو ہے کلّی ثبات
مہر گردوں کی حقیقت؟ آپ کا فرمان ہے
باد کے جھونکے کی زد میں اک چراغِ رہ گزر؟
جی نہیں، قبلہ، کہ یہ اک واہمہ ہے سر بسر
کائنات اک واقعہ، اک سانحہ بالکل نہیں
یا محی اور یا ممیت اس میں سدا ہیں جلوہ گر
رو میں گرداں ہے یہاں داور کا فیضانِ وجود
ما بقا، پائندہ ہے یہ عارضی، بالکل نہیں!

مرزا غالب:

دیکھ، ستیہ پال، یہ تفریق خود میں ہے سوال
موت کو بھی موت آ سکتی ہے، کیا یہ سچ نہیں؟

ستیہ پال آنند:

موت کو گر موت آ سکتی ہے، قبلہ، تو کہیں
کیوں زوال آمادہ ہیں یہ آفرینش کے نشاں؟

مرزا غالب:

آفرینش خود میں ہی تو مرگ آسا ہے، عزیز
ایسا رشتہ کیا "اضافی" ہے؟ نہیں، بالکل نہیں!
ہر نیا لمحہ "فنا" ہے اور ہر لمحہ "وجود"
اک مزے کی بات سن لو، ستیہ پال آنند، تم
ہے اوائل عمر کی غزلوں میں یہ میری غزل

اتنی کچی عمر میں، واللہ! یہ پختہ کلام
یہ کہا تھا اس نے اور پھر ہنس کے رخصت ہو گیا
ستیہ پال آنند:
کون تھا وہ بندہ پرور، یہ تو بتلائیں مجھے؟
مرزا غالب:
کون تھی وہ، یہ تھا سیدھا سا سوال، اے ستیہ پال
تم نے پوچھا ہی نہیں ہے، اور میں بے لوث ہوں

اس مکالمے پر شمس الرحمان فاروقی نے تبصرہ کیا کہ غالب ایک مکتوب (بنام انوار الدولہ شفق) میں لکھتے ہیں۔ " آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف، کچھ نجوم لگا رکھا ہے، ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے!" یہ بات درست ہے بھی اور نہیں بھی۔ درست اس لیے کہ شاعری میں چھپا ڈھکا ہوا لیکن موصوف کے خطوط میں برملا تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ شعر تصوف کی تعلیمات کے عین برعکس ہے۔ آپ نے بھی تحریر کیا ہے اور میں اس پر صاد کرتا ہوں کہ کائنات میں یا محی اور یا ممیت کی جلوہ افروزی، ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ کروڑوں کہکشائیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، مرتی رہتی ہیں۔ ہر آن فنا ہے اور ہر آن فیضان وجود۔

شعر میں البتہ صرفی ونحوی صحیح طریق کار کی ضرورت تھی جو روا نہیں رکھی گئی۔ "باد گردوں ہے چراغ رہ گذارِ باد یاں"۔۔۔اس میں چراغ اور ہوا کو بظاہر مماثل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ان میں حریفانہ جذبہ کارفرما ہے۔

آپ کی نظم بہت سی باتیں شعر سے غیر متعلق نظر آتی ہیں جو ایک عیب ہے لیکن مکالماتی طرزِ تحریر میں ان کی ذمہ داری شاعر کے سر نہ منڈھ کر اس کردار کی ہو جاتی ہے جس کے منہ میں یہ ڈالی گئی ہوں۔

آریان ہوپف
شعبہ جدید لسانیات ولٹریچر، جنوبی ایشیا
جنوبی ایشیاانسٹی ٹیوٹ، ہائیڈل برگ، جرمنی

اردو ادب میں مقامی رنگ

جہاں ہندی ادب میں دوسری جنوب ایشیائی زبانوں سمیت دیہاتی زندگی کے بارے میں بے شمار افسانے اور ناول لکھے گئے ہیں، وہاں اردو کی ایک استثنائی حیثیت معلوم ہوتی ہے۔ ہندی میں یہ صنفِ ادب " آنچلک "ادب کہلاتا ہے اور انگریزی میں عام طور پر ریجنل یعنی مقامی ادب کے نام سے جانا جاتا ہے، تاہم اس کا لغوی مطلب لفظ آنچل سے ماخوذ ہے جو ساڑھی کے کنارے (پلو) کی طرف نشان دہی کرتا ہے۔ پھنیشور ناتھ رینو کے مقبول ناول " میلا آنچل "(۱۹۵۴ء) کے بعد سے اس صنف کے لیے آنچلک ادب کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔

اس ناول نے ہندی ادب میں ایک نئی روایت کے لیے راہ ہموار کر دی جو ۵۰ رویں دہائی میں خاص طور پر رائج ہوئی حالانکہ دیہاتی زندگی کا موضوع اس زمانے میں بھی کوئی بالکل انوکھی اور نرالی بات نہ تھی اور اس کا آغاز بہت پہلے منشی پریم چند سے ہندی (اور اردو میں) ہوا تھا، پھر بھی " میلا آنچل "اس اعتبار سے بے نظیر تھا کہ اس میں بڑی حد تک دیہاتی بہار کی علاقائی ہندی بولی استعمال ہوئی ہے۔ پریم چند نے بلا شبہ اپنی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کی خوب عکاسی کی، مگر ان کی کہانیوں میں کسی خاص علاقے کا احساس نہیں ملتا جیسے کہ رینو کے ناول میں محسوس ہوتا ہے۔ اس میں رینو کا علاقائی بولی استعمال کرنے اور اسی علاقے کی زندگی کی خصوصیات بیان کرنے کا بہت اثر ہے[۲]۔

اردو میں علاقائی ادب

اردو ادب میں بلا شبہ آنچلک ادب سے مماثل کئی مثالیں موجود ہیں۔ مگر اردو ادب میں اس طرز کی تصانیف کی نہ کبھی کوئی علیحدہ صنف بنی، نہ ہی بڑے پیمانے پر کوئی اہم روایت۔ بظاہر پریم چند کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی تصانیف کسی ایک علاقے کی دیہاتی زندگی کی عکاسی نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کے کرداروں کی زبان سے اس چیز کا سراغ ملتا ہے۔ البتہ ان کی زبان میں تلفظ کی چند خصوصیات ہیں جیسے کہ ان کی مشہور کہانی " کفن "کے کردار مثال کے طور پر ز، ذ، ض یا ظ کی صحیح ادائیگی

سے قاصر ہیں اور اس کے بجائے ج بولتے ہیں۔ مثلاً زندگی کی جگہ ان کے کردار جندگی بولتے ہیں یا ف کی جگہ پھ بولتے ہیں، جیسے کہ بے وفائی کی جگہ بے وپھائی۔ علاوہ بریں ان کی زبان معیاری اردو سے الگ کسی علاقائی خصوصیت سے عاری ہے اور مذکورہ بالا مثالیں صرف ان کے کرداروں کے طبقے اور کم تعلیم یافتگی کی طرف نشان دہی کرتی ہیں ۳۔

پریم چاند کے بعد آنے والے ترقی پسند تحریک کے بیشتر ادیبوں کی کہانیاں، باوجود یکہ وہ بلاشبہ پریم چند سے متاثر تھے اور ان کی معاشرتی حاشیے کو دکھانے کی سعی سے متفق تھے، زیادہ تر شہری زندگی پر مرکوز ہیں۔ چاہے وہ منٹو ہوں، جنھوں نے طوائف کی زندگی دکھانا اپنا فرض بنالیا ہے، یا عصمت چغتائی جنھوں نے زنانے کی تنقید میں قلم اٹھایا، یا بالفاظ دیگر انھوں نے علی العموم عام آدمی کو ادب کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ بہر حال جہاں دیہاتی زندگی دکھانے کی بات آئی، وہاں احمد ندیم قاسمی کو استثنائی حیثیت حاصل ہے، جنھیں پنجاب کی دیہاتی زندگی دکھانے کے لیے اکثر پنجاب کے پریم چند ہونے کا لقب مل چکا ہے۔ مگر اس کے باوجود پریم چند کے بارے میں کیے گئے مشاہدے احمد ندیم قاسمی میں بھی نظر آتے ہیں، جن کی کہانیوں میں دیہاتی پنجاب دکھانے کے باوجود کرداروں کی زبان سے پنجاب کا کہیں احساس نہیں ملتا۔ سارے مکالمے معیاری اردو میں ہیں جو قاری کو یہ پوچھنے پر مجبور کرتا ہے کہ پنجاب کے ماحول میں پنجابی کہیں سنائی کیوں نہیں دیتی؟ مگر یہ شکوہ صرف قاسمی صاحب پر ختم نہیں ہوتا۔ دوسرے مصنفین بھی جن کی مادری زبان پنجابی تھی اور جو اردو میں پنجاب کے بارے میں لکھتے تھے جیسے کہ راجندر سنگھ بیدی، اپنی تصانیف میں پنجابی کا ذرا سا احساس داخل نہیں ہونے دیا۔ ان کے کرداروں کی زبان سے اس علاقے کا ذرا بھی ذائقہ نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی کہانیوں میں بیچ بیچ میں محض پنجابی لوک گیت استعمال ہوئے۔ ان چند ہی استثنائی مثالوں کو درکنار رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں زبان کو مقامی رنگ دینے کو ترجیح نہیں دی گئی۔ لہٰذا اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ اردو ادب میں دیہاتی زندگی کا موضوع کوئی انوکھی بات نہیں، مگر اس میں علاقے کا خاص رنگ اور بو بہت کم دکھائی دیتی ہے۔

یہ مشاہدے بہر حال قبل از تقسیم کے ہندوستان اور پاکستان کے ادب تک محدود معلوم ہوتے ہیں جب کہ موجودہ انڈین اردو ادب کے مصنفین علاقائی لسانی خصوصیات سے منکر نہیں لگتے، جس سے اسے علیحدہ انڈین اردو ادب کا درجہ حاصل ہوا۔ اس کی پہلی مثال جو ذہن میں آتی ہے، وہ راہی معصوم رضا کا ناول " آدھا گاؤں" ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۹ء میں ہندی میں شائع ہوئی، تاہم اس کا اصل نسخہ اردو میں لکھا گیا تھا جس کی بنا پر اس کا ذکر یہاں اردو ادب کے زمرے میں کرنا نامناسب نہیں ہوگا۔ یہ ناول مشرقی اتر پردیش میں

دیہاتی ماحول کی ایک کہانی ہے اور مصنف مکالموں میں علاقائی بولی استعمال کرنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتے۔ قرۃالعین حیدر کے بھی بہت سے کردار اودھی بولتے ہیں، جس سے لکھنؤ کے علاقے کا احساس پیدا ہوتا ہے لیکن یہ انڈین اردو ادب کی خاصیت لگتی ہے، جب کہ پاکستانی اردو میں علاقائی رنگ سے ایک جھجھک سی معلوم ہوتی ہے۔ انڈیا اور پاکستان میں اردو ادب کی الگ نشوونما کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل بحث میں ہمیں اردو کی تاریخ اور اس کی پاکستان میں حیثیت کا جائزہ لینا ہوگا۔

اردو زیادہ تر ایک شہری زبان مانی جاتی ہے جو شاید ۱۹/ویں صدی کے ہندی اردو تنازعے کا انجام ہے، جس کے نتیجے میں ہندی اور اردو دو علیحدہ زبانوں کی حیثیت سے جانی جانے لگیں۔ یہ تنازعہ ۱۸۶۰ء کی دہائی میں شمالی ہندوستان کے سرکاری دفاتر اور عدالتوں کی زبان کے سوال پر برپا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ حکومت کی متضاد لسانی سیاست اور اس سے وابستہ اچھی نوکری کے مواقع میں ملتی ہے، کیوں کہ ذریعہ تعلیم کے طور پر حکومت دیوناگری رسم الخط میں ہندی اور نستعلیق میں اردو تحریر کی برابر حمایت کرتی تھی جب کہ سرکاری نوکری کی شرائط میں صرف اردو قبول کی جاتی تھی۔ گمان کیا جاتا ہے کہ اردو تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے کی زبان مانی جاتی تھی۔ تاہم ہندی دیہاتیوں اور غیر تعلیم یافتہ خواتین سے منسوب کی جاتی تھی۔ چوں کہ اس زمانے میں فارسی اور عربی ہنوز تہذیب اور تعلیم کی علامت سمجھی جاتی تھیں، اس لیے شرفا انھیں زبانوں سے ماخوذ الفاظ کے چناؤ کو ترجیح دیتے تھے۔

حکومت کی اس متضاد سیاست کی بدولت جہاں سرکاری نوکریاں اردو بولنے والوں تک محدود کی گئیں، وہاں دوسری طرف ہندی کے تعلیم یافتہ افراد پر کڑے منفی اثرات پڑے۔ اس سیاسی تضاد اور تنازعے کا پہلی مرتبہ ۱۸۶۸ء میں اظہار کیا گیا جب بابو شو پرساد نے ہندی کی قدامت پر زور دیتے ہوئے اس زبان کی ہندوستان سے وابستگی قرار دی۔ اس کے برخلاف اردو کا فارسی اور عربی جیسی غیر زبانوں سے گہرا تعلق ہے اور اس کے علاوہ اسلام سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ لہٰذا بقول ان کے اردو کے سرکاری دفاتر میں استعمال کرنے سے اسلام کا اثر ڈالا جاتا ہے اور" ہندو قوم کو تباہ کر دیا جاتا ہے۵۔"

اس تنازعے کے نتیجے میں دونوں زبانیں اسلام یا ہندومت کے ساتھ منسوب ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ اگلی دہائیوں تک مذہب سے بڑھ کر قومیت سے بھی اس حد تک منسلک ہوگئیں کہ اردو کے تحفظ کی ضرورت محسوس ہونے لگی، جس کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو جیسی تنظیمات قائم کی گئیں جو خصوصاً اردو کی سرکاری حیثیت کے تحفظ کے لیے قائم ہوئی۔ علاوہ ازیں دو قومی نظریہ مقبول سے مقبول تر ہوتا جا رہا تھا۔ جب تا حال مسلمان خود کو ایک الگ قوم نہیں سمجھتے تھے، تو اب مذہب قومیت کی شناخت کے طور پر رائج ہونے لگا۔ مسلمان ہندوؤں سے

ہر لحاظ سے الگ قوم سمجھے جانے لگے جن کے رسم و رواج بھی الگ اور زبان، یعنی اردو بھی الگ ہے۔ نتیجتاً ہندی نہ صرف انڈیا (ہندوستان) سے بلکہ ہندومت سے بھی وابستہ سمجھی جانے لگی، جب کہ اردو اسلام اور پاکستان کی علامت بننے لگی لہٰذا اردو اسلام اور مسلمانوں کے لیے الگ ملک (پاکستان) کا علمبردار بن گئی[6]۔

اگرچہ عربی کے برخلاف اردو مقدس زبان ہونے کا کوئی جائز دعویٰ نہیں کر سکتی تھی پھر بھی ہندی اور اردو کے دوگانہ اور متضاد تعلق کی جو شناختیں ان زبانوں سے جوڑی گئیں ان کے ذریعے اردو کو جنوب ایشیائی اسلام کی مرکزی علامت کی حیثیت حاصل ہوئی چوں کہ پاکستان کے مطالبے نے دوسری وجوہات کے علاوہ اس لسانی تنازعے کی بنیاد پر زور پکڑا اور چوں کہ اس مطالبے کے زیادہ تر حامی اس علاقے سے تعلق رکھتے تھے جہاں اردو بطور مادری زبان بولی جاتی تھی، اس لیے پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہونا فطری سی بات سمجھی جانے لگی، جب پاکستانی قوم کی شناخت اولیں طور پر مذہبی شناخت کی بنیاد پر قائم تھی جس کی علمبردار اردو ہی تھی[7]۔

لہٰذا اردو قبل از تقسیم کے زمانے سے ہی تہذیب و تعلیم کی زبان کے طور پر جانی جاتی تھی اور خاص کر کے شہروں میں رائج تھی۔ کیوں کہ اس زمانے میں فارسی ابھی اعلیٰ طبقے کی پہچان تھی اور فارسی آمیز اردو اس طبقے کی تہذیب سے روابط قائم کرنے کا ایک طریقہ تھی۔ فارسی الفاظ کا تصرف بلاغت و فصاحت اور زبان کی نفاست کی علامت تھی۔ ہندی اردو تنازعے کے سلسلے میں جو لسانی تقسیم ہوئی اس سے اردو کا شہری ماحول کے ساتھ رابطہ اور بھی گہرا ہوتا چلا گیا، جب کہ ہندی ارادتاً دیہاتی زبان کے طور پر گردانی گئی، کیوں کہ ہندو قوم پرستی میں دیہات خالص ہندوستانی تہذیب و تمدن کی پناہ گاہ مانی جانے لگی جہاں غیر قوموں کے اثرات کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ دوسری طرف اردو جس میں بے شمار فارسی، عربی اور ترکی ماخوذ الفاظ ہیں اس بیانیے میں ایک غیر زبان مانی جانے لگی[8]۔

تقسیمِ ہند کے بعد سے اردو کا بالخصوص پاکستان میں شہری ماحول سے رابطہ اور بھی گہرا ہوا، کیوں کہ پاکستان کی سرزمین میں اردو بطور مادری زبان کہیں رائج نہیں تھی۔ پاکستان میں اردو بولنے والے صرف مہاجر تھے جو انڈیا کے ان علاقوں سے تعلق رکھتے تھے جہاں اردو رائج تھی۔ چوں کہ وہ مہاجر زیادہ تر پاکستان کے بڑے شہروں، خصوصاً کراچی، حیدرآباد اور کسی حد تک لاہور میں مقیم ہوئے، اس لیے اردو پاکستان میں واقعی صرف اور صرف شہروں تک محدود رہی۔ انڈیا کے اردو بولنے والے دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ جیسے علاقوں کی متنوع مقامی بولیاں تقسیم کے بعد سے پاکستان کے چند شہروں تک محدود رہیں، جب کہ انڈیا میں اردو کی پذیرائی ہندی کے مقابلے میں قدرے کم ہوئی جہاں قبل از تقسیم ہندوستان کے اردو بولنے والے مختلف علاقوں میں مقیم اور لسانی

وسعت کے حامل تھے، وہاں اب پاکستان آ کر وہ سمٹ کر چند ایک شہروں میں ہی یکجا ہوئے۔ دوسری طرف پاکستان کے دیہاتی علاقوں میں مقامی زبانوں کی شرح میں قدرے کم تغیر رونما ہوا۔ یہ صورت حال ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پاکستانی اردو ادب میں مقامیت یا مقامی خصوصیات کی عکاسی نسبتاً کم اہمیت کی حامل اس لیے ہے کہ اکثر اردو بولنے والے شہری ماحول سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ چوں کہ اردو کو ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے نہ صرف مادری زبان بولنے والے اس میں ادب پارے لکھتے ہیں، بلکہ وہ لوگ بھی اس میں لکھتے ہیں جو اردو ثانوی زبان کے طور پر بولتے ہیں۔ خاص طور پر پنجاب میں عرصے سے اردو ادبی زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ لہٰذا بے شمار پنجابی بولنے والے ادیب موجود ہیں جو اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔ ان میں سے چند ایسے بھی ہیں جو دیہاتی زندگی کا موضوع اپنا چکے ہیں۔ یہ روایت قبل از تقسیم کے ادیب جیسے بلونت سنگھ یا راجندر سنگھ بیدی اور حالیہ قلم کاروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

بولی اور مقامی رابطہ

یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ چوں کہ پاکستان میں اردو بولنے والے چند جگہوں پر یکجا ہوئے، اس لیے خاص طور پر اردو بولنے والے نوجوانوں میں ایک معیاری زبان رائج ہوتی گئی۔ پاکستان میں پہنچنے والی پہلی نسل نے اپنی مقامی بولی مورفالجی [9] اور سنٹیکس [10] کے لحاظ سے برقرار رکھی۔ البتہ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آنے والی نسلیں ایک معیاری اردو کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ جدی بولی کی چند ہی خصوصیات ان کی زبان میں قائم رہیں گی اور وہ زیادہ تر چند مقامی الفاظ ہوں گے کیوں کہ انڈیا کا وسیع اور کثیر اللسانی ماحول پاکستان میں سمٹنے پر مجبور ہوا جس کے نتیجے میں وہ رفتہ رفتہ مٹ جاتا ہے۔ جب مختلف بولیاں ایک جگہ جمع ہوں تو وہ آہستہ آہستہ متروک ہوں گی اور ان کی جگہ ایک معیاری زبان رائج ہوتی جائے گی جو سب کے لیے عام فہم ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس معاملے پر حسب ضرورت بحث نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس موضوع پر تاحال معقول حد تک تحقیقات نہیں ہوئیں۔ یہاں مصنف محض ذاتی تجربے پر اکتفا کر سکتا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مذکورہ بالا بیان کے مطابق پاکستانی اردو بولنے والوں میں ایک معیاری زبان رائج ہوتی جا رہی ہے۔ جدی بولی زیادہ سے زیادہ الفاظ کی حد تک قائم رہتی ہے، جب کہ عمر یافتہ متکلمین میں مورفالجی اور سنٹیکس کی خصوصیات نسبتاً زیادہ نمایاں ملتی ہیں۔ اس مشاہدے میں جنس کے اعتبار سے بھی تفریق کی ضرورت ہے۔ عمر یافتہ متکلمین کے درمیان مورفالجی اور سنٹیکس کی خصوصیات مردوں میں نسبتاً کم اور خواتین میں زیادہ ملتی ہیں۔ اس سے شاید یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ معیاری اردو سے مختلف بولیاں بے قدری کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ چناں چہ بولیاں خاص طور پر خواتین سے منسوب کی جاتی تھیں جو اس زمانے میں اکثر کم یا غیر تعلیم یافتہ ہی تھیں۔ یہ ملحوظ کیا جائے تو اردو اولیں طور پر

ایک شہری زبان تھی جس کی معیاری قسم تعلیم اور تہذیب کا ذریعہ رہا، تاہم اس کی مختلف بولیاں اردو کے زمرے سے نکال کر ہندی کے دائرے میں شمار کی جاتی تھیں۔

اس مفروضے کی تصدیق معاصر (پاکستانی) اردو ادب میں ملتی ہے۔ پاکستانی اردو ادب میں بولیوں کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔ اگر اردو ادب میں مکالموں میں مقامی وابستگی کی عکاسی کی جاتی ہے تو ادیبوں کے پاس مختلف حربے ہوتے ہیں۔ اول طریقہ خاص الفاظ کا تصرف ہے جو اردو کے لسانی دائرے کا حصہ ہیں لیکن کسی خاص علاقے سے منسوب کیے جاتے ہیں جو دوسرا طریقہ پاکستانی ادب میں کثرت سے کارآمد ہوتا ہے، وہ غیر مادری زبان کے لہجے ہیں جن سے متکلم کا کسی علاقے سے تعلق واضح ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے پشتو بولنے والے کے لہجے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں اور اس کا تصرف نستعلیق رسم الخط میں آسانی سے ممکن بھی ہے۔" ھ" کی آواز متن سے نکالی جاتی ہے اور اکثر مذکر اور مونث کی بھی غلطیاں ملتی ہیں۔ علاوہ بریں واحد متکلم کی جمع (ہم) اور فعل واحد میں بھی اکثر استعمال ہوتا ہے، جیسے کہ" ہم۔۔۔جاتا ہے" ۔اس طریقے کی ایک اچھی مثال ہمیں اسد محمد خان کی کہانی "ایک بے خوف آدمی کے بارے میں" میں ملتی ہے جو شاید کہانی کم اور ان کے مجموعے کا دیباچہ زیادہ ہے۔ یہ ایک پشتون کردار کی کہانی ہے جسے کراچی میں بس کر اردو ادب کا شوق ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر وہ اردو کی ایک کتاب بھی قلم بند کرتا ہے۔ خان کے مجموعے کی اشاعت کے موقعے پر پشتون مندرجہ ذیل الفاظ میں مبارک باد دیتا ہے" : خان صیب۔ دوست کا کتاب چھپے تو لگتا ہے جیسے دوست کے باڑے میں میٹھے پانی کا چشمہ نکل آیا ہے۔!!"

اس مثال میں ہمیں وہ متعصبانہ لہجہ نہیں ملتا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے جیسے ھ کی آواز کا حذف۔ چوں کہ یہ کردار کہانی میں کافی تعلیم یافتہ دکھایا گیا، اس لیے اس کا مذاق اڑانا مصنف کا مقصود نہیں مگر پھر بھی چند ایسی خصوصیات ملتی ہیں جن سے اس کے پشتو لہجے کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں صاحب کے بجائے صیب کا تلفظ اور کتاب کو مذکر بنانے کی غلطی شامل ہے۔ باڑے کا تلفظ بھی قابل ذکر ہے۔ اور اس کو" پر، کے اوپر" کے مطلب میں استعمال کرنا بھی معنی خیز ہے۔ ان چند تلفظ کی خصوصیات اور قواعد کی غلطیوں سے اس کے کلام میں خاصا مقامی رنگ آجاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر پشتون کردار رحمان بابا کا ایک پشتو شعر بھی سناتا ہے جس کا اسد محمد خان بہر حال ترجمہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

علاقائی رنگ و بو لگانے کا ایک اور طریقہ پنجابی کا تصرف ہے اور پشتو کے برخلاف اکثر پنجابی کا ترجمہ کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس طریقے کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ سب سے مقبول طریقہ پنجابی لوک گیت کا استعمال ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں اور یہ اردو ادب میں عرصے سے عام ہے۔ راجندر

سنگھ بیدی مثال کے طور پر اپنے ناول "ایک چادر میلی سی" باقاعدگی سے پنجابی لوک گیت شامل کرتے ہیں، جیسے کہ:

کوٹھے اتے گنا، ویر میرا لماں
بھابو میری پتلی، جھدے نک مچھلی

بیدی نے ان گیتوں کا ترجمہ کرنا ضروری نہیں سمجھا، جب کہ دوسرے مصنفین کبھی کبھی اردو کا ترجمہ دیتے ہیں [۱۳]۔

بعض ادب پاروں میں پنجابی الفاظ بیچ میں استعمال ہوتے ہیں، مثال کے طور پر بانو قدسیہ اپنے ناول "راجہ گدھ" میں پنجابی لفظ "اینویں" کا کثیر استعمال کرتی ہیں جس سے مکالموں میں جو اس لفظ کے علاوہ خالص اور معیاری اردو میں ہیں، لاہور اور اس کی زبان کا خاص رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف منظر کی وضاحت سے بلکہ لسانی بنیاد پر بھی لاہور قاری کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتا ہے [۱۴]۔

گزشتہ چند سالوں سے مکالموں میں بھی پنجابی کا استعمال رائج ہوتا جا رہا ہے۔ اس نشو و نما کا ایک معروف نمائندہ بلاشبہ مستنصر حسین تارڑ ہیں۔ ان کے ناول "خس و خاشاک زمانے" دیہاتی پنجاب کی تہذیب اور رسم و رواج کی ۱۹۳۰ء سے لے کر معاصر زمانے تک ایک کہانی ہے۔ اس ناول میں مصنف جگہ جگہ پنجابی لہجہ شامل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ناموں کے ساتھ "ے" کی آواز لگاتے ہیں، جیسے کہ "نور بیگے"، جب کہ مکالے کا باقی حصہ اردو میں ہی ہے۔ دوسری طرف مکالموں کے شروع میں اکثر کلیدی الفاظ جیسے پتر ملتے ہیں جن سے مقامی رنگ و بو پیدا ہوتا ہے، حالانکہ باقی کلام معیاری اردو میں ہے۔ "خس و خاشاک زمانے" میں چند ہی ایسے مکالے ملتے ہیں جن میں پورے پورے جملے پنجابی میں ہیں، جیسے "اوئے کون اے کڑی یا ہوا۔۔۔ [۱۵]"۔

سمیع آہوجا بھی اپنی کہانیوں میں کافی پنجابی کام میں لاتے ہیں۔ اپنے مجموعے "رونمائی میں ضم ہونے کا مجرم" میں وہ اندرونِ لاہور کی منظر کشی کرتے ہوئے اس ماحول کو اپنے زبان کے استعمال سے بھی زندہ بنا لیتے ہیں۔ وہ نہ صرف مجموعے کے پہلے چند اوراق میں پنجابی شعرا کے اقتباس دیتے ہیں بلکہ اپنی کہانیوں میں بھی مقامی فضا کو [۱۵] لسانی طرائق سے قاری کے سامنے لاتے ہیں، مثلاً:

"بس ایتھے ہی مینوں ساڑو۔۔۔
بس ایتھے ہی بناو میری مڑی۔۔۔ [۱۶]"

اس سے بڑھ کر آہوجا کو پنجابی کی مختلف بولیاں استعمال کرنے سے بھی کوئی جھجھک نہیں محسوس

ہوتی۔اس سے اور بھی مخصوص علاقے کا احساس ملتا ہے۔بہر حال ان کی زیادہ تر کہانیوں میں پھر بھی لاہور کی پنجابی سنائی دیتی ہے چوں کہ یہ ادیب محض پنجابی قاری کے لیے نہیں لکھتے، اس لیے وہ شاید پاکستان میں پنجابی (کم از کم ایک حد تک) ایک عام فہم زبان فرض کرتے ہوں۔اس مفروضے سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں اردو اور پنجابی کی لسانی حدود کی تفریق کمزور ہوتی جا رہی ہے۔پنجابی اور اردو ایک مشترکہ لسانی دائرے میں ضم ہو رہی ہیں جس میں ایک دوسری کی حد بندی کرنا مشکل یا ناممکن ہو رہا ہے۔ادب پاروں میں اردو محض معیاری زبان تک محدود رہتی ہے، جب کہ پنجابی اور اس کی مختلف بولیاں علاقائی رنگ لگانے کے ذریعے ہیں۔

انتظار حسین کا ناول" آگے سمندر ہے "

مذکورہ بالا مشاہدے کے مختلف پہلو انتظار حسین کے ناول" آگے سمندر ہے" میں بھی نمایاں ہیں۔یہ ناول تقسیمِ ہند کے زمانے میں دیہاتی علاقے سے کراچی کی ہجرت کی کہانی ہے۔دوسری طرف اس میں مہاجروں کی نئی شناخت کے آغاز کی تصویر ملتی ہے۔یہ ناول مختلف علاقوں کے اردو بولنے والوں کے یکجا ہونے کی بھی منظر کشی کرتا ہے۔پہلی نظر میں" آگے سمندر ہے" تقسیمِ ہند کی کہانی ہے۔

تقسیم کے موضوع پر ابتدا میں لکھی گئی کہانیاں جو چند ہی مہینے بعد قلمبند ہوئیں، تقسیم کے ظلم و تشدد دکھانے پر مبنی تھیں، جیسے کہ منٹو، بیدی یا کرشن چندر وغیرہ کے مشہور افسانوں میں مگر قاری جلد فسادات کے ادب کی یکسانیت سے اکتا گئے تھے۔اس صنفِ ادب کی زیادہ تر کہانیاں کسی دہشت خیز، چونکانے والے واقعے پر مختص تھیں جو قاری کو تقسیم کی بے ثمری آنکھوں کے سامنے لا کر اسے جگانا چاہتی تھیں۔بعد ازیں ادب کا دامن پھر وسیع ہو گیا لیکن پھر بھی تا حال تقسیم کا موضوع اردو ادب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس موضوع پر نقطۂ نظر خاصا بدل گیا ہے اور پہلے ادب پاروں کے مقابلے میں تقسیم کا ظلم و تشدد منظر سے غائب ہوتا گیا۔پہلی کہانیوں کے بعد آنے والے مصنفین جیسے انتظار حسین تقسیم کے طویل المعیاد آثار کی طرف متوجہ ہونے لگے۔انتظار حسین کے ناول اور کہانیوں کا کلیدی موضوع تہذیبی اکھاڑ پن، بیخ کنی اور کرداروں کا شناختی بحران ہے جو انتظار صاحب کی تصانیف میں کسک کے(؟) کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔اس کسک کے سلسلے میں انتظار کے کردار کی اکھنڈ ہندوستان کی زندگی کی یاد میں ایک طرح کا تضاد پیدا ہوتا ہے کیوں کہ وہ اب کسی الگ ملک کی سر زمین میں واقع ہے اور وہ ملک ان کا اپنا نہیں رہا۔اس ہجرت کے تجربے سے ان کے کردار کشمکش کے احساس میں مبتلا ہوتے ہیں جو انھیں پاکستانی اور اکھنڈ ہندوستانی شناخت کے درمیان کشش و پنج میں ڈال دیتا ہے۔

مگر انتظار صاحب کے ناول" آگے سمندر ہے" میں صرف تقسیم کی کہانی نہیں ہے بلکہ کراچی کی بھی ہے۔ناول کا زیادہ تر حصہ کراچی میں واقع ہوتا ہے۔علاوہ بریں مرکزی کردار، جواد ایک بار ہندوستان سفر کرتا ہے

اور گا ہے گا ہے اکھنڈ ہندوستان میں اپنا بچپن یاد کرتا ہے۔ ناول کی کہانی تین زمانی اور مکانی حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلی زمانی تہہ قبل از تقسیم کے زمانے کے اکھنڈ ہندوستان کی یادیں ہیں، دوسری تہہ تقسیم کے فوراً بعد کا زمانہ ہے جب جواد نیا نیا کراچی پہنچا تھا اور تیسری تہہ معاصر یعنی تقریباً ۹۰ ویں دہائی کا کراچی ہے۔

ناول کا آغاز جواد کی ایک اندرونی خود کلامی سے ہوتا ہے جس میں درختوں کے اکھاڑنے کا رمزیہ ذکر ہوتا ہے جب خود کلامی کی رو میں جواد کا ساتھی مجو بار بار دخل اندازی کرتا ہے تو آخر جواد کراچی میں پہنچنے کا زمانہ یاد کرنے لگتا ہے۔ یادوں کے اس ٹوٹے تسلسل سے جواد بار بار ماضی سے حال میں واپس آتا ہے۔ اس تخلل سے زمانی تہوں کے ملنے کھلنے کی طرف نشان دہی ہوتی ہے۔ یادوں کی بے ثباتی اور بے اعتمادی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ یادیں جامد نہیں ہوتیں، بلکہ ہمیشہ حال سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں اور حال کے بدلتے پہلوؤں سے بھی تغیر کی شکار ہوتی ہیں۔ یہ ان کھلتی ملتی زمانی تہوں کی پیداوار ہے جس میں حال کے بدلتے ہوئے پہلو یا حال کا پرتو ماضی پر تھوپا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ماضی اور اس کی یاد ہمیشہ حال کے بدلتے پہلو اور ماضی کو حال کی نظر سے تخیل کرنے پر مبنی ہوتی ہے۔ ماضی بحال نہیں کیا جا سکتا اور یاد کرنے کا مطلب بھی صرف ماضی پر حال کی نظر ڈالنا ہے۔ یادوں کے ذریعے سے ماضی کو تازہ کیا جا سکتا ہے، مگر اس فعل میں ہمیشہ حال کا کسک زدہ نقطۂ نظر موثر ہوتا ہے۔

آخر کار جواد کا دن کا خواب تقسیمِ ہند کے فوراً بعد کے زمانے کی یاد میں تبدیل ہوتا ہے اور جواد اس شہر میں اپنی جگہ تلاش کرنے کی جدوجہد یاد کرنے لگتا ہے۔ جواد مجو کے ساتھ کافی ہاوسز کی سیریں اور دوسرے مہاجروں کی بیٹھکوں میں لمبی چوڑی گفتگوئیں ذہن میں لاتا ہے۔ کافی ہاوس کی تصویر ایسی جگہ کی کھینچی جاتی ہے جہاں نئے پہنچے ہوئے مہاجر تقسیم کے تشدد، ملازمت ڈھونڈھنے کی فکر، رہائش تلاش کرنے کی پریشانی اور انڈیا میں چھوڑے ہوئے رشتہ داروں کی فکرمندی بھول سکتے ہیں۔ اگرچہ جواد کی مہاجروں کے اس نئے شناختی گروہ میں شامل ہونے کی زیادہ طبیعت نہیں چاہتی، پھر بھی وہ مجو کے اصرار پر زبردستی مشاعروں اور ملاقاتوں میں اس کا ہم سفر بن جاتا ہے۔ دوسرے مہاجروں سے ملاقات کی گفتگو سے قاری کو اس نئی شناختی گروہ کی ترکیب کا اچھا تاثر ملتا ہے۔ مکالموں کے دوران انتظار حسین یہ ظاہر ہونے دیتے ہیں کہ اس شناختی گروہ کا پہلے پہل کوئی وجود نہیں تھا۔ تقسیم سے پہلے مختلف علاقوں کے اردو بولے والے مہاجر کی شناخت سے یکجہتی محسوس نہیں کرتے تھے۔ مہاجروں کی شناخت ہجرت کے بعد پاکستان میں ہی وجود میں آئی، اور وہ بھی رفتہ رفتہ ہی۔ انتظار حسین اس نئی شناخت کی دراڑیں اور ابتدائی مرحلے کی اندرونی دراڑ پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چناں چہ اس ناول کے مہاجر کردار خود کو مہاجر نہیں سمجھتے، بلکہ ان کی پہچان ان کے آبائی مقاموں سے جڑی ہوئی ہے۔

اس ناول کے تمام مہاجر کردار اپنے ترک کیے ہوئے گھروں کو کسک کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ باوجودیکہ ان میں سے کسی ایک کا اس جگہ لوٹنے یا کم از کم ادھر سفر کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ان کی کسک محض یاد کی حد تک محدود رہتی ہے جب کہ اس یاد کو حال میں واپس لانے کی کوئی خواہش نہیں۔ان کی یاد خالی تخیل رہتی ہے۔اس سے بڑھ کر وہ آپس کی مقامی دشمنیاں پاکستان میں بھی برقرار رکھتے ہیں، جس سے یہ مہاجر شناخت اندرونی خلا کی شکار ہوتی ہے۔مثال کے طور پر جا بجا مغرور لکھنویوں کی شکایت ملتی ہے۔ہر مقامی برادری اپنے خصوصی کھانوں پر فخر کرتی ہے جس کا ذائقہ وہ پاکستان آکر دوبارہ چکھ نہیں پائے۔علاوہ بریں مہاجروں کے لسانی فرق پر بھی زور دیا جاتا ہے جس کی عکاسی ہمیں ان کے کلام میں بھی ملتی ہے۔چناں چہ لکھنو سے تعلق رکھنے والا سید آقا حسن نفیس اردو میں کلام کرتا ہے " : بھائی مجید الحسینی، آپ نے بجا ارشاد کیا۔یہ آشوب تو ملک گیر ہے ۱۹۔" دوسری طرف ان کی بیگم، بشو بھابھی سہل اور سادہ اردو بولتی ہے " :اے بھین مجو بھائی، اس نگوڑے نگر میں تو ٹکی پڑ گئی ۲۰۔" مذکورہ بالا مشاہدات یاد کریں تو یہ دو اقتباس معنی خیز اور قابل غور ہیں۔اول مقامی رنگ کا احساس ملتا ہے۔مگر یہ سنٹیکس اور مورفالجی پر مبنی نہیں۔توقعات کے برخلاف ہمیں اودھی کی ذرا سی جھلک نہیں ملتی جس کا قاری شاید متوقع تھا۔اس کی جگہ دونوں قواعد کے لحاظ سے معیاری اردو بولتے ہیں۔مقامی رنگ محض الفاظ کے انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے۔سید آقا حسن تقریباً شاعرانہ زبان استعمال کرتا ہے، جب کہ اس کی بیگم، بشو بھابھی، بیگماتی زبان کے چند خصوصی الفاظ استعمال کرتی ہے، جیسے"نگوڑا"۔بہرحال اگر قاری ان کے آبائی پس منظر سے ناواقف ہوتا تو ان کی زبان سے ان کی جائے اصل کا اندازہ لگانا ناممکن ہو جاتا۔ان کی زبان میں کوئی ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی جو کسی ایک علاقے سے منسوب ہوتی۔دوسری طرف بشو بھابھی کی زبان میں فارسی الفاظ کا عدم استعمال بھی قابل غور ہے۔اس اقتباس میں ایک بھی فارسی یا عربی لفظ نہیں۔اس کے بجائے وہ "نگر" جیسا لفظ چنتی ہے جب کہ اردو میں شہر قدرے زیادہ عام ہے۔اگرچہ"نگر" متروک لفظ تو نہیں کہا جا سکتا اور اردو میں بلا شبہ سمجھا بھی جاتا ہے، پھر بھی اس کو آج کل کی نظر سے ہندی سے زیادہ منسوب کیا جائے گا۔اس اعتبار سے ابتدائی مشاہدہ درست لگتا ہے کہ عرصے سے اردو زیادہ معیاری زبان رہ چکی ہے کیوں کہ یہ تعلیم و تہذیب کی زبان رہی تاہم دوسری طرف خواتین کی زبان شاید ہندی سے زیادہ مماثل سمجھی جاتی تھی کیوں کہ وہ اکثر کم تعلیم یافتہ تھیں۔

مہاجروں کی اندرونی دراڑ پر زور دیتے ہوئے انتظار حسین شاید عام روایت سے ہٹ کر کراچی کے متشدد فسادات کا مخالف بیانیہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔آٹھویں دہائی سے لے کر کراچی میں بار بار فسادات ہوئے جو عام طور پر صرف نسل پرستی تک محدود دیکھے جاتے ہیں۔کراچی کے کثیر النسل شہر میں جہاں پاکستان کی ساری بڑی

نسلیں بستی ہیں۔ انتظار حسین ایک الگ بیانیے پر زور دینے کی کوشش کرتے ہیں جس میں مہاجروں کی شناخت اس وقت شاید اتنی مضبوط تھی ہی نہیں۔ عام بیانیہ شاید صرف بعد کے نقطۂ نظر کی تدلیل ہے جب متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) مہاجروں کی نمائندگی کا دعوی کرتے ہوئے اس شناخت کی یکجہتی پر زور دیتی تھی۔

اس مختصر ضمیمے سے" آگے سمندر ہے " کے موضوع پر واپس آئیں تو جواد نہ صرف اس اعتبار سے غیر معمولی مہاجر ہے کہ وہ اس شناخت سے گہری وابستگی سے جھجکتا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اس کا انڈیا سے متضاد لگاؤ اور علاقہ صرف کسک تک محدود نہیں رہتا جیسے کہ باقی مہاجر کرداروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے برخلاف جواد آخر کار انڈیا جا کر اپنے چند رشتہ داروں سے ملنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس طور پر وہ علیحدہ زمانی تہوں کو نہ صرف یادوں میں یکجا ہونے کی اجازت دیتا ہے بلکہ یاد اور حقیقت کو ملنے کی بھی۔ مگر انڈیا میں وہ ان زمانی تہوں کو ہم آہنگ کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

جب جواد کو پہلے پہل حیرت ہوتی ہے کہ کچھ بدلا ہی نہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان زمانی تہوں کو ہم آہنگ کرنے کا متوقع تھا" :ایک دفعہ پھر میں نے سٹیشن کے قریب و دور کا جائزہ لیا۔ دور پھیلی ہوئی پٹریوں سے لے کر ٹین کے سائبان تک ایک ایک تفصیل کا پھر سے جائزہ لیا۔ شہتیروں پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کو دیکھا" یار شنکر، کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے[21]"۔

جواد کو جلد سیکھنا پڑتا ہے کہ یہ سب دغا ہے۔ زمانی تہیں اس کی یادوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں اور اس کی یادیں حقیقت سے مطابقت نہیں کھاتیں۔ اس کے باوجود اسے وہاں ایک تکمیل کا احساس ہوتا ہے، حالانکہ وہ اس احساس کو شعوری طور پر سمجھنے سے قاصر لگتا ہے۔ اس کی یادیں حالاں کہ بحال تو نہیں ہوتیں، مگر پھر بھی ان میں نئی جان ڈلتی ہے۔ اس سے بڑھ کر جواد کی شناخت اور شخصیت کو بھی تکمیل ملتی ہے ،جب اسے اپنے بچپن کے نام،منن، سے پکارا جاتا ہے اور اسی شخص کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ جب سے جواد نے پاکستان کی ہجرت کی تب سے نہ صرف یہ نام، بلکہ اس سے وابستہ شخصیت بھی گم ہوگئی ہے۔ صرف یہاں، اپنی جائے اصل میں منن اور جواد کی دو علیحدہ شخصیات گھل مل کر مکمل ہو سکتی ہیں۔ جواد وہ اکھاڑا ہوا درخت ہے جو اپنی اصل کو لوٹتا ہے۔ درخت کا یہ تصور جو وابستگی کا آدرش اور مثالیہ ہے اور جس کا ناول کے شروع میں ذکر ہوا ہے، جواد کو اپنے پرانے گھر کے نزدیک درخت دیکھ کر ذہن میں آتا ہے۔ یہ استعارہ سب مہاجروں کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے جو بیخ کنی کے شکار ہو کر اپنی مٹی سے اکھاڑے ہوئے کسی غیر زمین میں دوبارہ لگائے گئے ہیں۔ مگر جہاں اس ناول کے باقی مہاجر کردار محض کسک میں مبتلا رہتے ہیں وہاں جواد اس کسک سے نکل کر عمل کرنے لگتا ہے اور اپنی یادوں اور حقیقت کے تضاد سے مایوس ہوتا ہے۔ البتہ اس کی علیحدہ شخصیات پہلی بار یکجا

ہو جاتی ہیں ۔ بالفاظ دیگر درخت اپنی مٹی لوٹ آتا ہے ۔

کراچی کی واپسی کے بعد جواد کو دوبارہ فراموشی کا سا احساس ہو جاتا ہے ۔ظاہراً اس کی بچپن کی شناخت، منن، پھر انڈیا میں رہ جاتی ہے ۔اس کے علاوہ جواد کو کراچی میں قدرے تغیر محسوس ہوتا ہے ۔اگر چہ اس تبدیلی کی اس کے سفر سے قبل بھی آہٹ سنائی دیتی تھی، پھر بھی وہ جواد کو اب سے ہی شعوری طور پر محسوس ہونے لگی ۔شہر میں تشدد دن کا معمول ہونے لگا اور لوگ باہر نکلنے سے بھی ڈرنے لگے ۔مگر اس کے باوجود کسی کے لیے بھی کراچی چھوڑنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔سب اس پر متفق معلوم ہوتے ہیں کہ کراچی چھوڑنا کوئی حل نہیں، کیوں کہ پاکستان میں تو پھر بھی رہنا ہوگا ہی ۔اس تدلیل پر قاری ذرا حیران ہوتا ہے کیوں کہ جس تشدد کا شکار کراچی ۸۰ویں دہائی سے بار بار ہوا، وہ کراچی تک ہی محدود رہا۔اس سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ شاید فسادات اصل مسئلہ نہ ہوں، بلکہ عدم اطمینانی کا سبب دراصل مہاجر کرداروں کی پاکستان میں بیخ کنی کا احساس ہے ۔اس ماحول میں کہانی میں پہلی بار کراچی کا منظر زیادہ واضح ہوتا ہے، بلکہ کراچی کہانی کا ایک الگ کردار بھی معلوم ہوتا ہے، جب گلیوں کی تنگی ایک جال سے ملائی جاتی ہے " :مگر وہ ایک گلی تھوڑا ہی تھی ۔گلیوں کا ایک پورا جال تھا۔ویسے یہ احساس بھی مجھے اس وقت ہوا تھا، ورنہ ہمیشہ میں نے رفیق صاحب کے گھر کو ایسے تصور کیا تھا کہ مین روڈ پر پڑے پٹرول پمپ کے سامنے جا کر دائیں کو مڑیں گے، پھر ایک موڑ چھوڑ کر دوسرے موڑ پر بائیں کو مڑ جائیں گے ۔اس کے بعد پھر بائیں کو اور تھوڑا چل کر دائیں کو ۔لیجیے رفیق صاحب کا گھر ۔مگر اس وقت یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ چند گلیاں نہیں، گلیوں کا ایک پورا جال ہے ۔اور جیسے گاڑی جال کے اندر پھنس گئی ہو اور ایک گلی سے دوسری میں، دوسری سے تیسری میں، پھر گلی اور پھر گلی ۲۳"۔

اس تصویر میں قاری کو شہر کے ماحول کا احساس ملتا ہے، جب کہ کہانی کے باقی حصے میں کراچی محض کسی ناٹک کا کھوکھلا منظر لگتا ہے ۔ناول میں اگر جگہ جگہ کراچی کا نام نہ آتا تو مصنف کی منظر کشی سے کہانی کسی بھی جنوب ایشیائی شہر میں واقع ہو سکتی تھی ۔اس سے مصنف کی تنقید مقصود ہر گز نہیں ہے ۔کہانیوں کی مختلف اقسام میں تمیز کرنی چاہیے ۔جہاں ایک قسم کی کہانیاں واقعات اور اپنے کرداروں سے زندہ ہوتی ہے وہاں دوسری قسم کی کہانیاں کسی مخصوص شہر یا علاقے کی جان دار عکاسی سے ۔ظاہر ہے" آگے سمندر ہے " اول الذکر کے زمرے میں آتا ہے اور کہانی اور کردار کی توضیح پر مبنی ہے ۔

اختتام

" آگے سمندر ہے " میں شہر اور دیہات یا قصبات کا دوگانہ تعلق صرف مہاجر کرداروں کی بیخ کنی، ان کا اکھاڑ پن اور جواد کا شناختی بحران واضح کرنے کے حربے کے طور پر کارآمد ہوتا ہے، تاہم نہ شہر نہ دیہات کا

ماحول بذاتِ خود کہانی کا مرکز ہے۔ ناول میں دونوں کی زیادہ تفصیل سے منظرکشی کی مثالیں شاذ و نادر ملتی ہیں، نہ ہی ان کی خصوصیات کا ذکر ملتا ہے۔ اگر سیاق و سباق کی تفصیلات نہ دی جاتیں تو کہانی کسی بھی جگہ واقع ہو سکتی تھی۔ اس طور پر جواد کے دیہاتی یا قصباتی آبائی پس منظر کے متعلق محض سطحی معلومات دی جاتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پس منظر صرف اس لیے چنا گیا تاکہ درخت کٹ جانا بیخ کنی کے استعارے کے طور پر کارآمد ہو سکے۔ دوسری طرف کراچی کا مظہر بھی بے جان رہتا ہے اور قاری کو اس شہر کی فضا اور مزاج کا کم کم تاثر ملتا ہے۔ چند ہی گنے چنے منظر ایسے ہیں جن میں کراچی محض کہانی کے پس منظر سے نکل کر کہانی کے الگ کردار کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ باوجود یکہ اس منظرکشی سے کراچی کی خصوصیات اور اس کی فضا قاری تک منتقل نہیں ہو پاتی اور اگر کراچی کا ذکر نہ آتا تو یہ منظر شاید پہچانا نہ جاتا۔ بالفاظِ دیگر اس ناول کے زیادہ تر مناظر ماحول کے بیان کے اعتبار سے کسی بھی جگہ واقع ہو سکتے تھے۔ کراچی محض کھوکھلا پس منظر رہتا ہے جس سے تاریخی سیاق و سباق پیدا کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں البتہ کراچی کہانی کے حاشیے میں پوشیدہ رہتا ہے۔

یہ ناول کہانی اور مہاجر شناخت کی عکاسی پر مرکوز رہتا ہے۔ اس شناخت کی اندرونی دراڑ پر زور دیتا ہے جو اس وقت اولیں طور پر خارجی تسمیہ ہی تھا جس کا اندرونی حالات سے کوئی اتفاق نہیں تھا اور مہاجر کرداروں کی اپنی شناخت ان کے آبائی تعلق کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ چناں چہ سابقہ رقابتیں جو مختلف ہندوستانی شہروں کے درمیان رہی ہوں، اب پاکستان منتقل ہو جاتی ہیں اور ان پر اور بھی زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے ایک مشترکہ شناخت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یکجہتی کے بجائے مقامی شناختیں باہمی رقابتوں پر مبنی ہیں۔ مگر اس سب کے باوجود مہاجر کردار ایک ہی شہر میں رہنے پر مجبور ہیں۔

اس سے وابستہ اس مضمون کا ابتدائی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو ادب میں مقامیت کی کیا صورت حال ہے۔ چوں کہ" آگے سمند ہے " میں مختلف مہاجر کردار اپنی متنوع اور علیحدہ شناخت پر اس قدر زور دیتے ہیں، اس لیے قاری توقع کرتا ہے کہ وہ مختلف شناختی گروہ نہ صرف اپنے خوراک وغیرہ پر فخر کرتے ہوں گے، بلکہ اپنی لسانی انفرادیت، یعنی اپنی مقامی بولی پر بھی۔ حالانکہ کرداروں کی زبان ایک دوسرے سے مختلف دکھائی تو گئی ہے، پھر بھی ان کی زبان میں ایسی کوئی خصوصیات نہیں ہیں جن سے انھیں کسی ایک علاقے سے منسوب کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ کرادروں کے آبائی پس منظر کی تفصیل کہانی میں نہ دی ہوتی۔ سب کرداروں کی زبان میں مورفالجی کی معیاری اردو سے الگ کوئی خصوصیات نہیں، البتہ ان کی زبان الفاظ کے انتخاب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ دکھائی گئی۔ اس سے ابتدائی مشاہدے کی تصدیق ملتی ہے کہ بولیاں عام طور پر اردو کے دائرے سے خارج سمجھی جاتی ہیں اور الٹا ہندی سے منسوب کی جاتی ہیں، تاہم اردو کو اولیں طور پر شہری

ماحول سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔اس لیے معیاری زبان اردو کا معمول ہے، جب کہ الفاظ کے انتخاب سے زیادہ تر طبقے اور تعلیم کی طرف نشان دہی کی جاسکتی ہے۔محدود حد تک البتہ مقامی رنگ بھی پیدا کیا جاتا ہے۔لیکن وہ اکثر غیر واضح اور مبہم رہ جاتا ہے، کیوں کہ الفاظ کا انتخاب اکثر کسی ایک کے علاقے یا شہر سے منسوب نہیں کیا جاسکتا ہے۔انتظار حسین کے اس ناول میں اردو کے پاکستان میں معیاری زبان کی طرف رجحان کی عکاسی ملتی ہے۔اس نشوونما میں غالباً پشت بہ پشت اضافہ ہوتا رہا کہ آخر کار الفاظ کا انتخاب بھی ایک معیاری شکل اختیار کرے گا۔نتیجتاً پاکستانی ادب اردو کے لسانی دائرے کے اندر مقامی رنگ کے اظہار سے قاصر ہے۔مگر پاکستان میں اس کا نعم البدل مختلف لہجوں اور خصوصاً پنجابی میں ملتا ہے جس کی اردو سے حد بندی میں کمی رونما ہوتی جارہی ہے اور جو زیادہ تر پاکستانیوں کے لیے ایک عام فہم طرزِ کلام مانی جاتی ہے۔لہٰذا پنجابی پاکستانی اردو کے متنوع مقامی رنگوں کی کمی پر کرسکتی ہے۔

حوالہ جات

1- Regional

2- Indu Prakash Pandey, Regionalism in Hindi Novels (Wiesbaden: Steiner, 1974), 1, 9.

۳۔ پریم چند : مجموعہ :افسانے(لاہور :سنگ میل،۲۱۰۲)،۳۶۷۔

4- Indu Prakash Pandey, Regionalism in Hindi Novels, 31-32.

5- Christopher R. King, "Images of Virtue and Vice: The Hindi-Urdu Controversy in Two Nineteenth-century Hindi Plays," in Religious Controversy in British India: Dialogues in South Asian Languages (Albany: State of University New York Press, 1992), 124; Alok Rai, Hindi Nationalism (London, Hyderabad: Sangam Books, 2001).

6- Alyssa Ayres, Speaking Like a State: Language and Nationalism in Pakistan (Cambridge: Cambridge University Press, 2009), 18.

7- Ayres, Speaking like a State, 28; Mubarak Ali, Pakistan: In Search of Identity (Karachi: Pakistan Study Centre, 2009), 19.

8- King, "Images of Virtue and Vice," 124-125.

9- Morphology

10- Syntax

۱۱۔ اسد محمد خان، غصے کی نئی فصل (لاہور :القا، ۲۰۱۳ء)، ۲۔

۱۲۔ راجندر سنگھ بیدی مجموعہ (لاہور :سنگ میل، ۲۰۱۴۲ء، ۱۸۷۔

۱۳۔ مثال کے طور پر منشا یاد کی کہانی "تماشہ "دیکھیے" :میں وی جانا جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے"، جس کا وہ ساتھ ہی اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔منشا یاد" : تماشہ،"عصری اردو کہانیاں، مرتب صادق (نئی دہلی : پینگوئن بکس، ۲۰۰۷ء)، ۲۹۳ تا ۲۹۴۔

۱۴۔ بانو قدسیہ :راجہ گدھ (لاہور :سنگ میل، ۲۰۱۷ء)۔

۱۵۔ مستنصر حسین تارڑ : خس و خاشاک زمانے (لاہور :سنگ میل، ۲۰۱۷ء)۔

۱۶۔ سمیع آہوجا :ننانوے کے پھیر میں (لاہور :سانجھ، ۲۰۱۴)، ۸۱۳۔

17- Nostalgia.

۱۸۔ انتظار حسین : آگے سمندر ہے (لاہور :سنگ میل، ۲۰۰۷)، ۵ تا ۲۱۔

۱۹۔ انتظار حسین : آگے سمندر ہے (لاہر :سنگ میل، ۲۰۰۷)، ۴۹۔

۲۰۔ انتظار حسین : آگے سمندر ہے (لاہر :سنگ میل، ۲۰۰۷)، ۴۸۔

21- Laurent Gayer, Karachi: Ordered Disorder and the Struggle for the City (London: Hurst & Company, 2014), 2.

۲۱۔ انتظار حسین : آگے سمندر ہے (لاہر :سنگ میل، ۲۰۰۷)، ۱۰۱۔

۲۲۔ انتظار حسین : آگے سمندر ہے (لاہر :سنگ میل، ۲۰۰۷)، ۲۳۵ تا ۲۳۶۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ولا جمال العسیلی،
ایسوسی ایٹ پروفیسر، عین شمس یونیورسٹی قاہرہ۔ مصر

مصر میں اردو زبان و ادب

اردو زبان برصغیر پاک و ہند سے باہر نکلی تو کرۂ ارض کے پانچوں براعظموں تک پھیل گئی اور نئی بستیاں بستی چلی گئیں۔ اردو کی نئی بستیوں میں مصر کی سرزمین بھی شامل ہے۔ مصر میں اردو کی تدریس بیسویں صدی کے نصف آخر سے اب تک جاری ہے۔

مصر کی سات یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ گریجویشن کی حد تک اردو پڑھانے کا انتظام موجود ہے، علاوہ ازیں ان جامعات میں بھی ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق کا انتظام بھی موجود ہے اور ریسرچ کرنے والے طلبہ کو شعبے کے نام سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔

مصر کی جامعات میں جامعہ الازہر، جامعہ عین شمس اور جامعہ القاہرہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں اردو زبان کا ایک علیحدہ شعبہ ہے۔ دیگر جامعات میں جیسے منصورہ، اسکندریہ، وغیرہ میں بھی اردو کی تعلیم و تدریس اور تحقیقی کام کا بندوبست موجود ہے جہاں فارسی زبان کے شعبے کے زیر اہتمام اردو بطور دوسری زبان پڑھائی جاتی ہے۔ بعض دیگر شہروں کے تعلیمی اداروں میں بھی اردو کورسز کرائے جاتے ہیں۔ مصر میں بعض پرائیویٹ سینٹرز بھی اردو سکھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصر میں انڈین کلچرل سینٹر نے بھی اردو کورسز متعارف کرائے ہیں۔ ان کورسز سے مستفید ہونے والے اسکالرز پاکستان اور بھارت جا کر مزید تعلیم حاصل کرتے ہیں یا دیگر خدمات انجام دیتے ہیں۔

مصر میں ادبی سیمیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے اور بین الاقوامی سطح کی ایسی کانفرنسیں بھی منعقد کی جاتی ہیں جن میں مصر سے ہی نہیں بلکہ بیرون ملک سے بھی متعدد اساتذہ شرکت کر کے اپنے مقالات پیش کرتے ہیں جن کی شرکت کی وجہ سے اردو زبان و ادب کی تحقیق کے نئے گوشے ابھر کر سامنے آتے ہیں اور اردو کے طالب علموں، خاص طور پر ریسرچ اسکالرز کو ایسی سرگرمیوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

اردو کے طالب علم ابتدائی عمر یعنی یونیورسٹی کے مرحلے کے آغاز میں پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ ان طلبہ کا اردو کے سلسلے میں کوئی سابقہ پس منظر نہیں ہوتا اور نہ اس سے قبل اس کے بارے میں ان کے پاس کچھ معلومات ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس انگریزی یا فرانسیسی زبان کے طالب علم ان زبانوں کو بچپن ہی سے پڑھنا

شروع کر دیتے ہیں۔اس مقصد کے لیے انھیں میڈیا اور دیگر اسپیشل سینٹرز سے بھی مدد مل جاتی ہے جو ملک کے طول وعرض میں موجود ہیں۔

مصر میں اردو کے فروغ کے لیے برصغیر سے تعلق رکھنے والے اردو اہلِ زبان کا کردار بھی بڑا اہم ہے۔انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے گراں قدر تدریسی خدمات انجام دی ہیں جن کی بدولت اس ملک میں اردو کا چرچا ہوا ہے۔آج کل الازہر یونیورسٹی اور عین شمس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ایسے اہل زبان اساتذہ منسلک ہیں جن کا تعلق بھارت سے تھا لیکن اب وہ مستقل بنیادوں پر مصر میں آباد ہو چکے ہیں۔

الازہر یونیورسٹی (بوائز برانچ) کے اردو ڈیپارٹمنٹ کی بنیاد 1979 میں پڑی۔وہاں اسلامی،ادب اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر اردو کے شعبے میں تقریباً سو طالب علم موجود ہیں۔الازہر یونیورسٹی (گرلز برانچ) کے اردو ڈپارٹمنٹ کی بنیاد 1966 میں پڑی۔اس ڈیپارٹمنٹ سے ایک سال نامہ تحقیقی مجلہ'اردویات' بھی شائع ہوتا ہے۔اس کا پہلا شمارہ مئی 1999 میں اور تازہ ترین شمارہ شائع ہوا تھا،اشاعت کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔اس مجلے میں اردو زبان وادب کے مختلف پہلوؤں پر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ ڈیپارٹمنٹ کی بزم بھی سیمیناروں کا اہتمام کر کے مصر میں اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہے۔

عین شمس یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا شعبہ 1962 میں قائم کیا گیا تھا۔شروع میں یہاں صرف فارسی اور ترکی زبانیں ہی پڑھائی جاتی تھیں۔بعد میں 1979 میں فارسی اور ترکی زبان کے ساتھ اردو بطور اختیاری زبان پڑھائی جانے لگی۔1996 میں اردو کا ایک علیحدہ شعبہ قائم کر دیا گیا۔شروع میں اس شعبے میں جامعہ الازہر اور پاکستان اور بھارت کے اساتذہ پڑھاتے تھے جنھوں نے اردو طلبہ اور اسکالرز کی غیر معمولی مدد کی۔وہ اس شعبے میں کافی عرصے تک رہے اور ان کی سرپرستی میں تحقیقی کام چلتا تھا۔اب اس شعبے سے جو اساتذہ وابستہ ہیں ان کا بنیادی تعلق مصر سے ہے۔علاوہ ازیں دو ایسے اساتذہ موجود ہیں جن کا تعلق ہندوستان سے ہے۔

عین شمس یونیورسٹی میں اردو شعبے میں پہلے سال میں طالب علم صرف اردو قواعد پڑھتا ہے۔دوسرے سال سے چار سال تک وہ تاریخ،شاعری،نثر،ادب،ترجمہ (عربی سے اردو میں اور اس کے برعکس) پڑھتا ہے۔چار سال کے دوران میں وہ اردو زبان وادب اور تاریخ کے متعلق سب کچھ جان جاتا ہے اور برصغیر کے تمام سیاسی،تہذیبی،اور معاشرتی پہلوؤں سے متعارف ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ عین شمس یونیورسٹی میں فیکلٹی آف آرٹس کا اردو شعبہ تمام مصری جامعات کا واحد شعبہ ہے جس میں ہندی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔

مصر میں اردو زبان میں تخلیقی ادب کے سلسلے میں،میں کہہ سکتی ہوں کہ یہاں کے لوگوں کی مادری

زبان گرچہ اردو نہیں ہے، عربی ہے، اس کے باوجود یہاں قابل قدر کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں میرے شاعری کے مجموعے 'سمندر ہے درمیاں' کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے، وہ مصر میں اردو زبان میں شاعری کا اولین مجموعہ ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال مصر کی سات دیگر جامعات کی ہے جہاں اردو ادب میں نہایت قابلِ قدر تحقیقی کام ہو رہا ہے جن میں جامعہ الازہر، جامعہ القاہرہ اور جامعہ عین شمس کے تحقیقی مقالے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

مصر میں اردو ادب میں تحقیق کا امتیاز کسی ادبی تخلیق کا اردو سے عربی میں ترجمہ کرنا ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ متن کی تنقید بھی مرکزی حیثیت حاصل کیے ہوئے ہے جس کے تحت تہذیبی نظریات و رجحانات اور ثقافتی وسماجی صورتحال کے حوالے سے ادب اور ادیبوں کا مطالعہ قابل ذکر ہے۔ ان اردو شعبوں میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کے ایسے تحقیقی مقالے لکھوائے گئے ہیں جن کا اردو میں تحقیق کی رفتار کو بلند کرنے میں اہم کردار ہے۔ جدید اور معاصر اردو ادب کے تحقیقی کام میں ان مقالوں کا علمی وزن بے حد وسیع ہے۔ ان شعبوں میں اردو زبان و ادب کے مختلف رجحانات پر خاصا لکھا گیا ہے۔

اگر اردو زبان و ادب کے سلسلے میں حالیہ تحقیقی رجحانات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ رجحانات ان موضوعات پر ایک اہم مقام رکھتے ہیں، مثال کے طور پر:

۱۔ ادب کی تاریخ

اس میں ادیبوں کی زندگی، ان کی زندگی میں تاثیر و تاثر کے پہلو، متن کے خصائص، ادبی مسائل، ادبی مظاہر اور میلانات اور ادب کے ادوار شامل ہیں۔

۲۔ شعری اور نثری متن

اس میں کلاسیکی اور جدید شاعری اور اس کے موضوعات، افسانوی اور غیر افسانوی ادب، جیسے ناول، افسانہ، ڈرامہ، مضمون، وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ نظریہ ادب

اس کی ذیل میں ادبی اصناف کے علاوہ تقابلی ادب شامل ہے۔

مصر میں اکثر ریسرچ اسکالرز ریسرچ کے شرائط اور اصولوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ تحقیقی موضوع کے سلسلے میں سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اساتذہ شعبۂ اردو میں ریسرچ اسکالروں سے نئے نئے موضوعات پر معیاری تحقیقی مقالے لکھواتے ہیں۔ ضروری ہے کہ کسی یونیورسٹی میں اس سے پہلے اس موضوع پر یا اس سے ملتے جلتے موضوع پر بھی کوئی مقالہ نہ لکھا گیا ہو۔ کسی بھی موضوع پر مقالہ سپردِ قلم کرنے سے پہلے وہ اس موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات اور مواد جمع کر کے ان پر غور و فکر کرتے ہیں اور پھر اپنے ذوق اور شعورِ تنقید کی مدد سے اس

موضوع سے متعلق جو تحقیقی وتنقیدی نتائج سامنے لاتے ہیں، ان میں جدت اور تازگی تو ہوتی ہی ہے، تحقیق کے عنصر کے ساتھ ساتھ مقالوں کا ایک اہم پہلو اسکالرز کی تنقید نگاری بھی ہوتا ہے۔ اس کام میں ضرورت کے مطابق تحقیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور کا بھی مظاہرہ کیا گیا ہے۔ جیسے ادبی کام کس اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ علامتی اسلوب میں، تجریدیت کی تیکنیک یا میجک کی تکنیک میں کیا صورت حال ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ موضوع اور تیکنیک پر نظر رکھنا ادبی کاموں کی تنقید کا اصل اور بنیادی جوہر ہے۔ اس کے علاوہ ان مقالوں میں ادیب کے برتاؤ کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ادبی کام کی خوبیوں اور خامیوں کا بہترین تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

مصر میں ریسرچ اسکالرز کا کمال یہ ہے کہ وہ پورا ادبی متن یا انتخابی نمونوں کا ترجمہ اردو سے عربی میں کرتے ہیں اور تنقیدی تجزیوں کے ساتھ ساتھ مقالے میں متن سے شواہد اور دلائل کا استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ریسرچ اسکالر کے لیے مقالے کے حقائق، اشارات، مقامات، اور شخصیات وغیرہ کے بارے میں حاشیہ لکھنا ضروری ہے لیکن ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ تحقیقی مقالے کا مواد ہمیشہ دست یاب نہیں ہوتا۔ ریسرچ کے لیے وہ کتابیں موجود نہیں ہوتیں جو تحقیقی اعتبار سے بے حد اہم ہیں جیسے ادبی متن یا تخلیق سے متعلق خارجی مواد۔

مصر میں تحقیقی رجحانات کی موجودہ صورتِ حال کے منظر نامے میں یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں جاری تحقیقی سرگرمیاں، بحیثیت مجموعی اطمینان بخش ہی کہی جائیں گی۔ مقالوں سے تحقیق وتنقید کے سرمائے میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ مقالوں کی نوعیت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ مقالہ نگاروں نے افسانوی ادب پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اگرچہ شاعری اردو ادب میں اہم صنف کا درجہ رکھتی ہے، اس پر تحقیقی مقالوں کی تعداد کم ہے، نثر میں تحقیق زیادہ ہے۔ سب سے زیادہ تحقیق افسانوی ادب پر ہی ہوتی ہے، دوسرے درجے پر شاعری کا نمبر آتا ہے۔

آخر میں کہہ سکتی ہوں کہ مصر میں اردو زبان کی وسعت کا اندازہ لگانے میں اردو ادب کا تحقیقی وتنقیدی کام بے حد مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اردو ادب کے حوالے سے تحقیقی مقالے کثرت سے لکھے جا رہے ہیں۔ اردو ادب کا معیار بلند کرنے میں ان مقالوں کا بھی اہم کردار ہے۔ جن تحقیقی کاوشوں کا سرمایہ سامنے آچکا ہے وہ نہ صرف اپنی مقدار کے لحاظ سے بلکہ معیار اور کیفیت کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔ مصر کی جامعات کے اردو شعبوں کا سب سے بڑا کارنامہ اردو زبان وادب کی تحقیق کی شمع روشن کرنا اور ادبی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہونا ہے۔

تاریخ اور اردو زبان وادب کی مختلف اصنافِ نظم ونثر میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے، ترجمے پر

ان کا ارتکاز رہا۔ اردو زبان و ادب میں تحقیقی مقالوں کے فروغ کے لیے بیسویں صدی کے آخری نصف سے کوشش جاری ہے، یہ مقالے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور موضوعاتی، اسلوبیاتی، ادبی اور فکری پہلوؤں کے تجزیہ و تحقیق کے حوالے سے بصیرت ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ریسرچ اسکالرز نے اردو ادب میں مختلف ادبی رجحانات پر تحقیقی کام کیا جن کے مقالے جو اکثر و بیشتر اردو کے تحقیقی مقالوں میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اکثر و بیشتر مقالوں میں سماجی و ثقافتی حقائق اور مسائل کے حوالے سے تحقیقی کام ہوتا ہے۔ مصر میں ریسرچ اسکالرز اردو ادب کی تحقیق نئے زاویوں سے کرنے پر یقین رکھتے ہیں اور موضوع کو روشن کرنے کا رویہ اپناتے ہیں۔ غرض مصر سے تعلق رکھنے والے اردو زبان و ادب کے اسکالرز نے اپنے گہرے ادبی ذوق سے کام لے کر اس ملک میں اردو تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔

☆☆☆☆

ستیہ پال آنند (واشنگٹن، امریکا)

TV Talk Show Host

میں تو کوئی کردار نہیں ہوں
میں تو پردے کے پیچھے
اسٹیج کے عقبی دروازے کے پاس کھڑا ہوں
میرے منہ سے مائکروفون کو باندھ دیا ہے ڈائریکٹر نے

لہجہ بدل بدل کر ہر انداز کی قرات میرا فن ہے
سرگوشی سی، گلو گرفتہ، ہلکی، دھیمی آہٹ جیسی، گم صم سانسیں
گرج، کڑک سی، غوغائی، پر رعب، سماعت پاش آوازیں
سب میرے فن کے کرتب ہیں
صوتیات کا ماہر ہوں میں

اعزازی، تکریمی باتیں یوں کہتا ہوں
جیسے خوشامد، در آمد ہی ایک اکیلا کام ہو میرا
چرب زبانی کے ہاروں میں گندھے ہوئے
سب میٹھے میٹھے، نپے تلے تعریفی جملے
میرے منہ سے یوں جھڑتے ہیں
جیسے پھولوں کی کلیاں ہوں
مسکہ، پالش، کاسہ لیسی میں یکتا ہوں
گالی بکنے میں بھی میرا ثانی نہیں دنیا میں کوئی
بغض وعناد، مذمت کے الفاظ وہ نوکیلے پتھر ہیں

جن میں بدخواہی، بے مہری، استکراہ کا زہر بھرا ہے
اور یہ زہر کدورت کے جذبے میں گھل کر
حزبِ مخالف کے ہر دشمن پر یلغار کیے جاتا ہے۔

میں اخبار کے کالم لکھنے والا ایک صحافی تو ہوں، لیکن
میں اسٹیج کے عقبی دروازے کے پاس کھڑا ہوں
میرے منہ سے لاؤڈ اسپیکر بندھا ہوا ہے
جس پالیسی یا حکمتِ عملی پر چلنے کی اِسکرپٹ مجھے ملتی ہے
اس پر چل کر
اپنا کام کیے جاتا ہوں، اور انعام لیے جاتا ہوں
☆☆☆☆

اشفاق حسین (کینیڈا)

چوتھا عشرہ

زندگی کے عشرے چار
تین میں گنوا بیٹھا
ایک اس تفکر میں
زندگی کا مطلب کیا
کائنات کے اندر
فرد کی حقیقت کیا
نفرتوں کی منڈی میں
قیمتِ محبت کیا

دوسرے میں بس اپنا
مرکزِ نظر میں تھا
اپنی ذات سب کچھ تھی
سوچتا تھا آخر کیوں
وہ جو صرف میرے ہوں
ایسے پھول آنگن میں
روز کیوں نہیں کھلتے
کیوں خزاؤں کے ناخن
زخمِ گل کھرچتے ہیں
نم ہواؤں کے جھونکے
آگ کیوں اگلتے ہیں

اور تیسرا عشرہ
بے یقینیوں کا تھا
جس میں میں نے یہ سوچا
جس میں میں نے یہ جانا
یعنی میں نے جو سوچا
یعنی میں نے جو جانا
صرف ایک جھونکا تھا
ریشمی ہواؤں کا

کیوں نہ چوتھے عشرے کو
اس طرح گزاریں ہم
دل کے نرم دامن پر
چاندنی اتاریں ہم
زندگی کی زلفوں کو
پیار سے سنواریں ہم
تم صدائیں دو ہم کو
اور تمھیں پکاریں ہم
کیوں نہ چوتھے عشرے کو
اس طرح گزاریں ہم

☆☆☆☆

سلمان باسط (امریکا)

فقط نیستی ہو

کسی دن زمانے سے باہر ملو گر
تو تم کو بتاؤں
کہ کتنے فسانے ہیں جو نارسائی کے دکھ سے جڑے ہیں
تمھیں یہ بتاؤں
یہ جینا بھی انفاس کی آمد و شد نہیں ہے
یہ اک دھونکنی ہے
جو بس چل رہی ہے
چلی جا رہی ہے
بڑی کج روی سے بہے جا رہا ہے
مری عمرِ پیہم کا ظالم بہاؤ
کسی روز آؤ
مگر یوں نہ ہو
تم کسی روز آؤ
تو دیکھو میں دیوارِ جاں کے پرے جا بسا ہوں
جہاں پر نہ تم ہو
جہاں پر نہ میں ہوں
نہ خواہش، نہ حسرت، نہ کوئی تمنا
بچھڑنے کا ڈر اور نہ ملنے کی چاہت
فقط نیستی ہو

☆☆☆☆

یشب تمنا (لندن)

میز پر رکھا خیال

خیال میز پہ رکھا
میں احتیاط کے ساتھ
اور اک دراز سے کاغذ
تو دوسری سے قلم
نکال کر وہیں بیٹھا کہ نظم لکھتا ہوں

میں چاہتا تھا کہ کاغذ پہ منتقل کر دوں
وہی خیال ابھی میز پر جو رکھا تھا
مجھے یہ ڈر تھا وہاں
دوسری کتابوں میں
نیا خیال کہیں دب کے کھو بھی سکتا ہے
مگر کھلا
کہ ابھی موڈ نہیں ہے

میں مسکرا کے اٹھا دوسرے قلم کے لیے
نئے قلم کو میں نے جیسے ہی رکھا کاغذ پر
تو وہ بھی درد کی شدت سے کسمسانے لگا

عجیب عالم بے چارگی میں بیٹھا ہوں
خیال سامنے رکھا ہے میز پر لیکن

اسے میں لکھ نہیں سکا قلم سے کاغذ پر
اور اس کے کھونے کا
اک خوف پیچھا کرتا ہے

☆☆☆☆

ارشد لطیف (لندن)

جاہلوں کے درمیان

مثال نے
دوسری مثال کو
قبول ہی نہیں کیا

خیال نے
اپنے ہی، کسی نئے،
تازہ تر خیال کو
خوشی خوشی
وصول ہی نہیں کیا

مبتلائے کشمکش
بھٹک رہے ہیں قافلے
کہ رہبروں نے
منزلوں کے راستے بدل دیے

اور پھر
عقل و دل کی راہ پر
کئی محاذ کھل گئے
میرے خواب رُل گئے
عرصۂ دراز سے

جاہلوں کے درمیان
جنگ ہو رہی ہے
اور
آج تک
میری جیت ہار کا فیصلہ نہیں ہوا
☆☆☆☆

ڈاکٹر افروز عالم (جدہ)

تغیر

زمانہ جب خموشی سے نئے تیور میں ڈھلتا ہے
تو موسم خشک ہوتا ہے شجر کپڑے بدلتا ہے
کبھی تو بھیگی شاخیں آگ کے گولے اگلتی ہے
کبھی تو برگ وگل تریاق کے اسباب بنتے ہیں

شجر کی مختلف شاخیں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں
ثمر بھی ساتھ دیتی ہیں، وہی سائے کی ضامن ہیں
شجر کی شاخوں کی ہے اہمیت موسم بدلنے میں

یہی شاخیں
جو اکثر موسموں کا رخ بدلتی ہیں
اگر چہ سوکھ جائیں تو یہی ایندھن بھی ہوتی ہیں
یہ شاخیں جو کبھی آپس میں لڑنے پر اتر آئیں
کبھی دست و گریباں ہوں تو اکثر اپنی الجھن سے
نیا ماحول دیتی ہیں

ضروری یہ نہیں کہ
وہ نیا ماحول سب کے من موافق ہو
سبھی کو راس آجائے

نہ جانے کیوں مجھے کچھ عرصے سے اب ایسا لگتا ہے
نیا موسم لہو کی جھیل میں غوطے لگائے گا!!!

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری (جموں وکشمیر)

کشمیر میں سب کچھ ٹھیک ہے

وادی کے مرغزار اور کہسار
بین کی خوفناک آواز سے
اچانک
لرز اٹھے
جوگی کی جادوئی بین پر
کالے ناگ رقص کرتے ہوئے
وادی کے چپے چپے پر پھیل گئے
ان کی دہشت سے
ریشم مزاج لوگوں کے دلوں میں
خوف کے نقارے بجنے لگے
زبانیں گُنگ ہوگئیں
کان بہرے ہوگئے
جذبات کا قتل ہوا
احساسات کا قتل ہوا
گھٹن کی دھند ساری وادی میں پھیل گئی
آنکھوں کی بینائی تک زخمی ہوئی
لوگوں کے منہ جبر کے بنکروں
سے ڈھانپ دیے گئے
کالے ناگ گلی کوچوں میں
رینگتے رہے

ان کو حکم ملا تھا کہ
اس دماغ کو ڈس لینا
جس دماغ سے بغاوت
کے شعلے بھڑک اٹھیں
خاموش فضا کے درمیان
جوگی کے جابرانہ کھنڈر سے
زہریلی آواز آئی
ہمارے فیصلے کے خلاف
آج تک ایک بھی آواز
نہیں اٹھی
کیوں کہ
کشمیر میں سب کچھ ٹھیک ہے
☆☆☆☆

شیخ توحید (امریکا)

ایک گاؤں کی لڑکی

پاکی کی تصویر: ایک گاؤں کی لڑکی!
الفاظ بھٹک جاتے ہیں،
آنسو گر جاتے ہیں،
روحیں روتی ہیں!

روشنی مر جاتی ہے،
ہوا آہ بھرتی ہے،
رات زندہ رہتی ہے!

یہ چہرے مٹ جاتے ہیں
یہ قلم رک جاتے ہیں!

صدیوں کی لکیریں
اس کے ماتھے پر ہے
زندہ رہتے مرنے کی لکیر،
نشاں زدہ، طے شدہ، مسکراہٹوں کی لکیر،
سوکھے، چھیدتے آنسوؤں کی لکیر،
کثیر،
کثیر، مارے گئے جذباتوں کی لکیر
اس کی کلائی

پر نشاں ہے!
جستجو کے نشاں،
عزیزوں کی محبت کے نشاں،
نشان زنجیر،
تاکہ کھڑکی سے باہر نہ دیکھے،
نشان زنجیر،
اک زندہ، پیار کرنے والی روح کی خاطر،

آنکھوں میں قطرے،
اپنی محبت سے محبت نہ کرنے کے قطرے،
جس کی چاند روشن آنکھیں آج بھی تکتے ہیں،
ہاتھ میں ان ٹوٹے، پروں کے لیے قطرے،
قطرے ایک نسخہ پڑھ کے
"بے داغ شمس نشان پیارا دل
خاموشی میں قید، وقت کے ساتھ خاموش،
جو اپنی محبت کے ساتھ اڑنا چاہتی تھی،
آہ جس کے جوانی میں ہی پنکھ کاٹ دیے گئے!"
☆☆☆☆

سعید نقوی (واشنگٹن)

بلقیس اور سلیمان

عزرائیل کے بادشاہ، سلیمان بن داوٗد کے دربار میں تمام جن وانس وطائر موجود تھے۔ بس ایک ہدہد تھا جو غائب تھا۔ قدرت نے سلیمان کو جانوروں کی بولی سمجھنے کا علم ودیعت کیا تھا۔ سلیمان کے دربار میں بلا ضرورت غیر حاضری باعثِ عتاب بن سکتی تھی۔ اس کی سخت ترین ممکنہ سزا موت تھی۔ اس سے پہلے کہ سلطان زیادہ برہم ہوتے، ہدہد حاضر ہوگیا۔ دیگر جانوروں نے ہدہد کو اس کی غیر حاضری پر آڑے ہاتھوں لیا۔ سلیمان بن داوٗد کی بے اعتنائی ہی ان کی ناراضگی کا عندیہ تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی سزا سنائی جاتی، وہ ہدہد سلیمان سے گویا ہوا ''اے جنات کے بادشاہ، ہواؤں کے مسافر، کائنات کی تمام مخلوق کے عالم، میں سبا کی سچی خبر اور آنکھوں دیکھا حال آپ کے گوش گزار کرنے آیا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اس ملک کی سربراہی ایک عورت کر رہی ہے، جس کے حسن کا کسی طائر نے بدل نہ دیکھا ہوگا۔ اس کا تخت عالم میں بے نظیر ہے۔ وہ گویا عرش پر بیٹھ کر اپنی قوم پر حکومت کرتی ہے، جو اس پر جان چھڑکتی ہے۔ لیکن میں نے انھیں کفر کے رویوں میں مبتلا پایا۔ وہ اور اس کی قوم سورج کی پرستش کرتے ہیں۔ شیطان ان کے اعمال کو بڑھاوا دیتا ہے، اور وہ آپ کے خدا سے غافل ہیں۔'' ہدہد کی خبر سے سلیمان کا غصہ فرو ہوا۔

''یہ ہدہد کیسی انوکھی خبر لایا ہے۔ انعام میں اس کو آج اس کی پسند کے کیڑے غذا میں مہیا کیے جائیں''
انھوں نے اپنے معتمدِ اعلیٰ کو حکم دیا۔ پھر ہدہد سے بولے ''ملکہ بلقیس کے لیے ہمارا یہ مکتوب لے جاؤ، اس میں ہم نے اسے خدا کی جانب آنے کی دعوت دی ہے۔ بہتر ہے کہ وہ آفتاب کی پرستش سے منہ موڑے اور کفر سے اجتناب کرے۔ صورت اثنین میں ہم سبا پر لشکر کشی کریں گے۔''

''ارے دیکھو کون آتا ہے، ہٹو دیکھو کون آتا ہے، ملکۂ خطۂ سبا کی سواری ہے۔'' شاہی جلوس سے چند قدم آگے شاہی نقیب اعلان کرتا جاتا تھا۔ بارہ دیوہیکل، دودھیا سنگی ستون ایک وسیع ایوان کی چھت کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ یہ ایوان اتنا وسیع تھا کہ اس میں سیکڑوں آدمی بیک وقت باآسانی سما جاتے۔ تمام نگاہیں اس جنوبی دروازے کی جانب پھر گئیں جہاں سے ملکہ کا جلوس داخل ہو رہا تھا۔ عموماً اجتماع اتنے پر ہجوم نہیں ہوتے تھے۔ ملکہ کے امرا، وزرا، محافظین، قاضیِ شہر اور شاہی خاندان کے چند افراد ہی عموماً روزانہ دربارِ خاص کا حصہ ہوتے۔

جس میں امورِ مملکت، جیسے دفاع، اقتصادیات، تجارت اور نظم و نسق کے معاملات پر مشاورت ہوتی۔

اس ایوان کے جنوب میں داخلی محراب کسی دروازے سے عاری تھی۔ ملکہ بلقیس کا جلوس وہیں سے اس دربار میں داخل ہوا۔ اس کا حسنِ جہاں سوز ایسا تابناک تھا کہ نظر جمانا دشوار ہو جائے۔ اس نے بھاری سیاہ چغہ زیب تن کیا ہوا تھا جو یاقوت و الماس سے جڑاؤ تھا۔ زری سے بنے چوخانوں کے حاشیوں پر جا بجا مروارید ٹنکے تھے۔ چوخانوں کے جال میں ہر چوکور کے وسط میں ایک ہیرا دمک رہا تھا۔ بالوں میں درجنوں چوٹیاں گندھی تھیں۔ اس کے بال بال میں موتی پروئے تھے۔ گلے اور ہاتھوں میں کہنیوں تک گہنے پہنے تھی۔ چھت سے لٹکتی قندیلوں اور مشعلوں کی روشنی ان ہیروں سے منعکس ہو کر عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ روشن دانوں سے آتی روشنی دونوں وقتوں کے ملنے کا عندیہ دے رہی تھی۔ چراغ روشن کیے جا چکے تھے۔ جڑاؤ تاج سر پر رکھے ملکہ بلقیس شاہانہ انداز میں قدم بڑھا رہی تھی۔ پاؤں اگر کسی شاہی جسم کو سہارے ہوں تو تمکنت آپ ہی آپ پیدا ہو جاتی ہے۔ مختصر قدم، لمبے ڈگ یا ڈگمگاتی چال سب آپ ہی آپ معتبر ہو جاتے ہیں۔ اس کے عقب میں برچھیاں اٹھائے، تیغ و جمدھر سے مسلح سیاہ چمکدار جسموں والے حبشی تھے۔ سیاہ فام، حسین نوجوان خادماؤں کا ایک جلوس تھا جن کے چہروں پہ نگاہ جم جاتی تو ہٹنے سے انکار کر دیتی، مگر کس کی مجال تھی کہ اس جلوس سرافراز کی جانب براہ راست دیکھ سکتا۔

جس تخت کی جانب وہ بڑھ رہی تھی وہ تخت کیا تھا انسانی ہنرمندی کا معجزہ تھا۔ اس کے معاصرین اس تخت کو عرش سے تعبیر کرتے۔ افریقہ کے جنوبی خطوں میں واقع اس کی مملکت ان دوسرے خطوں سے بہت دور نہیں تھی، جہاں مشرقی خطوں میں شتر مرغ کے انڈے جتنے ہیرے اکثر دریافت ہوتے۔ قرن در قرن، تاجر، سفیر دوسرے خطوں کے سربراہ گزرتے تو اپنے علاقوں کے قیمتی پتھر تحفہ گزارتے۔ تو کیا عجب تھا کہ وہ تخت یاقوت، الماس، مرجان، نیلم، پکھراج اور کہیں کہیں فیروزے سے بھی آراستہ تھا۔ دو قدمچے چڑھ کر اس تخت کی وارث، اس کے وسط میں بنے ایک اونچے چوبی چبوترے پر دوزانو بیٹھتی۔ گول تخت کا تین چوتھائی دائرہ چوبی دیواروں کے احاطے میں گھرا ہوا تھا۔ مشاق دست کاروں نے دستی اوزاروں سے ایسے نقش و نگار بنائے تھے کہ خود حیرت دانتوں میں انگلی دبالے۔ ملکہ کے عقب میں چوبی دیوار پر سورج دیوتا کا نقش اپنی پوری آب و تاب سے ابھارا گیا تھا۔ سورج سے نکلتی شعاؤں کو چاندی کے تاروں سے بنایا گیا تھا۔ وسطی آگ بھری تھالی ایک نقرئی طشت تھی۔ سامنے کے کھلے حصے میں بالشت بھر نیچی جھالر ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی تھی۔ تخت کے بائیں جانب ایک احاطے میں اس شہر کے امرا و روٴسا جمع تھے۔ کچھ کھڑے تھے، کچھ بیٹھے تھے۔ سیاہ، چمکتے جسموں والے خدام ان میں مشروب تقسیم کر رہے تھے۔ داہنی جانب وزرا اور شاہی افراد کے لیے وقف

تھی ۔ ہال کی چھتیس بالشت اونچی چھت ایک گنبد کی شکل کی تھی ۔ اس کی اندرونی نقش کاری بھی فہم وادراک کو شرمندہ کرتی کہ اتنی بلندی پر انسانی ہاتھوں نے یہ باریک نقوش کیسے ابھارے ہوں گے ۔ ہال میں ہلکی خوشبو شمامتہ العنبر کی پھیلی ہوئی تھی ۔ دائیں بائیں اور عقبی سمت میں دیوان کی دیواروں پر ہواداان کھلے تھے ۔ جہاں سے سورج دیوتا اپنے مدار میں چاہے جس مقام پر بھی ہوں، ان کی آشیر باد ملتی رہے ۔

دائیں دیوار کے ایک ہواداان میں ایک ہدہد بیٹھا چاروں سمتوں کا نظارہ اپنی آنکھوں میں سمیٹ رہا تھا ۔ ملکہ بلقیس نے ہاتھ کے خفیف اشارے سے خود لب کشی کا عندیہ دیا تو دربار میں خاموشی چھا گئی ۔ شاہی لبوں سے نکلا ہر لفظ فرمان تھا، جمہور کی سماعتوں پر لازم تھا کہ اپنی پوری حسیت کے ساتھ حاضر رہیں ۔

''سنو، میرے امرائے مملکت، میرے پاس سلیمان بن داؤد کا مکتوب آیا ہے ۔ اس میں ہدایت ہے کہ میں سرکشی ترک کر کے ان کے خدا کی اطاعت کروں ۔ مجھے اپنے صائب مشوروں سے آگاہ کرو، اس بات پر گفتگو کرو ۔'' بلقیس ہواداان میں اس ہدہد کی موجودگی محسوس کر چکی تھی ۔ اس نے پہلے بھی ایک بار اسے اسی ہواداان میں موجود پایا تھا ۔ وہ ان افواہوں سے بھی آگاہ تھی کہ سلیمان بن داؤد جانوروں کی بولی سے واقف ہے ۔ اسے شبہ تھا کہ ممکن ہے یہ ہدہد ہی اس کی خبر سلیمان بن داؤد تک لے گیا ہو ۔

شاہی درخواست بھی حکم نامہ ہوا کرتی ہے، اسے محض مشاورت کے لفافے میں بند کر کے پیش کیا جاتا ہے ۔ اس کے امرا، کہ اپنی ملکہ کے مطیع وفرمانبردار تھے، یک زبان بولے :

''ہماری جان و مال آپ پر قربان ۔ ہم بہت زور آور جنگجو ہیں ۔ ہم لشکروں کو کھیت کرنے اور فیل و اسپ کو مطیع کرنے پر قادر ہیں ۔ سلیمان کو اس گستاخی کی سزا دے سکتے ہیں ۔ دن کے پورے آفتاب کی قسم ہم اسے شکست دے سکتے ہیں ۔ لیکن ملکۂ عالیہ عاقل و دانا ہیں، آپ کا فیصلہ ہماری رہ نمائی کرے گا ۔'' اس زمانے کے درباری بھی آج کے درباریوں سے مختلف کب تھے ۔ اپنے بچاؤ کا پہلو بھی موجود رکھتے ۔

ذہانت اور بہادری کے اس مظاہرے سے ثابت ہوگیا کہ یہ امرا واقعی اپنے عہدوں کے اہل تھے ۔ ملکہ کی پیشانی پر تفکر کا جال بچھ گیا ۔ کچھ دیر کے لیے دربار پر خاموشی چھائی رہی ۔ اس خاموشی کا اختتام طبل جنگ سے بھی ٹوٹ سکتا تھا ۔ وہ ہدہد بھی کوئی آواز نکالے بغیر دم سادھے بیٹھا تھا ۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ گویا ہوئی ۔

''یہ بادشاہ جب کسی خطے میں وارد ہوتے ہیں تو وہاں فساد پھیلاتے ہیں، قتل و غارت گری کرتے ہیں، عزت داروں کو ذلیل کرتے ہیں ۔ آپ سب اس دربار کی عزت ہیں ۔ ہم آپ کی جرات و وفاداری سے خوش ہوئے، لیکن شاید بہتر طریقہ یہ ہو کہ ہم پہلے سلیمان بن داؤد کو تحائف نذر کریں، جس سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور

دل نرم پڑ جائے۔ یوں اس معاملے میں آئندہ اقدام کا فیصلہ بھی ان ہی کو کرنا پڑے گا۔ اگر وہ باز نہ آئے تو تاریخ انھیں ہی موردِ الزام ٹھہرائے گی۔"

ان کھنڈرات میں بھٹکتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ کسی زمانے کی شان و شوکت، تمول و اقتدار کی ان آثار میں اب صرف بازگشت ہی سنی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ نیم منہدم دیواریں، پتھر سے تراشے بلا جوڑ دیو ہیکل ستون، محرابوں پر نقش کاری سب اس عظمت کی گواہی دے رہے تھے : "یہاں دربار عام ہوا کرتا تھا" ہمارے گائیڈ نے ہمیں یاد دلایا۔ صرف میں ہی نہیں، میرے ساتھ سیاحتی گروہ کے دیگر نو افراد بھی اس کے سحر میں گرفتار تھے۔ ہم ان قدیم بازاروں میں پھر رہے تھے گدھوں کی پشت پر سامان لدا تھا، اجنبی چہرے، اجنبی لباس، کہیں لوہار گڑنے کی آواز تھی، کہیں پیتل کوٹا جا رہا تھا، سائبان کھنچی دکانوں کے سامنے تھیلوں میں لوبان، میوہ جات، جو، باجرہ، مکئی اور گندم کے تھیلے تھے، دکان داروں کی چیخ و پکار، وہاں ایک خالی جگہ کے سامنے ایک چبوترے پر کوئی قصہ گو اپنے اطراف سامعین کا دائرہ بنائے فصاحت کے دریا بہا رہا تھا۔ زیادہ تر افراد بے مقصد پھر رہے تھے ایک ہی چادر سے بدن ڈھانپا ہوا، برہنہ شانے اور پاؤں میں بنی ہوئی پاپوش۔ عورتوں کے ماتھے پر کہیں ماتھا پٹی تھی، کہیں گردن کے گرد موٹے دانوں کی مالائیں، غزال آنکھیں سرمے سے اور نمایاں، پرکشش ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ جیبوں میں رکھ لیے کہ کہیں متجسس انگلیاں انھیں چھو نہ لیں، لمس کی گستاخی نہ کر بیٹھیں۔ تصور شہریوں کا ایک از دحام دیکھ رہا تھا، کھوے سے کھوا چھلتا چھو کر محسوس کر رہا تھا۔ مرورِ ایام نے ان عظمتوں کو مٹی کر دیا تھا۔ میرا پیر ایک پتھر سے ٹکرایا تو میں چونک گیا۔ "سنبھل کر صاحب،" گائیڈ نے فہمائش کی۔ واقعی خطرہ تھا کہ ہماری ٹھوکر سے تاریخ کے کسی ورق کا حلیہ بدل سکتا تھا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ کی، مجھے دیر ہو چکی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہم ایک زمین پر بنے دائرے کو دیکھ آئے تھے، جس پر عجیب سے حروف کندہ تھے۔ مرکزی شہر میں ایسے دائرے شاید ساعتوں کو قید کرنے کی اولین کوشش تھے، یا سورج دیوتا کے عکس ابھارے گئے تھے۔ لیکن اس وقت تو میری گھڑی یہ بتا رہی تھی کہ مجھے اپنے دوست کی شادی میں پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ میں کمپیوٹر پروگرامنگ کی ایک کمپنی میں ملازمت کی وجہ سے یہاں دیارِ غیر میں مقیم تھا۔ ان دنوں والدہ بھی میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔ انھیں آثار قدیمہ سے بہت دلچسپی تھی، ان کی کشش اور پھر دیرینہ دوست کی شادی انھیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ خیر ابھی بہت دیر نہیں ہوئی تھی۔ یہ میری دوسری غلطی تھی۔ میں بڑے شہروں میں ٹریفک کا از دحام بھول گیا تھا۔

یہ بہر حال ایک دیرینہ دوست کی شادی کا معاملہ تھا۔ کیوں کہ میں خود ابھی تک کنوارا تھا تو میری والدہ کو بھی دیارِ غیر میں ایشیائیوں کی ہر تقریب اِندر کا دربار لگتی۔ اس موقع پر یہ مسلمان خاتون جو اپنے مذہب کو

مضبوطی سے تھامے ہوئے تھیں، ہندو صمیات کے استعارے پر بھی بدمزہ نہ ہوتیں۔لہٰذا دیر ہوئی ہو یا نہیں، ان کا اصرار تھا کہ میں ضرور جاؤں بلکہ وہ خود بھی تیار تھیں۔محسن کا ہمارے گھر بچپن سے ہی آنا جانا تھا، میری والدہ اس سے بہت مانوس تھیں۔وہ بھی دھمکی دے گیا تھا کہ ''اگر آپ نہ آئیں تو بارات واپس جائے گی۔'' سمندر پار پلنے بڑھنے کے باوجود، بھلا ہو پالی وڈ کی فلموں کا کہ ہم ان فقروں کی ثقافتی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔وہ تو ہنس کر بولا، مگر میری والدہ نے اسے پیار سے تنبیہ کی: ''نہیں بیٹا، ایسی باتیں مذاق میں بھی منہ سے نہیں نکالتے۔''

ہم شادی ہال میں پہنچے تو رونق پورے عروج پر تھی۔ایک وسیع ہال کی چھت کو چوبیس ستونوں نے سہارا دیا ہوا تھا۔اس میں بیک وقت ہزار مہمان تو ضرور بیٹھ سکتے تھے۔اپنی تعویق کے باعث ہم بارات میں تو شریک نہیں ہو سکے تھے محسن پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا اور اسٹیج پر براجمان تھا۔ہال کی چھت رنگ برنگی روشنیوں سے آراستہ تھی۔اطراف کی دیواروں میں بھی مشعل کی شکل کی روشنیاں دو، دو کے جوڑوں کی شکل میں نصب تھیں۔میرا دھیان بے ساختہ ان آثار قدیمہ کے ایوان کی جانب چلا گیا۔پورا ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔محسن اس وقت اسٹیج پر تنہا تھا، اس کے دائیں جانب صرف اس کا چھوٹا بھائی بیٹھا تھا۔دو قدمچے چڑھ کر اسٹیج پر قالین بچھا تھا، جس پر اونچی پشت کی دو کرسیاں رکھی تھیں۔نکاح صبح ہی مقامی مسجد میں ہو چکا تھا۔اب وقت محسن کی بیوی صائمہ کے انتظار میں رکا ہوا تھا۔میں محسن کی جانب بڑھا تو اس کا چہرا کھل اٹھا۔اس نے اپنے بھائی کو سرکا کے مجھے اپنے برابر میں بٹھا لیا۔ہال میں دونوں جانب کرسیاں لگی تھیں، درمیان میں کیمرہ مین ان لمحات کو محفوظ کر رہا تھا، اور ناظم تقریب چٹکلوں سے وقت کو بہلا رہا تھا۔اچانک مائیکروفون پر اس کی آواز گونجی: ''باادب، باملاحظہ، خواتین و حضرات اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر دلہن کا استقبال کیجیے۔'' تمام نگاہیں اس جنوبی دروازے کی جانب پھر گئیں جہاں سے دلہن کا جلوس داخل ہو رہا تھا۔میں صائمہ بھابی سے پہلے بھی مل چکا تھا۔وہ اپنی دوستوں اور والدہ کے ساتھ نمودار ہوئیں۔میں نے ان کے دائیں جانب چلتی لڑکی کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔اس نے سیاہ تلواں جوڑا پہن رکھا تھا۔گوکھرو کے جال کا غرارہ، اور رکلابتوں کی زری کا بلاؤز، اس کا حسن کسی زیور کا محتاج نہیں تھا۔پھر بھی اس نے موقع کی مناسبت سے کانوں میں دوملتانی جھمکے اور ایک جڑاؤ گہنا گلے کی زینت بنا لیا تھا۔اس کے ہاتھوں کی پور پور میں لاہور سے منگوائی مہندی رچی تھی۔سیاہ کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، کسی ملکہ سے کم تو نہیں لگ رہی تھی۔شاید میری نظروں کی تمازت محسوس کر کے، اس نے نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔مجھے لگا اس کے چہرے پر استہزائی تاثرات بکھر گئے تھے۔شاید اس طرح میرا تسلسل سے دیکھنا اسے ناگوار لگا تھا۔دلہن اور اس کی معیت میں چلنے والی لڑکیوں کی آرائش، زیبائش اور ملبوسات سے بالکل یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم برصغیر کی کسی شادی کا منظر نہیں دیکھ رہے۔یہ جلوس قریب آیا تو

محسن نے قد مچے تک جا کر صائمہ بھابی کا ہاتھ پکڑا اور اسے اوپر چڑھنے میں مدد دی۔ میں وہاں سے ہٹ کر محسن کے اعزا کے لیے جگہ خالی کرنا چاہتا تھا، مگر اس نے ہاتھ دبوچ کر زبردستی مجھے اپنے برابر میں بٹھا لیا۔ محسن کی والدہ نے بھی گلے لگا کر مجھے پیار کیا اور بولیں "اس کے ساتھ ہی رہو بیٹا تو ذرا اس کی وحشت کچھ کم ہو۔" محسن کے والد اس ملک میں سفارت خانے میں اکاؤنٹنٹ کی ذمہ داریاں سنبھالنے آئے تھے، مگر محسن اپنے باپ کے سائے سے لڑکپن میں ہی محروم ہو چکا تھا۔ وہ لڑکی بھی لگتا تھا صائمہ بھابی کی قریبی دوست تھی کیوں کہ اسے بھی ان کے برابر میں ہی جگہ دی گئی تھی۔ میں باتیں تو محسن سے ہی کر رہا تھا مگر میری نگاہیں ہر تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے کا طواف کرنے لگتیں۔ میری کوشش ہوتی کہ اس کے دیکھنے سے پہلے ہی اپنی نگاہیں ہٹالوں مگر یہ بات محسن سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ "بلقیس نام ہے، صائمہ کی بچپن کی سہیلی ہے، ابھی شادی نہیں ہوئی۔" آخری جملہ اس نے زور دے کر معنی خیز انداز میں ادا کیا۔

"بکومت،" اپنی خفت چھپانے کے لیے میں بلاوجہ ہی سنجیدہ ہو گیا اور مخالف سمت میں دیکھنے لگا۔ محسن نے جھک کر صائمہ بھابی کے کان میں کچھ سرگوشی کی، تو انھوں نے میری جانب دیکھا اور شرارت سے ہاتھ اٹھا کر مجھے آداب کیا۔ ان کا ہاتھ ضرورت سے محض ایک لمحے زیادہ ان کی پیشانی پر رکا رہا۔ جو کچھ ہو رہا تھا بلقیس اس سے ناواقف نہیں تھی۔ لیکن اپنا وقار برقرار رکھنے کے لیے اس نے تجاہلِ عارفانہ کو ہی غنیمت جانا۔ اب میں مکمل بوکھلا چکا تھا، نہ چاہنے کے باوجود بہتر یہی سمجھا کہ اس وقت وہاں سے اٹھ جاؤں۔

رات اترنے سے پہلے، والدہ تک میری دلچسپی کی خبر پہنچ چکی تھی۔ دوسرے دن محسن شادی کی تمام مصروفیات کے باوجود والدہ سے فون پر تفصیلی گفتگو کر رہا تھا۔ مجھے سازش کی بو تو آ رہی تھی، مگر اس سازش پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ طے یہ ہوا کہ ویسے میں صائمہ بھابی میرا اور امی کا بلقیس اور اس کی امی سے بظاہر ایسے ہی رسماً تعارف کرائیں گی محسن کے بچپن کے عزیز دوست کی حیثیت سے۔

میں اور بلقیس ایک چینی ریسٹورانٹ میں رات کے کھانے پر ملے۔ میں نے لاکھ پیش کش کی کہ اسے اس کے گھر سے لے لوں، مگر وہ خود ہی ریسٹورانٹ پہنچنے پر بضد رہی۔ لیکن اس نے مجھے انتظار نہیں کرایا۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی پہنچے تھے۔ آج وہ اپنی سادگی میں اور زیادہ حسین اور باوقار لگ رہی تھی۔ شانوں تک کٹے سیدھے، سیاہ بال سلیقے سے جمے تھے۔ تنگ موری کے پاجامے پر کڑھائی ہوا کرتا عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ چینی ریسٹورانٹ شاید ایک مخصوص ذائقے اور لذت کا دنیا بھر میں سب سے طویل سلسلہ ہے، اپنی معاشرت سے روشناس کرانے کا ایک انوکھا طریقہ۔ توسیع پسندی ان کے مزاج میں نہیں تھی ورنہ ایک زمانے میں ان کے بحری بیڑے بھی اس بات پر قادر تھے کہ ریسٹورانٹ کے بجائے چھاؤنیاں آباد کرتے، اور اپنے نوآبادیاتی نظام

کا ہراول دستہ بنتے۔ خیر، ہم دونوں نے وقت ضائع نہیں کیا اور مینو دیکھے بغیر ہی آرڈر دے دیے۔ فون پر بات کر لینے سے اجنبیت کی گھبراہٹ پہلے ہی دور ہو چکی تھی۔ وہ بظاہر بہت پرسکون تھی، میں اس کے سحر میں مکمل گرفتار ہو چکا تھا۔ ہم محسن اور صائمہ کی باتیں کرتے رہے، ان کی شادی کے دلچسپ مواقع پر ہنستے رہے۔ ہم نے اپنی ذات کے علاوہ ہر چیز کے بارے میں بات کی۔

''آپ کیا کام کرتے ہیں؟'' بالآخر اس نے ایک مصنوعی لاعلمی سے سوال کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری پیدائش سے آج تک ہونے والے ہر معاملے کے بارے میں صائمہ بھابھی سے کرید کر پوچھ چکی ہے۔

''میں گوگل کے لیے پروگرام لکھتا ہوں،'' مجھے اپنے لہجے میں پوشیدہ فخر پر شرمندگی ہوئی۔ شاید اپنی ممکنہ مادہ کو متاثر کرنے کا حیوانی جذبہ ہم اس تمام تہذیبی ملمع کے باوجود خمیر سے نہیں نکال سکے تھے۔

''ارے واہ، یہ تو بہت دلچسپ کام ہو گا؟'' اس نے میرے لہجے میں کچھ محسوس بھی کیا تھا تو اس کا اظہار نہیں کیا۔

''ہاں، یہ دیکھیں،'' میں نے اپنا سیل فون نکال کر اس پر ایک نیا پروگرام دکھایا، جو ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ ''تجارتی وجوہات کی بنا پر یہ ابھی بہت راز میں ہے۔ اس کے ذریعے آپ کہیں بھی بیٹھ کر ایک ہی وقت میں بہت سے افراد سے ایک ساتھ بات کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی انھیں دیکھ بھی سکتے ہیں،'' میں نے انکشاف کیا۔

''اتنا خفیہ اور آپ نے مجھ پر اعتماد بھی کر لیا!'' وہ متاثر نظر آئی تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔

''روابط کی دنیا میں یہ تہلکہ مچا دے گا۔ ہزاروں میل دور افراد آپ کو دیکھ سکتے ہیں اور بات بھی کر سکتے ہیں،'' میں اپنی دھن میں ایسے رواں تھا جیسے کوئی بچہ اپنے والدین کو نئے سیکھے ہوئے کرتب دکھا کر متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہم بہت دیر کمپیوٹر کی حشر سامانیوں پر بات کرتے رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بینک میں ملازم تھی، لہٰذا میں نے اس موضوع کو چھیڑ کر وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے گزشتہ دنوں ایک ہولوگرام کا مظاہرہ دیکھا تھا، جس میں کسی کی شبیہ آسمان پر ایسے دکھائی جا سکتی تھی جیسے وہ واقعی وہاں موجود ہو۔ یہ ایک خوشگوار شام تھی۔ میری والدہ پہلے ہی یہ خواہش ظاہر کر چکی تھیں کہ ہم دونوں کی ملاقات کے بعد وہ خود بلقیس کی امی سے اس رشتے پر بات کریں۔ انھیں اپنی ثقافتی روایات بہت عزیز تھیں۔

سلیمان بن داؤد کے پاس ملکہ بلقیس کے تحائف پہنچے تو وہ بہت ناراض ہوئے:

''کیا تم ان دنیاوی مال و مدون کے بل پر اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ یہ تحائف لے کر اسی کی جانب لوٹ جاؤ۔ اپنی ملکہ کو دعوت دو کہ وہ ہمارے خطے کا دورہ کرے، صراطِ مستقیم پر چلے، ورنہ ہم اس پر لشکر کشی

کریں گے۔"ملکہ بلقیس کے سفیر اپنے تحائف کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔سلیمان بن داؤد اپنی رعایا سے مخاطب ہوئے:

"کوئی ہے جو اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا تخت مجھے یہاں لادے۔ہم اسے اپنی قدرت سے متاثر کرسکیں۔"جنوں میں سے ایک عفریت بولا: "میں امین ہوں اور اس بات پر قادر کہ اس سے پہلے کہ آپ اپنی اس محفل سے اٹھیں، میں تخت سبا سے یہاں اٹھا لاؤں۔" جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ بول اٹھا" آپ کی پلک جھپکنے سے بھی پہلے میں وہ تخت آپ کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔"سلیمان نے تخت اپنے پاس پایا تو بہت خوش ہوئے اور بولے کہ"اس تخت میں کچھ تبدیلی بھی پیدا کرو تاکہ ہم دیکھیں کہ کیا وہ اسے پہچان بھی سکتی ہے۔"

ملکہ بلقیس سلیمان بن داؤد کے ہیکل میں داخل ہوئی تو وہ اس کے حسن سے دنگ رہ گئے، خدا کی صناعی کے قصیدہ گو ہوئے۔ملکہ بلقیس کے لیے بھی سلیمان بن داؤد کے رعب و مرتبے کے سحر سے نکلنا دشوار تھا۔جب وہ دربار میں داخل ہوئے تو سلیمان نے دریافت کیا" کیا اس نے پہلے کبھی ایسا تخت دیکھا ہے؟"

"یہ گویا وہی ہے جس پر بیٹھ کر ہم حکومت کرتے ہیں۔ہمیں پہلے ہی علم ہوگیا تھا کہ ہمارا تخت غائب ہوگیا ہے۔"

سلیمان کو اس جواب کی امید نہیں تھی، ذرا خفیف سے ہوئے۔تخت کی جانب بڑھتے ہوئے ملکہ بلقیس کو دھوکہ ہوا کہ شاید یہ حوض ہے، اور اس نے اپنے پائینچے اٹھا کر پنڈلیاں کھول دیں۔سلیمان بن داؤد کا اطمینان بحال ہوا، بولے،"یہ آبِ مصفا نہیں شیشے کا فرش ہے۔"اب بلقیس خفت سے مسکرائی اور بولی،"میں سورج کی پرستش ترک کرکے آپ کے خدا پر ایمان لائی اور آپ کی دعوتِ زوجیت قبول کی۔"

مجھے دفتر سے اٹھنے میں ذرا دیر ہوگئی۔والدہ کا دو دفعہ فون آچکا تھا کہ" کب پہنچ رہے ہو؟"انھیں صرف یہ جلدی تھی کہ میں محسن سے فون کرکے دریافت کروں کہ کیا اب وہ بلقیس کی امی سے بات کرسکتی ہیں۔انھوں نے مجھے کھانا بھی نہیں کھانے دیا، اصرار تھا کہ پہلے فون کروں۔فون صائمہ بھابی نے اٹھایا۔میرے دریافت کرنے پر وہ بولیں،"بھائی آپ محسن سے خود ہی بات کرلیں۔" مجھے اس پر بھی کوئی شبہ نہ ہوا۔محسن نے ذرا تامل سے فون لیا اور بنا کسی علیک سلیک کے مجھ پر برس پڑا"یار مجھے تم سے اس حماقت کی امید نہیں تھی۔لگتا ہے میری ساری تربیت ناکام رہی"اس نے ایک بناوٹی قہقہہ لگایا۔

"ارے میں نے کیا کردیا؟"میرا لہجہ مدافعانہ ہوگیا۔یہ وہ جواب نہیں تھا جس کی میں امید کررہا تھا۔

'وہ کہہ رہی تھی کہ تم بس اسے متاثر کرنے کے چکر میں لگے رہے۔اس سے یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ کیا کام کرتی ہے؟'۔

'لیکن یار یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کام کرتی ہے، کیا پہنتی ہے، کس سے ملتی ہے، اسے کیا پسند ہے، پھر

اس سے پوچھ کر کیوں وقت ضائع کرتا؟' میں خفیف ہوگیا، مجھے خود اپنی دلیل کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔

'گدھے، اسے بھی تو معلوم تھا کہ تم کیا کرتے ہو، کس سے ملتے ہو، کیا کھاتے ہو۔ تم نہ کرتے تو وہ تمھاری پسند کا چائنیز آرڈر کر دیتی۔ اسے اتنی تفصیل معلوم تھی۔ پھر بھی اس نے تم میں دلچسپی لی، تم سے سوالات کیے، تمھیں اہمیت دی۔ تم اسے متاثر کرنے کے چکر میں بھول گئے۔ کم از کم اب بلقیس وہ نہیں رہی،' اس کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

'بھائی دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ چلو غم نہ کھاؤ، صائمہ کی ڈھیروں سہیلیاں اس سے زیادہ خوبصورت، لائق و فائق ہیں، تو نہیں اور سہی'' میرا دوست مجھے بہلا رہا تھا، اور میں ارتقا کو کوس رہا تھا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر وفا یزدان منش
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف تہران

ٹوٹے ہوئے رشتے

مجھے جھٹکا سا لگا؛ 'آخر کیوں، میں؟'

'کیوں کہ یہ صرف تم ہی سے ہو پائے گا'۔

'کیا میں انسان نہیں ہوں؟! کیا مجھے بھی آپ لوگوں کی طرح اِس راز سے پردہ اٹھانے سے خوف نہیں آتا؟'۔

'خوف ہم سبھی کو آتا ہے، یہ بھی سب کو پتا ہے کہ تم کہو یا ہم میں سے کوئی اور کہے، بہر حال اس کو ذہنی اور نفسیاتی صدمہ بہت ہوگا، تم کو پھر بھی طریقے سے بات کرنا آتا ہے۔ تم ہی سے صدمے کی شدت کم ہو سکتی ہے'۔

'امی جان! خدا را!، مجھ میں طاقت نہیں ہے، مجھ سے نہیں ہو پائے گا، سچ بولوں اس بے چاری کا دم گھٹ جائے گا، اگر ذرا بھی جھوٹ بولوں تو وہ اور زیادہ الجھے گی۔ ان برسوں میں اس کی آنکھوں میں غم ہی غم دیکھنے کو ملے ہیں، اس کو مزید دکھانے سے گویا پتھر والا دل بھی پگھل جائے گا۔ اس کو بھائی خود کیوں نہیں سمجھاتے ہیں؟ مہوش خود اس راز سے پردہ کیوں نہیں اٹھاتی ہے؟ آخر اس مسئلے میں میری حیثیت کیا ہے؟ میرا اس واقعے میں کیا دخل ہے؟'۔

'تم پاگل بنی ہوئی ہو کیا؟! سلمان کہے تو کیا وہ یقین کرے گی؟، یہ سوچ کر کہ سلمان اپنے حق میں ثبوت دے رہا ہوگا تو اس کی بات پر بھروسہ نہیں کرے گی۔ مہوش کیا کہے گی! کیا وہ اپنے آپ کو قصوروار مانے گی؟! سب کو معلوم ہے کہ تم ہمیشہ سچ بتاتی ہو، چلو بیٹی! یہ الجھاؤ اب تم ہی ختم کرو'۔

'امی جان! قصور کسی کا نہیں تھا! بس ایک معصوم سی بچی کی آنکھوں میں دکھ گڑ نا تھا اور بس'۔

'تبھی تو کہتی ہوں کہ یہ کام تم ہی کر سکتی ہو، جو ہوا، وہی بتاؤ! اور دھیان رکھنا، ہمیشہ کی طرح عورتوں کی خواہ مخواہ حامی نہ بننا، اس کو سمجھاؤ کہ اس کے ابو کی مجبوری تھی۔ خون کا معاملہ تھا'۔

'مجھے بتانا ہوا تو میں سچائی کے سوا کچھ نہیں کہوں گی، مجبوری کس کی تھی اور کس کی ہے، وہ خود ہی فیصلہ کرے گی'۔ امی کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر میں نے اپنی بات چبا چبا کر کر دی۔ میرے اندازے کے برعکس امی نرمی سے بولیں:

’حقیقت میں جو کچھ ہوا وہی بتاؤ، یہی بہت ہے کہ وہ خود سمجھدار ہے، وہ خود ہی فیصلہ کرلے گی‘۔

*****

منگل کا دن آیا، یہ دن کتنا منحوس ہے! شیما میرے سامنے بیٹھی اپنی موٹی موٹی کالی کالی آنکھیں مجھ پر جمائے مجھے تکتی جا رہی ہے، میں بات ٹال رہی ہوں، میں اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھتی، اس کی مصروفیات کے بارے میں پوچھتی! اس کی من پسند سرگرمیوں کے بارے میں پوچھتی ہوں لیکن وہ چپ چاپ صرف مجھے دیکھتی جاتی۔ آخر تنگ آ کر وہ آخری ضرب لگاتی ہے:

’پھوپھی جان! اگر جواب نہ ملا تو پڑھائی کا نام تک نہیں لوں گی‘۔

ذہین لڑکی ہے، چودہ سال سے اس کو چکر دے رہے ہیں، ایک ہی بات کو گھما پھرا کر دہراتے رہے ہیں کہ تم اس بات کو چھوڑ دو، ان کا مسئلہ ایسا ہی ہے جیسے بعض دفعہ میاں بیوی کی آپس میں نہیں بنتی ہے، تمھارے ماں باپ کا بھی ایسا ہی معاملہ ہوا لیکن اب وہ بڑی ہوگئی ہے اور اپنی بات پہ ڈٹ جاتی ہے، سنا ہے اپنے ننھیال والوں کے یہاں بھی کسی سے بولتی ہے نہ کسی کی بات سنتی ہے، پچھلے دو ہفتے سے اپنے ابو سے بھی فون پر بات نہیں کرتی، بھائی نے اس کو باہر اپنے پاس بلایا ہے تو وہ کہتی ہے جب تک امی ابو کے بیچ میں ترک تعلق کی وجہ معلوم نہ کرلوں تو میں یہاں سے نہیں ہلوں گی۔

’اچھا ٹھیک ہے آج ہی سب کچھ سناؤں گی تمھیں۔ مگر اس سے پہلے تم وعدہ کرو کہ میری باتوں کے بیچ میں نہیں بولی گی جب میری ساری بات تم سن لو پھر تم خود سوچ سمجھ کے فیصلہ کر لینا اور کسی کو بھی برا بھلا نہ کہنا اور ہاں کسی کو بھی اِن باتوں کے بارے میں نہ بتانا اور کسی کو مذمت کا نشانہ بھی نہ بنانا‘۔

وہ الفاظ کھینچتے ہوئے سنجیدہ نگاہوں سے ملتمسانہ بولی ’سنائیں پلیز، کیوں ابو ہمیں چھوڑ کر دور چلے گئے؟‘۔ اس کی آنکھوں میں نمی بھر آئی، اس نے دبی ہوئی آواز سے پوچھا : ’کیوں کسی نے ان کو نہیں روکا؟ کیوں ایک دفعہ بھی پلٹ کر نہیں آئے؟‘۔

دیکھو میری جان! آپ کے اِس سوال کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا جواب چودہ پندرہ سال پہلے پر منحصر ہے۔

اچانک وہ ان کہی باتیں زبان پر لا کر بڑبڑانے لگی: ’جی! پچھلے چودہ سال سے میں نے ابو کو صرف کیمرے میں ہی دیکھا ہے! ان کے محبت سے بھرے ہاتھ سے محروم رہی ہوں! کتنا جی چاہتا ہے کہ دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے ابو کے ہاتھ ہاتھ تھامے ہوئے میں ٹہلوں! کتنا جی چاہتا ہے، دوسروں کی طرح پوری فیملی کے ساتھ رشتہ داروں کے گھر جاؤں، سفر پر جاؤں۔ بارہ سال سے ماں کو بے چین دیکھ رہی ہوں جب ابو سے

ویڈیو کال پر بات ہوتی ہے امی کبھی کبھی جھجھکتی ہوئی بیچ میں ابو کی ایک جھلک دیکھنے میرے ساتھ ہوتی ہیں تو ابو کسی بہانے سے بات چیت ختم کر دیتے ہیں۔ابو پیارے پیارے کپڑے،کھلونے اور پڑھنے لکھنے کی چیزیں بھیجتے رہے ہیں، ان کو کبھی میں نے ناراض نہیں کیا ہے کہ مجھے یہ چیزیں نہیں چاہییں، فقط ابو کے ساتھ رہنے کی خواہش رہی ہے، میں نے اپنی محرومیاں سینے میں چھپا کر رکھی ہیں اور کبھی منہ پر شکایت آنے کا موقع نہیں دیا ہے اب وہ مجھے بلا رہے ہیں کہ میرے پاس آؤ! میں پہلے یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آخر یہ سب کیوں ہوا ہے؟'

اچھا ٹھیک ہے، یہ جو تم اپنا حق سمجھتی ہو اور یہ سوچتی ہو کہ اگر تمھیں جواب مل گیا تو تمھاری ساری الجھنیں ختم ہو جائیں گی، چلو میں تمھاری مدد کرتی ہوں۔مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا جو ہم سوچتے ہیں جو کچھ ہوا، میں ایک کہانی کے روپ میں تم کو سناتی ہوں البتہ اس میں جتنے کردار ہیں ان کو اپنا مت سمجھنا۔بہترین فیصلہ اسی وقت ہوتا ہے جب ہم کسی واقعے کو اپنی زندگی کے دائرے سے نکال کر پرکھیں اور اس سے اتنے دور چلے جائیں کہ اس سے کوئی تعلق محسوس نہ کیا جائے، پھر اس کو خوب دیکھیں، اس کو پرکھتے ہوئے سوچیں اور ہر کردار کی صورتحال سمجھنے کی کوشش کریں۔اس لیے کرداروں کے نام بدل کر میں آپ کو ایک کہانی سناتی ہوں۔۔۔۔
چودہ پندرہ سال پہلے کی کہانی۔۔۔

اس نوجوان بیٹی کو صدمے سے نجات دلانے کے لیے یہی بات سوجھی کہ نام بدلتے ہوئے اس کو اِس راز سے آگاہ کروں، ورنہ میں کیسے اس کے عزیزوں کے نام کہہ کہہ کر سچی کہانی سنا سکتی تھی اور اسی طرح کہ جیسا میں نے اس کو بتایا، یہی زیادہ مناسب لگا کہ وہ اپنے ماں باپ کی جگہ دوسرے کرداروں کے نام پر واقعات سن لے کہ شاید اس کے جذبات کا بہاؤ کم رہے اور وہ ہر چیز کو صحیح پرکھ سکے۔

ان دونوں کی پسند کی شادی ہوگئی۔ان کے درمیان عشق کے بندھن کو دونوں کے خاندانوں نے تہہ دل سے مان لیا۔وہ کسی کو بھی ایک دوسرے کے خلاف کچھ نہیں بولنے دیتے تھے۔جب ان کی چاند جیسی بیٹی پیدا ہوئی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ اپنی محبت کو مضبوط جاننے لگے۔شایان کے علاوہ نوشین بھی جاب کرتی تھی، دونوں کا الگ الگ آفس تھا۔نوشین اپنی کمائی گھر کے اخراجات میں لگایا کرتی تھی۔شایان کے ابو کھاتے پیتے تھے، انھوں نے ان دونوں کو رہائش کے لیے اپنا ایک الگ مکان دیا، گاڑی بھی دی، مختلف اوقات میں ان کو گھر کے اخراجات میں مدد کیا کرتے تھے۔دادا، دادی، نانا اور نانی سب کی طرح اپنی پوتی اور نواسی سے بہت پیار کرتے تھے۔کہتے ہیں کہ اولاد کی اولاد، اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہے اور اس کے لیے یہ کہاوت زیادہ کہی جاتی کہ اولاد بادام ہے اور اس کی اولاد بادام کی گری ہے۔ندیا ایک سال کی ہوگئی تو نوشین کی دفتر سے چھٹی بھی ختم ہوتے ہی وہ اپنی جاب پہ جانے لگی۔ندیا صبح سے عصر تک دادا اور دادی کی گود میں پلتی بڑھتی جا رہی تھی۔ندیا

تین سال کی ہوگئی۔آہستہ آہستہ خوشیاں کروٹ بدلنے لگیں۔نوشین آفس سے واپس آ کر بھی اپنی بیٹی کو سسرال والوں کے گھر سے لینے نہیں آتی تھی۔ندیا صرف سونے کے لیے اپنے گھر جاتی تھی۔ندیا کی پھوپھی ہوشیار عورت تھی، یہ حالات دیکھ کر وہ گھبرائی کہ ایسا ممکن نہیں کہ ایک ماں اپنے بچے سے اتنے گھنٹوں تک دور رہنے کے باوجود مزید بھی اس جدائی کو برداشت کر سکے، عام طور پر مائیں جو معاشرتی مصروفیات رکھتی ہوں اپنے بچے دیکھنے کے لیے ترستی ہیں۔پھوپھی نے ایک دفعہ نوشین سے پوچھا کہ لگتا ہے ندیا آج کل پہلے کی طرح ہنس مکھ نہیں رہتی، اگر آپ کہیے جب آپ گھر آئیں گی میں خود اس کو آپ کے پاس چھوڑ دوں گی۔مگر نوشین نے انکار کر دیا کہ جب گھر آتی ہوں تو بہت مصروف رہتی ہوں اور آج کل آفس کا کام بھی بہت زیادہ بڑھ گیا ہے میں دیر سے گھر واپس آتی ہوں۔شایان خود واپسی پر ندیا کو لیتے آئیں گے۔پھوپھی نے جب اس بات کا کوئی فائدہ نہ دیکھا تو بنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جب نوشین واپس آتی ہے تو ندیا کو اپنی ماں تک پہنچا دیجئے گا۔ اگر ایسا ہوتا رہا تو ندیا کو نفسیاتی نقصان ہوگا مگر کوئی اس کی بات ماننے پر تیار نہیں تھا بلکہ الٹا دادی نے اس کو ڈانٹا کہ نوشین بیچاری تھکی ہوتی ہے پھر ندیا کا صحیح خیال نہیں رکھ سکتی اور گھر کا کام بھی مزید اس کو تھکا دیتا ہے۔بات یہیں ختم نہ ہوئی۔نوشین پہلے سے بدلتی جا رہی تھی، عجیب عجیب قسم کے کپڑے پہننے شروع کیے، ہر وقت اپنے موبائل پر مصروف رہتی تھی۔پھوپھی کو کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ ایسی بدلتی ہوئی کیفیت کی کوئی خطرناک وجہ ہوگی، مگر وہ کس کو بتاتی! اس کا بھائی تو اپنی بیوی پر اتنا بھروسہ کرتا کہ اگر اس کے خلاف ایک بھی لفظ بولا جاتا تو بولنے والے پر شامت آجاتی۔آٹھ مہینے کے بعد چاند بادل کی اوٹ سے باہر نکلا!

شایان کو شک ہوا کہ نوشین زیادہ وقت گھر سے باہر رہنے لگی ہے،بہت سج دھج کر آفس جاتی اور واپسی پر بھی ایسی ہی ہوتی ہے، چھوٹی سی بات پر جھگڑتی ہے، بیٹی کی طرف دھیان دینا بالکل چھوڑ دیا ہے۔اس کا شک مزید بڑھا جب منگل کے دن نوشین موبائل پر بات کر رہی تھی، شایان نے کان لگا کر یہ سنا کہ کوئی ملاقات طے پا رہی ہے۔شایان کو پتا تھا کہ نوشین گٹار بجانا سیکھنے کے لیے آج جانے والی ہے۔نوشین گھر سے نکلتی ہے اور شایان بھی فوراً اس کے پیچھے نکل کر انسٹی ٹیوٹ کے آس پاس پہنچ کر اپنی گاڑی میں بیٹھا رہتا ہے، اس کو معلوم تھا کہ کلاس شروع ہونے میں ابھی کافی وقت ہے۔اس کے باوجود کہ وہ مہینوں سے شک کے تناؤ سے دوچار تھا لیکن پھر بھی اس نے ایسے جھنجھوڑنے والے منظر کا بالکل نہیں سوچا تھا، نوشین کسی لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ٹہلتی نظر آئی، وہ دونوں اپنی گپ شپ میں اتنے ڈوبے ہوئے بے نیازی سے چل رہے تھے کہ نوشین کو شایان کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔نجانے وہ لڑکا کیا بتا رہا تھا کہ نوشین نے اپنی کہنی اسے مارتے ہوئے اپنی ادا سے فرنگی زبان میں کہتی ہے: 'یو آر ویری لولی (Lovely)۔

یہ منظر دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے شایان کی رگوں کا گرم خون پھٹ کر باہر آنے لگا ہو، مشکل سے اپنے پاؤں لٹکا کر جسم کو گاڑی سے باہر نکالا۔ وہ پاؤں گھسیٹتے ہوئے ان کی طرف چل پڑا۔ چند سیکنڈ میں اس کی آنکھوں کے سامنے بیتے ایام کے اوقات فلم کی طرح گھومنے لگے، وہ اپنی زندگی سے خوش تھا، آفس سے واپسی پر دل کی دھڑکنیں سمیٹتے ہوئے گھر جاتا، اپنی حلال کی کمائی کو اپنی چھوٹی سی فیملی کے آرام و خوشی کے لیے لگاتا، وہ خود کو دنیا میں سب سے خوش قسمت آدمی سمجھتا تھا کہ اس کے گھر میں محبت کا رس ٹپک رہا ہے اور اب۔۔۔!

وہ اپنے آپ کو عرش سے فرش پہ گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس کو یہ لگ رہا تھا کہ جیسے سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی سے بھری بالٹی اس کے سر پر کوئی ڈال رہا ہو۔ کچھ بولے بغیر نوشین کے گال پر تھپڑ مارتا ہے، تب نوشین سپنے سے باہر آ کر حقیقت کو جان لیتی ہے! اس کے ساتھ کھڑا ہوا لڑکا، جس سے اس نے دل لگا لیا ہے اور اس کے ساتھ مہینوں سے لگی ہے لیکن اس کے سامنے، اس کا شوہر۔۔۔ گاڑی میں اس کی بیٹھی ہوئی بیٹی۔۔۔ جو مسکراتے ہوئے اپنی ماں کو ہاتھ ہلاتے ہوئے بلا رہی ہے۔۔۔ اس نے اپنی ماں کو تھپڑ مارتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا!۔۔۔ نوشین کو شرم آ رہی تھی یا ڈر کی دنیا اس پر سوار ہوئی تھی!! کیا کہہ سکتی! جھوٹ کیسے بولتی!!! اس منظر کو کیسے مٹا دے۔۔۔! خود کو شدید دباؤ میں محسوس کر رہی تھی، کیسے اس دباؤ سے چھٹکارا حاصل کرے!۔۔۔ اسی تشویشناک منظر نے ایک خاندان کا سارا بندھن توڑ کے رکھ دیا۔

شایان جنون کے عالم میں ہی سہی لیکن ہوش و حواس میں تھا اور اِس طرف متوجہ تھا کہ اگر نوشین اس منظر کا انکار کرے گی تو وہ کیسے ثبوت دے سکے گا! جب اس اجنبی لڑکے نے گردن ٹیڑھی کر کے نوشین سے اپنی گاڑی کی چابی اس کے بیگ سے نکالنے کو کہا، شایان کو مزید گراں لگا کہ وہ اس کی بیوی کا نام بے تکلفی سے زبان پر لاتے ہوئے چابی مانگ رہا ہے!! اِس کا مطلب واضح ہے کہ ایک ساتھ ہی گاڑی سے اترے ہیں اور نوشین نے اس کی چابی اپنے بیگ میں رکھی ہے جیسے میاں بیوی کا آپس میں یہ تعلق ہوتا ہے یا وہ مرد اور عورت جن کا رشتہ بہت قریبی ہو۔ شایان نے غضب سے یہ کہہ کر چابی چھین لی کہ یہ چابی میرے پاس رہے گی تم بعد میں اس کو لینا، اب تم بس یہاں سے چل پڑو۔

نوشین رو پڑتی ہے، چیختی جاتی ہے کہ مجھے معاف کرو! یہ بات کسی کو نہ بتانا میری عزت بچالو، پہلی دفعہ ایسا ہوا، کبھی دوبارہ نہیں ہوگا۔ شایان کا ٹوٹا ہوا غرور اور نوشین کی عزت، ایک دوسرے کے خلاف پہلوؤں میں پھیل رہے تھے۔ شایان یہ سوچ کر کہ کہیں آگے نوشین الٹی سیدھی باتیں شروع نہ کر دے تو وہ ایک شرط لگاتا ہے کہ آج جو کچھ ہوا ہے تم اِس کو لکھ کر دستخط کرو اور پچھتانے کا بھی ذکر کرو۔ پھر بھی شایان، نوشین کے ابو کو ساری کہانی سنا دیتا ہے اور ان کو اس لڑکے کی گاڑی کی چابی دیتا ہے کہ یہ چابی بھی اسی کا ثبوت ہے اور آپ خود یہ چابی اس

شریف زادے کو دے دیں۔ چابی کے ہمراہ، نوشین بھی اپنے میکے میں ٹھہر گئی۔

شایان اپنی فیملی کے سامنے یہ بوجھ دبائے اس بات کو چھپا رہا تھا، آخر اس کی بیوی کا معاملہ تھا، وہ اس کو دوسروں کی نظروں سے گرنے نہیں دینا چاہ رہا تھا، اس کا مردانہ غرور اس واقعے سے پردہ اٹھانے بھی نہیں دے رہا تھا، کئی دنوں تک وہ ایک کٹے ہوئے پر و بال والے پرندے کی طرح تڑپ تڑپ کر بے حال ہوتا جا رہا تھا، وہ خوفناک منظر اس کو اندر ہی اندر سے ختم کر رہا تھا؛ آخر کار اس نے اپنی بہن کو بتا دیا کہ وہ اکیلا اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا۔ حیرت کی بات ہے کہ شایان یہ سب کچھ ہونے کے باوجود نوشین کو کھونا نہیں چاہتا تھا، بس یہ تقاضا کرتا کہ چند دن اکیلا رہنا چاہتا ہے۔ تمنا اپنے بھائی کو بے بس دیکھ کر یہ مشورہ دیتی ہے کہ فی الحال بہترین راستہ یہی ہے کہ آپ دونوں وقتی طور پر الگ رہیں، آمنے سامنے نہ ہوں، اس سکتے کے عالم سے باہر نکلو، پھر فیصلہ کرو، نوشین کو ایک اور موقع دو۔

شایان کے اندر یہ آگ مزید بھڑکتی جاتی اور اس کا تجسس بڑھنے لگا کہ اس ماجرے کی تمام تفصیلات ا سے پتا چلیں۔ پھر ان دونوں کے بیچ میں کئے گئے میسیجز کی تفصیلات موبائل سے نکلوائیں، تصویریں دیکھیں اور بہت کچھ۔۔۔۔ جو نوشین اور اس لڑکے کے درمیان ہوا تھا اس پر مزید انکشاف ہوا لیکن گڑبڑ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نوشین سب کچھ انکار کر دیتی ہے کہ وہ لڑکا میرا کلاس فیلو تھا، ہم دونوں گٹار سیکھ رہے ہیں، کلاس کی طرف جاتے ہوئے ہم راستے میں ملے، اور ایک ساتھ کلاس کی طرف چل پڑے۔ چابی جو ثبوت دینے والی چیز تھی وہ بھی شایان کے حق میں ثابت نہ ہو سکی۔ نوشین کے ابو نے بھی انکار کرنا شروع کیا کہ میں نے کوئی چابی نہیں دیکھی! نوشین کی فیملی کی طرف سے شایان پر یہ الزام لگنا شروع ہوا کہ شایان وہمی ہے۔۔۔ بات دونوں کی فیملی میں پھیل گئی۔ شایان کی فیملی نوشین کو بہو ماننے پر تیار نہیں تھی اور نوشین کی فیملی کی طرف سے اپنی عزت پر چوٹ لگنے پر بے چین تھی! کہتے ہیں دنیا میں سب سے مشکل آزمائش اولاد کی آزمائش ہوتی ہے، نوشین کے ابو اس واقعے سے پہلے تک ایک شریف انسان کے طور پر جانے پہچانے جاتے تھے، مگر اس آزمائش سے سرخرو نہیں نکل سکے۔ وہ حق کو کچل کر اپنی بیٹی کے حق میں فیصلہ دیتے رہے۔ شاید کوئی اور بھی ہوتا تو نوشین کے ابو کی طرح ہی کرتا!

شایان کی امی اور ابو نوشین کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کرنے جا رہے تھے۔ شایان اس بات پر تیار نہیں تھا، ادھر نوشین ابھی اپنے کیے پر پچھتائی تھی اور اپنی غلطی کا بار بار اظہار کر کے معافی مانگ رہی تھی۔ شایان کی بہن نے ان دونوں کے بیچ میں صلح کروانے کی بہت کوشش کی۔ بھائی سے التجا کی کہ امی ابو کی باتوں پر نہ جانا! نوشین کی فیملی نے جو جھوٹ کا اظہار کیا اور سچ پر لکیر ڈالی، یہ ان لوگوں کی مجبوری سمجھو، ان کی

جہالت سمجھو، نوشین کو ایک موقع اور دو! انسان سے خطا سرزد ہوتی ہے، تم خود کہہ رہے ہو کہ نوشین تمہارا پیار ہے، اپنے پیار کو کھونے نہ دو! ندیا کے بارے میں سوچو، اس کی خوشی اور اچھے مستقبل کے لیے بہت کچھ نظر انداز کرنا پڑیگا۔

شایان اور نوشین نے پھر ساتھ ساتھ رہنا شروع کیا، شایان کے کہنے پر نوشین نے اپنی جاب چھوڑ دی، چھ سات مہینے گزر گئے۔ دونوں کی فیملی اپنی بہو اور داماد کے ساتھ ایسا پیش آتے تھے جیسا کچھ ہوا ہی نہیں مگر شایان وہ منظر نہ بھول سکا اور نہ وہ اس واقعے کی الجھن سے جان چھڑا سکا۔ وہ اپنے آپ کے ساتھ کشمکش میں رہتا اور آخر وہ ہار گیا۔ آہستہ آہستہ شایان کی نگاہوں میں نفرت موجزن ہوتی دکھائی دے رہی تھی، اس کے برتاؤ میں سرد مہری جھلکتی تھی، وہ نوشین سے نظریں چرا کر رہتا تھا۔ نوشین جو اپنے میاں کی بے رخی کے بوجھ تلے دبی جارہی تھی، وہ اپنی نند تمنا سے ملی، آنسو بہاتے ہوئے اپنی روٹھی ہوئی تقدیر سے کہتی کہ شایان میرے ساتھ اچھا نہیں کررہا، دو مہینے سے میرے ساتھ بالکل بولتا نہیں ہے جب گھر آتا ہے فوراً ندیا کو لے کر باہر چلا جاتا ہے، چند دن پہلے میں نے وجہ پوچھی اور اعتراض کیا تو اس نے کہا : تم میری نظروں سے گری ہوئی ہو، صرف ندیا کی وجہ سے اس گھر میں رہ سکتی ہو، بس اس لیے کہ ندیا کو ماں کی ضرورت ہے، ندیا کی ماں ہونے کی وجہ سے تمھاری ضروریات پوری کروں گا۔ مزید مجھ سے کوئی توقع نہ رکھو۔ تمھاری شکل دیکھنے سے بھی میری طبیعت اچاٹ ہوجاتی ہے۔

تمنا نے اس کی باتیں سن کر اس کو سمجھایا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے ہم سب بھول سکتے ہیں، سوائے شایان کے، اس کو ٹائم درکار ہے، وقت کے ساتھ ساتھ یہ موڑ بھی پیچھے رہ جائے گا، رشتے کی تلخیاں ذائقہ بدلیں گی، دیکھو! تمھیں اس پریشانی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے پریشانی کو برداشت کرنا ہوگا، زندگی کو پکڑلو، اس کو ڈھیلا نہ ہونے دو۔ اس کے لیے طاقت چاہیے، پہلے سے زیادہ اپنی محبت کا ثبوت دو۔ ندیا کو دیکھو، اسی کی وجہ سے تمھیں طاقت آئے گی۔

نوشین کی باتوں سے یہ لگتا تھا کہ وہ اپنے کیے پر تہہ دل سے پچھتانے کی جگہ، صرف جھگڑے سے بچنے کی کوشش میں ہے۔ انتیس سال کی عمر میں اس کو اِس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ مرد اور عورت کی فطرت میں جو فرق ہے اس کو سمجھ سکے۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے ایک ہی بات کو بار بار دہرائے جاتی تھی: 'اگر شایان سے ایسا ہوا ہوتا اور میں باخبر ہوتی، تب کیا میں اتنا حق رکھ سکتی تھی کہ ایک سال گزرنے کے بعد بھی زخم کو دوبارہ تازہ کرتی! بہت سارے مردوں کا فیملی سے باہر دوسری عورتوں سے چکر ہے، حتیٰ وہ دوسری شادیاں بھی کرلیتے ہیں پھر بھی اکثر بغیر کسی مسئلے کے اپنی مشترکہ زندگی پر قائم ہوتے ہیں مگر ایک عورت تھوڑی بھٹک جائے

تو بڑی گنہ گار ثابت ہوتی ہے، اِس عرصے میں مجھے کتنی ڈانٹ ڈپٹ کھانا پڑی، میں کتنی گھٹیا ثابت کی گئی'۔
تمنا مسکرائی، یہ بات صرف نوشین کی نہیں، اکثر عورتوں کا شکوہ ہے:
'نوشین! عورت اور مرد کی فطرت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ ہم زیادہ اپنے شوہروں کے دل کا مالک بننا چاہتی ہیں، بیوی کے لیے یہ تکلیف دہ ہوتا ہے اگر اس کا شوہر دوسری شادی کرے لیکن اگر بیوی کو یقین حاصل ہو جائے کہ اس کا شوہر اس کو سب سے زیادہ چاہتا ہے اس کو بڑی تسلی ملتی ہے۔ عورت کو پتا لگے کہ اس کے شوہر کا کسی کے ساتھ ناجائز رشتہ ہے پھر بھی وہ شوہر کو مزید اپنا بنانے کی کوشش کرتی ہے اور اگر اس میں کامیاب رہے تو وہ خود کو بڑا فاتح سمجھتی ہے مگر مرد کی فطرت اور ہے، یعنی اگر اس کو ایسی بات محسوس ہو جائے تو پہلے وہ بیوی کو اپنا سمجھ کر اس کو کھونا نہیں چاہتا تو پھر آہستہ آہستہ مرد کے دل میں محبت غائب ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت اور فطری بہاؤ کو ہم روک نہیں سکتے'۔
'پھر مطلب یہ ہے کہ وہ محبت دوبارہ واپس نہیں آئے گی'، نوشین نے مایوسی سے کہا۔
'ہر مشکل سلجھانے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے، صبر، صبر اور صبر۔ صبر آسان کام نہیں مگر اس کا پھل میٹھا ہوگا۔ شایان کے دل میں اس مرجھائے ہوئے پیار کو دوبارہ زندہ کرو چاہے پھر سے محبت کا بیج ڈالنے پر مجبور ہو جاؤ، دل بنجر کبھی نہیں ہوسکتا، جب محبت کا پودا دوبارہ دل سے اگ آئے تو اس کی دیکھ بھال کرو، یہ سب دھیان، ملائم طبیعت اور بے تحاشا محبت سے ہو جائے گا۔ محبت کرو! خالی ہاتھ واپس نہیں آؤ گی'۔
اتنا بول بول کر میری آواز بیٹھ گئی، اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور وہ دن یاد کر کے میرے پورے وجود پر اداسی کا بادل چھایا ہوا تھا۔ کہانی سناتے ہوئے، سنانے والا، سننے والے کو دیکھتا رہتا ہے تا کہ تاثرات کو محسوس کر سکے۔ مگر میرے سامنے کوئی چہرہ نہیں دکھتا، شیما فاصلے پر منہ پھیرے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ واقعی ایک لفظ بھی نہیں بولی، اس کا بایاں ہاتھ بیڈ پر رکھا ہوا تھا اور آرام آرام سے ہتھیلی کو آگے پیچھے کر رہی تھی۔ اس کا سر ایسا بے تکان کھڑا ہوا تھا جیسا کہ اُس کی گردن کسی نے مضبوطی سے پکڑ رکھی ہو۔
اس کہانی میں بعض باتیں خود ہی بیان نہیں کی تھیں کہ میرے بھائی نے اس واقعے کے آغاز میں کیسے دن گزارے، وہ پاگلوں کی طرح اکیلا رہتا تھا، کیوں کہ خود مہوش سے کہا تھا کہ تم چند دن اپنے میکے میں رہو تا کہ میں خوب سوچوں اگر یہ پاگل پن مجھے سوچنے دے تب۔ وہ بار بار ایک ہی بات کو تکرار کرتا تھا کہ ہم دونوں محبت کے عروج پر تھے، میں ہر وقت عاشقانہ میسج اس کو دیا کرتا تھا، مجھ سے چند گھنٹے گھر سے دور نہیں رہا جاتا تھا۔ ہمیشہ بلاناغہ سرخ پھول کی ایک شاخ لے کر گھر لوٹتا تھا۔ میں یہ سوچ کر کہ مہوش آج کل کام کر کے بہت تھک جاتی ہے، اس کو کھانا بھی نہیں پکانے دیتا تھا، اس نے مجھے بے وقوف بنایا، مہوش وہ لمحات اپنے بوائے فرینڈ

کے ساتھ گزار رہی تھی۔ میں نے اس کے موبائل سے سارے میسیجز نکالے ہیں، اس لڑکے کو مہوش کی بھیجی ہوئی تصویریں بھی میں نے دیکھی ہیں، میں کیسی عورت کو اپنی بیوی بنا کر اس کے لیے مر رہا تھا۔

'دیکھو سلمان! پلیز اس کے بعد مہوش کا موبائل چیک نہ کرنا، پلیز ان باتوں کو چھپا رہنے دو، انسان جب اس دلدل میں پھنس جائے، پتا بھی نہیں چلتا، ڈوبا چلا جاتا۔ تم یہ سمجھو کہ مہوش کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اِس دلدل سے باہر نکالا ہے۔' ادھر میں بھائی کو سمجھاتی رہتی۔

****

میں نے تھوڑا پانی پیا، شیما سے پانی پینے کا پوچھا، اس نے ہاتھ سے انکار کیا۔ اس کی آواز گلے میں دب کر رہ گئی تھی، بس ایک غمزدہ لہجے سے مشکل سے کہا کہ آگے کہانی سنائیں۔

****

عقل اور دل! دو مختلف کیفیات پر مبنی نعمتیں ہیں۔ عقل کو کئی متبادل دلائل سے منا سکتے ہیں، مگر جب دل ضد پر آئے تو پھر متبادل دلائل کام نہیں آتے۔ نفرت اور پیار دونوں نے ساتھ ساتھ شایان کے دل کو گھیر لیا تھا۔ جس نوشین سے پیار کرتا تھا اب وہ اس کی دنیا سے نکل گئی تھی، جو نوشین اب اس کے سامنے تھی اس سے نفرت کر رہا تھا، آخر ایک بات پر نوشین روٹھ کر اپنے میکے میں چلی گئی تھی۔ باقی لوگوں کو تو یہ بات چھوٹی سی لگی مگر ایک عورت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی کوفت نہیں ہوتی کہ وہ یہ محسوس کرے کہ جہاں وہ رہتی ہے، وہ سب کچھ اس تعلق نہیں رکھتا!

پھر دوبارہ فیملی کی وہی جان دارانہ رائے، اس دفعہ نوشین کی فیملی نے بچپن والی سوچ کی تعمیل کی۔ ان کو اس بات سے ڈر تھا کہ شایان ضد پر آ کر نوشین کے خلاف مقدمہ نہ چلائے، وہ کاغذ جس پر نوشین نے لکھ کر دستخط کیا ان کے دماغ کو کھا رہا تھا۔ نوشین کی فیملی کی طرف سے شایان کو دھمکیاں ملنا شروع ہو گئیں۔ ایک دفعہ ان کے ایک آدمی نے کسی بہانے سے شایان کو باہر بلا کر شایان کی گردن پر چھری مار کر اس کو کاغذ دیا کہ جو کہتا ہوں، اس پر لکھ دو! وہ لکھواتا ہے کہ میں شایان نے اپنی بیوی نوشین کو مجبور کر دیا تھا کہ فرید سے دوستی کرے ورنہ تمھیں مار دوں گا، ان سب کی یہ کوشش تھی کہ شایان کو نفسیاتی طور پر بیمار ثابت کر سکیں۔ (ناخواستہ میں نے شیما کی طرف نگاہ کی، وہ بیڈ شیٹ کو اپنی مٹھی میں پکڑ کر زور سے دبا رہی تھی۔۔ اور اس کی کمر کی ہڈیاں اکڑ کر ایسی سیدھی ہو گئیں کہ ایسا لگا اس کی کمر کی لمبائی دوگنی ہو گئی ہو)

تمنا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چند دن گزر جائیں وہ شایان اور نوشین کی صلح کروائے گی مگر اب ایسا کوئی نہیں ہو سکتا۔ تمنا کے ماں باپ اور دوسری بہن بہت برہم ہو گئے تھے، شایان کے ذہن میں دور دور تک کسی

کو نے میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ دوبارہ نوشین کے ساتھ ایک گھر میں رہ سکتا ہو،اس کے اوسان اڑ گئے اور وہ اِدھر اُدھر دوڑتا تھا، پکارتا تھا کہ مجھے انصاف نہیں مل رہا تو کیا اب مزید میں الزامات سر پر اٹھا کے پھروں!! میں اپنی بیٹی کو ان لوگوں کے ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔

شایان کے امی ابو نے اس کو مشورہ دیا کہ تم کچھ دن یہاں سے دور چلے جاؤ۔معاملہ ٹھنڈا ہو جائے، پھر دیکھیں گے۔شایان نے خود بھی یہ سوچا تھا کہ اب اس شہر میں رہنا مشکل ہے،اچھی یادیں بھی بھیانک چہرہ دکھا کر ذہن میں آتی ہیں اور دوسرا بڑا خطرناک مسئلہ یہ تھا کہ ان کی طرف سے انتقامی آگ بھی بھڑکتی جا رہی تھی۔ادھر شایان کا غصہ اور شایان کے ابو کا مزید آگ سلگانا کہ میں فرید کو نہیں چھوڑوں گا کہ اس سارے معاملے میں اس کا بھی ہاتھ ہے،اس کو محکمہ عدالت میں سزا ملنی چاہیے اور دوسرے لوگوں کو بھی جنھوں نے میرے بیٹے کی زندگی کو برباد کیا ہے اور پھر اوپر سے دھمکیاں بھی دیتے ہیں۔شایان اپنے شہر سے دور چلا گیا،سب یہ سمجھتے تھے کہ پریشانیوں کی جڑ ختم ہو چکی ہے مگر وہاں بھی وہ دھمکیوں سے جان نہ بچا سکا۔تمنا نے ایک بات یہی سوچی کہ بھائی کو بہت دور جانا چاہیے،بہت دور،جہاں کوئی مکان اس کو تلخ دنوں کی یاد نہ دلائے،تمنا نے تدبیر کی،راستہ دیکھا اور ابو سے پیسے لگوائے۔شایان دور! بہت دور چلا گیا۔باہر! اپنے رشتہ داروں کے پاس۔وہ تمام تعلقات توڑ چکا،اس نے اپنے وطن سے محبت کی خوشبو اپنے دامن میں سمو کر ہجرت کی مگر ابو امی کا اپنے بچے کے ساتھ اٹوٹ رشتہ ہے۔ایک بات سے اس کو تسلی تھی کہ ندیا کو پاس بلاؤں گا۔وہ جب بڑی ہو جائے گی تو سمجھ جائے گی کہ اس کے ابو کی مجبوری تھی ورنہ پتا نہیں یہاں رہتے ہوئے اس غصے کی بوچھاڑ میں کتنے لوگ مارے جاتے اور ہر لحاظ سے ماحول اس کے لیے تشویش سے بھرپور رہتا۔اس کو بتاؤں گا کہ یہ وطن چھوڑنا میری سب سے بڑی کمزوری تھی،مگر میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا جس سے میرے لیے دنیا ادھر سے ادھر ہوگئی۔

اس کے بعد وہ کیمرے والا ابو بن گیا۔نوشین نے طلاق کی درخواست کی،نہ شایان نے طلاق کی بات چھیڑی۔نوشین نے بعد میں کئی دفعہ شایان کو بتایا کہ وہ اس دن کا انتظار کرے گی کہ شایان اس کو معاف کرے اور وہ سدا خود کو شایان کی بیوی ہی جانتی رہے گی۔شایان اس کے برعکس جواب دیا کرتا کہ میرے نزدیک تم ندیا کی ماں ہو اور بس۔نوشین ندیا کو دور بھیجنے پر کبھی تیار نہیں تھی،سال گزر گئے،اب ندیا کے ابو اس کو پاس بلانے لگے کیوں کہ اب ندیا اس عمر تک پہنچ گئی ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کر سکتی ہے۔

*****

کہانی ختم ہوئی۔میں نے خاموشی اختیار کی کہ شاید شیما اس طرف رخ کرے۔۔۔!! حالاں کہ اس کا افسردہ چہرہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا،لمبی خاموشی کے بعد شیما نے منہ پھیرے بغیر کہا پھر نوشین اس کے بعد

کیوں معاشرے میں لاتعلق رہی! وہ اپنے وقار اور شرف کو محفوظ بنا کر زندگی گزارتی رہی ۔۔کیوں وہ دوبارہ کسی کے ساتھ دوستی نہیں کرسکتی، کیا خلعہ لے کر دوبارہ شادی نہیں کرسکتی!!

بیٹی! ہماری یہی کمی ہے کہ بس اسی پر پریشان ہوتے کہ دوسرے ہماری کہانی سن کر ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے! اس وقت جب نوشین کو اپنے بارے میں اپنی فیملی کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا ،نہیں سوچا! اب وہ اپنی پوری زندگی اسی بات پر لگا رہی ہے کہ لوگوں پر ثابت کرے کہ وہ ایسی عورت نہیں ہے!

''پھوپھی! اس کہانی میں ندیا کے بارے میں کسی نے سوچا! دادا، دادی، نانا، نانی، پھوپھی کے ہاں ندیا کی کیا حیثیت تھی! اس کو کیا چاہیے تھا؟ اس کی خواہشات اور ضروریات کے بارے میں کسی نے سوچا؟؟'

(شیما کی آواز سے اس کے تن من میں چبھن محسوس ہو رہی تھی) ۔جیسا کہ اس کہانی میں ہوا اور اس طرح کی کہانیاں چلتی رہتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ اولاد سے زیادہ کسی کی اہمیت نہیں ہوتی حتیٰ اولاد کی اولاد کی بھی یعنی نواسے، نواسیاں، پوتے اور پوتیاں ۔جب ان دونوں کے بیچ میں کسی ایک کی خوشی کو چننا ہو، ماں باپ صرف اپنی اولاد کا ہی خیال رکھتے ہیں جیسا ندیا کے دادا اور دادی نے اپنا بیٹے کی بھلائی پر فیصلہ کیا اور اس کے نانا اور نانی نے نوشین کو چنا۔

دوسری بات یہ رہی کہ بچے کی اہمیت تو ہے ہی جیسا کہ نوشین اور شایان کے ہاں تھی مگر کبھی کبھی بچوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ ماں باپ کی جدائی بچوں کے حق میں ہی بہتر ہے ۔اگر مقدمہ چل رہا ہوتا جو کہ شایان کے ہوتے ہوئے ہونے جا رہا تھا اور اگر اس کہانی کی تہہ میں جھانکا جائے تو دیکھتے ہیں کہ نوشین کی بدنامی اور شایان کے غصے کا خونی ثابت ہونا دور کی بات نہیں تھی ۔

*****

میں خود قدم اٹھا کر شیما کے سامنے ہوئی ۔اس کے چہرے سے رنگ اتر گیا تھا، جیسے رو رو کر آنسو اس کی جلد پر سوکھ گئے ہوں، اس کے دونوں ہاتھ تھام کر میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ اب تم اس کہانی کا اختتام بناؤ ،ندیا کیا سوچے گی!! ندیا کیا کرے گی!!۔

شیما کھڑکی پر جس سے دھوپ کی ہلکی ہلکی کرنیں اندر اس کی سفید جلد پر پڑ رہی تھیں نظریں جماتے ہوئے الفاظ کے ہر حرف گنتے ہوئے ایسے بولی کہ میں لاجواب ہوگئی' :'کاش میاں بیوی کا بھی اٹوٹ رشتہ ہوتا! مجھے اس کہانی کے کرداروں کی پرواہ نہیں ہے، اگر اس کہانی میں ہم تھوڑا سا بھی ایک کردار کا رخ بدلیں، تو کئی کرداروں کی قسمت بدلتی اور شاید ندیا کی قسمت نہ پھوڑی جاتی ۔۔۔ندیا کو ان سب کرداروں سے اٹوٹ رشتہ توڑ کر اپنا راستہ بنانا چاہیے ۔۔۔وہ راستہ جو اس کے لیے بہترین ہے'۔

نصیر اعظم
واشنگٹن، ڈی سی

جنازہ

وہ بغور ان کی باتیں سن رہی تھی، تمکنت آرا سحر سلطان سے یہ اس کی پہلی اور اتفاقیہ ملاقات تھی۔ وہ اپنی بڑی نند سے ملنے میری لینڈ آئی تھی اور اس وقت وہ ان کے ساتھ تمکنت آرا سحر سلطان کے گھر میں تھی، وہ کمیونٹی میں تمکنت آپا کے نام سے جانی جاتی تھیں، عمر ستر اور اسی کے بیچ میں ہوگی، درمیانہ قد، صاف رنگت اور لباس کے معاملے میں خاصی محتاط، چھدرے بال سلیقے سے رنگے اور سنوارے ہوئے، کپڑوں کے رنگوں سے ملتا جلتا ہلکا زیور، اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ تمکنت آپا سے سوشل ملاقات کے لیے آئی ہے :

'تمکنت آپا، بہت افسوس ہوا۔۔۔ یہ اچانک۔۔۔اس کی نند نے سفید گلابوں کا گلدستہ انھیں تھماتے ہوئے کہا تھا'۔

اندر آؤ، تم پہلی ہو جو یہ پھول لے کر آئی ہو، ورنہ تو اس کمیونٹی میں کسی کے گھر موت ہو جائے تو لوگ تعزیت کے ساتھ کھانے پکا پکا کر لے آتے ہیں اور بعد میں سب پھینکا جاتا ہے، برسوں سے امریکہ میں رہ رہے ہیں مگر طبعیت کا گنوار پن نہیں جاتا۔ وہ تمکنت آپا کی باتیں سن کر کچھ حیران اور کچھ پریشان ہوگئی تھی۔ ان کا چالیس سالہ بیٹا اپنے اپارٹمنٹ میں مردہ پایا گیا تھا اور اس وقت اس کی میت آٹپسی کے لیے اسپتال میں تھی۔

جس وقت وہ اپنی نند کے ہمراہ پہنچی تھی، گھر میں سوائے ان کے اور کوئی نہ تھا:

'میں اس سے ہمیشہ کہتی تھی کہ اکیلے رہتے ہو کسی دن میں آئی اور تم کو مردہ پاؤں گی اور وہی ہوا، کل صبح میں اس کے اپارٹمنٹ گئی، روز جاتی ہوں، اسے پکارا کیوں کہ ابھی دفتر جانے کا وقت نہیں ہوا تھا'۔ وہ رکیں۔۔۔ 'پکارتی ہوئی بیڈ روم میں پہنچی تو بستر سے آدھا لٹکا ہوا تھا اور میں جان گئی کہ اب وہ۔۔۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئیں'۔

'بس اللہ کی مرضی ہے جس کا وقت آجائے'۔

اس کی نند نے دلاسہ دینے کی کوشش کی 'اللہ کی مرضی؟؟ بی بی یہ پاکستان میں تو چل سکتا ہے، یہاں نہیں، بھئی اللہ بھی تو چاہتا ہے کہ اس کے بندے بھی کچھ کریں اور اپنی کوتاہیاں اللہ پر ڈال کر نہ بیٹھ جائیں اور وقت؟؟؟؟ وقت ہی کو تو لوگ نہیں پہچانتے سمجھتے ہیں کہ زندگی صرف ان کے لیے ہی بنی ہے اور موت دوسروں کے لیئے'۔ وہ پھر رک گئیں اور سامنے کافی ٹیبل پر پڑے بجتے ہوئے سیل فون پر مدہ لہجے میں بات کرنے لگیں۔

'عائلہ تھی، آنا چاہ رہی ہے، میں نے بتا دیا کہ جب ٹکٹ مل جائے آجانا، آخرالبکر کی سے اتنی جلدی آنا آسان بھی نہیں ہے اور پھر بچے بھی چھوٹے ہیں۔ مگر سب ہی لوگ آئیں گے۔۔۔اور پھر وہ عصمت، اور اس کی بھابھی سے مخاطب ہوئیں: 'ابھی فیونرل میں ہفتہ ہے'۔ وہ خاموش ہوگئیں اور صوفے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس نے بغور کمرے کا جائزہ لیا دنیا جہان کی قیمتی اشیا سے اٹا پڑا تھا، بیش قیمت صوفے، شاندار میزیں اور وکٹورین کرسیاں، شیشے کی خوبصورت الماریوں میں ڈیکوریشن، کمرہ کسی عجائب گھر کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔

'کس مسجد میں نماز ہوگی؟' عصمت نے پوچھا۔

'مسجد میں؟ وہ کس لیے؟' وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ اگلا جھٹکا عصمت اور اس کی بھابھی شاہانہ کے لیے تھا۔

'تو پھر کہاں ہوگی نماز جنازہ' عصمت نے پوچھا۔

'نمازوں کا موسم گذر چکا ہے، پتہ نہیں کیوں لوگ ساتویں صدی میں اٹک کر رہ گئے ہیں، ہماری زندگیاں بہت آگے بڑھ چکی ہیں اور ہم جس ملک میں رہتے ہیں اسی طریقے سے تدفین ہوگی'۔ شاہانہ کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے لہجے اور چہرے پر تمکنت طاری کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

'کیوں بھئی شاہانہ تمھیں کچھ حیرت ہو رہی ہے؟' انھوں نے براہ راست اس سے پوچھا اور شاہانہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

'مگر کیوں؟' انھوں نے شاہانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

'اس لیے کہ مسلمانوں کا یہی طریقہ ہے'۔ شاہانہ نے اپنے آپ میں آتے ہوئے مختصراً کہا۔

'ہاں یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کے جذبۂ اسلام کو تقویت ملتی ہے باقی وقت جو چاہیں غیر اسلامی کام کرتے رہیں'۔

وہ کچھ نہیں بولی، وہ سوچ رہی تھی کہ شاید بیٹے کی موت نے ذہن پر اثر کیا ہے جب ہی ایسی باتیں کر رہی ہیں۔

'اچھا یہ بتاؤ تم کیا کرتی ہو کہاں رہتی ہو، کتنے بچے ہیں'، وہ اب پوری طرح شاہانہ کی طرف متوجہ تھیں۔

'ہم لوگ نیوجرسی میں ہیں، میں اسٹیٹ میں آئی ٹی سیکٹر میں کام کرتی ہوں۔ دو بچے ہیں، وہ لوگ بھی چند دنوں میں اپنے والد کے ساتھ آئیں گے، لانگ ویک اینڈ آنے والا ہے، میں ذرا پہلے آگئی'۔ اس نے تفصیل بتائی۔

'اچھی بھاوج ہو کہ میاں کے بغیر ہی آگئیں، میں تو ہمیشہ اپنے میاں کے ساتھ ہی جاتی تھی،

سسرالیوں کے گھر اور بس ایک دو دن رہ کر چلی آتی تھی اور شاہانہ کی بے چینی دیکھتے ہوئے عصمت کھڑی ہوگئی۔ 'آپا اجازت دیجیے ہم لوگ پرسوں شام آئیں گے۔

'ٹھیک ہے اور اپنی بھاوج کو ضرور لانا'۔ انھوں نے شاہانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

'جی ضرور، ویسے انصر آج شام میں آئیں گے'۔ عصمت نے کہا اور دونوں ان کے عجائب گھر نما مکان سے نکل آئیں۔

'یہ یوں ہی ایسی یا پھر صدمے سے یہ حال ہوا ہے؟'۔ راستے میں شاہانہ نے عصمت سے پوچھا۔ عصمت کچھ سنجیدہ ہوگئی تھی۔

'شاید ایسی ہی ہوں، تم نے دیکھا نہیں ان کا انداز، کہیں سے لگ رہا تھا کہ صرف ایک دن پہلے بیٹے کی موت ہوئی ہے۔ ویسے یہ میاں بیوی کمیونٹی سے الگ تھلگ ہی رہتے ہیں، بہت کم لوگوں سے ان کا ملنا جلنا ہے'۔ عصمت نے کہا اور خاموش ہوگئی۔

شاہانہ کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا، برسوں امریکہ میں رہنے کے باوجود کبھی بھی کسی ایسے مسلمان گھرانے سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا جس کے گھر موت ہوئی ہو اور جو تدفین کے مروجہ اسلامی طریقے سے منحرف نظر آئے ہوں۔

تمھیں شاید یہ سب کچھ عجیب لگ رہا ہو کیوں کہ تم نیوجرسی کے جس علاقے میں رہتی ہو وہاں مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں کی آبادی کم اور زیادہ تر سفید فام متوسط طبقے کے پروفیشنل لوگ رہتے ہیں، جب کہ یہاں تعداد خاصی ہے اور بالکل وہی تقسیم ہے جو پاکستان میں ہے، یعنی، امیر طبقہ، ان کی اپنی دنیا ہے، اپنی دلچسپیاں ہیں، یہ لوگ بقیہ کمیونٹی سے دور ہی رہتے ہیں۔ اب تو یہ بھی ہوگیا کہ انھوں نے اپنی مسجد بھی اپنے علاقے میں قائم کر لی ہے، ایک نام نہاد متوسط طبقہ ہے جو امیر بننے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے، پھر چھوٹے کاروباری ہیں، اسٹوروں پر کام کرنے والے لوگ ہیں جو اسی متوسط طبقے کا حصہ تو ضرور ہیں لیکن رویوں میں بہت فرق ہے۔

'یعنی؟؟؟'۔ اس نے پوچھا۔

'یعنی یہی کہ ان کی پوری زندگی صرف مذہب کے گرد گھوم رہی ہے، چاہے وہ کھانے پینے کا معاملہ ہو، لباس ہو یا ملنا جلنا ہو بہر کیف جو بھی ہے کم از کم لوگ اپنی دنیا بنانے میں تو کامیاب ہیں'۔ اس نے گاڑی اپنے ڈرائیو وے میں روکتے ہوئے کہا۔

'ان کی کہانی بہت دلچسپ اور حیران کن ہے'۔ اگلے دن ناشتے کے دوران جب شاہانہ تمکنت سحر سلطان کے رویوں کے بارے میں کہہ رہی تھی تو عصمت کے شوہر انصر بول اٹھے۔

'اچھا انصر بھائی ۔۔' وہ دلچسپی سے بولی۔

'تمکنت آپا کا تعلق لوہارو اسٹیٹ کے کسی خوشحال خاندان سے ہے، ان کا گھرانہ روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھا، یہ لوگ چھ بہن بھائی تھے جن میں سے اب تین بچے ہیں ۔ ان کی ایک بہن لندن میں ہیں اور بڑے بھائی ہندوستان میں جو ان سے شاید سال ڈیڑھ سال بڑے ہیں، بہن سب سے چھوٹی ہیں ۔ یہ پچاس کی دہائی کے وسط کا واقعہ ہے ان کے گھر والوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا مگر یہ اڑ گئیں کہ انھیں بھائی کے پاس ہی رہنا ہے ۔ والدین نے سمجھایا، باقی بہن بھائیوں نے منت کی مگر یہ نہیں مانیں' ۔ انصر سانس لینے کو رکے ۔

'کمال ہے اس وقت بھی ایسے لوگ موجود تھے ۔۔' ۔ شاہانہ بولی ۔

'ہاں ایسے لوگ ہر دور میں ہوتے ہیں' ۔ انصر چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے بولے ۔

'اچھا آگے کیا ہوا؟' ۔ اس نے بیتابی سے پوچھا ۔

'ہوں، خیر والدین نے اس شرط پر رکنے کی اجازت دے دی کہ کچھ عرصہ بعد اگر ان کا دل نہ لگے تو فوری طور پر پاکستان آجائیں ۔ مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا ۔ اس وقت یہ بی اے کے آخری سال میں تھیں ۔ ایک سال بعد جونہی ان کا بی اے مکمل ہوا، ایک روز بڑے بھائی سے کہا کہ ان کا داخلہ امریکہ کی یونیورسٹی میں ہوگیا ہے اور سمسٹر تین ماہ بعد شروع ہوگا ۔ بھائی حیران پریشان کہ یہ کیا ہوا بہرکیف یہ وہاں سے نکل آئیں اور مڈ ویسٹ کی کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے لگیں وہیں ان کے شوہر دلشاد بھائی بھی کام کرتے تھے ۔ ان دنوں اپنی طرف کے لوگ کم ہی نظر آتے تھے، سو، ان میں ایک تعلق پیدا ہوگیا اور پھر شادی کی تیاریاں ۔ اب دوسری طرف کی بات سنو، دلشاد بھائی ازبک پارسی تھے ۔ ان کا خاندان پاکستان اور ہندوستان میں بٹا ہوا تھا ۔ ان کا خاندان کوئی سو سال پہلے ہندوستان آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنا بزنس جما لیا ۔ تقسیم کے بعد کچھ لوگ کراچی آگئے مگر انھوں نے آج تک نہ اپنے نام بدلے اور نہ ہی ازبک تہذیب' ۔

'ہیں، مگر نام تو مسلمانوں والا ہے' ۔ شاہانہ کے لہجے میں کچھ حیرت تھی ۔

'ازبکستان کے پارسیوں کے نام ایرانی طرز کے ہی ہیں اور ان کا اصل نام دلشود مرزیو ہے مگر ہندوستان میں یہ دلشاد مرزا ہو گئے ۔ بہرکیف دونوں خاندانوں نے اس شادی کی شدید مخالفت کی اور ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان یا ہندوستان کے بجائے یہیں شادی کرینگے ۔ وہ خاموش ہو گئے' ۔

'مگر انصر بھائی پارسی برادری میں تو کمیونٹی سے باہر شادی نہیں کرتے' ۔ شاہانہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ۔

'انکے ہاں بھی وہی منافقت ہے جو ہم مسلمانوں میں ہے بظاہر تو مساوات ہے مگر مرد کے لیے یہ بات جائز ہے عورت کے لیے ناجائز، عورت کمیونٹی سے باہر شادی کرلے تو ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے اور بعض صورتوں

میں تو کمیونٹی لاتعلقی کا بھی اعلان کر دیتی ہے مگر مرد کی ایسی شادی قبول۔ یہ لوگ پچھلے کوئی چالیس سال سے میری لینڈ میں ہیں، دلشاد بھائی خود بے حد بیمار ہیں پراسٹیٹ کینسر میں مبتلا ہیں بس اپنی ہمت پر کھڑے ہیں، لیکن آدمی بہت نفیس ہیں، خاموش طبع، ملنسار، منکسر المزاج'۔ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

'مطلب بیوی کے برعکس ہیں'۔ شاہانہ بولی اور وہ مسکرا دیے۔

'نہیں وہ بھی اچھی ہیں۔ ہاں وہ اور تم تو ایک ہی ریاست کے ہو تو ظاہر ہے اچھی ہی ہوں گی'۔ عصمت ہنستے ہوئے بولی۔

'بالکل اور مابدولت کو اسی لیے اتنی اہمیت دیتی ہیں ورنہ تو۔۔'وہ بھی ہنس پڑے اور جملہ ادھورا چھوڑ کر کھانے کے کمرے سے نکل گئے۔

عصمت کے تینوں بچے اور شاہانہ کے شوہر اور دونوں بچے آچکے تھے، گھر میں عید کا سا سماں تھا، ہنگامے تھے، دلچسپیاں تھیں۔ نوجونوں کے زندگی سے بھرپور قہقہے، مصروفیات نے جیسے ماحول کو گرما دیا تھا، عصمت کی بڑی بیٹی فاطمہ جو سب بچوں سے بڑی تھی سب کو لیے اپنے کمرے میں بیٹھی گھومنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ گھر کے بڑے تمکنت آرا سحر سلطان کے بیٹے کی تدفین میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ فیونرل ہوم ان کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا اور ابھی کچھ دیر تھی۔

'انصر بھائی مجھے بھی واقعی حیرت ہے، اتنے سال یہاں ہو گئے لیکن آج تک کسی مسلمان کی ایسی تدفین کا نہیں سنا'۔ شاہانہ کے شوہر احسان نے کہا۔

'ہوسکتا ہے کہ اپنے شوہر کی وجہ سے وہ یہ کر رہی ہوں'۔ شاہانہ بولی۔

'نہیں، خیر تمکنت آپا اتنی بھی شوہر پرست نہیں، ان کا جو جی چاہتا ہے یا جس پر وہ قائل ہوتی ہیں وہی کرتی ہیں، اگر اسلامی طریقے سے تدفین چاہتیں تو دلشاد بھائی کچھ نہ کہتے اور بچے تو ان کے مسلمان ہی ہیں، چاہے نام کے ہی ہوں'۔ انصر بولے۔

یہ لوگ جس وقت فیونرل ہوم میں پہنچے، کچھ لوگ آچکے تھے، ایک طرف ہلکی چائے کا سامان لگا تھا، ان کے مرحوم بیٹے کے چند دوست اور ساتھ کام کرنے والے لوگ تھے، سب ہی اس ناگہانی پر افسردہ تھے۔ شاہانہ ایک طرف پڑے صوفے پر بیٹھی آنے جانے والوں کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ دلشاد مرزا اداس سر جھکائے اندر آئے اور انصر سے باتیں کرنے لگے، ان کا اور احسان کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

اس نے بغور دلشاد مرزا کو دیکھا، کھلتا ہوا رنگ، لانبا قد، قدرے جھکے ہوئے تھے جیسے بیٹے کی اچانک موت نے انھیں جھکا دیا ہو۔ ان کے فوراً بعد ایک عورت اور اس کے ساتھ ایک مرد اندر آئے۔ عصمت نے

شاہانہ کو اشارے سے بلایا۔
'یہ تمکنت آپا کی بیٹی عائلہ ہیں اور یہ ان کے شوہر آفتاب سنگھ' اس نے تعارف کرایا اور اس آفتاب سنگھ کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں فسادات کے وہ مناظر ابھرنے لگے جو اس نے بے شمار کہانیوں میں پڑھے تھے۔ وہاں سے تھوڑا ہٹ کر کھڑی ہوگئی، وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی مگر تمکنت آرا سحر سلطان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس اثنا میں ایک اور مرد اندر داخل ہوا، پھولا چہرہ، سوجی ہوئی آنکھیں، جو اس کے رونے کی گواہی دے رہی تھیں، یہ ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے جو صبح ہی اٹلی سے یہاں پہنچے تھے۔
اعلان ہوا کہ ویونگ شروع ہو رہی ہے سو، جو آنا چاہتا ہے اندر آجائے۔ لوگ دھیرے دھیرے اندر جانے لگے، دلشاد مرزا باہر ہی کھڑے رہے جیسے کسی کے منتظر ہوں۔ شاہانہ ایک بار پھر صوفے پر جا بیٹھی۔ کیسی ہو؟ اس آواز پر وہ اپنی سوچوں سے نکل آئی۔ یہ تمکنت آرا سحر سلطان تھیں۔ ان کا چہرہ چمک رہا تھا، سلیقے سے ہلکا میک اپ، سر پر ایک قیمتی وگ لگی ہوئی تھی، اصل میں؛ میں بیوٹی سیلون چلی گئی تھی، وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولیں دیکھو کسی سے کہنا نہیں، سب گنوار ہیں موقع کی نزاکتوں سے بالا، وہ سانس لینے کو رکیں 'اب یہی دیکھو کہ جب شینو کو بنا سنوار کر پیش کیا جا رہا ہے تو۔۔۔'
'شینو کون؟' شاہانہ بول پڑی اور انھوں نے ایسے اسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ رہیں جاہل کی جاہل، او وہاں اب تو اس کا نام میت رہ گیا ہے، تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ جب میت کو اس طرح پیش کیا جائے بنا سنوار کر، میں تو پھر زندہ انسان ہوں، اور اس کے دفتر کے ساتھی اور دوست کیا کہتے، مجھے بے حال دیکھ کر۔ وہ اپنے سیاہ لباس کی مناسبت سے جالی کے دوپٹے کو سلیقے سے سنبھالتے ہوئے بولیں۔
چلیے تمکنت 'ویونگ' شروع ہوگئی ہے، آخری بار اپنے بیٹے کو دیکھ لیں'۔ دلشاد مرزا کے نرم لہجے میں کچھ اکتاہٹ تھی۔
'تم جاؤ میں ابھی آتی ہوں، کچھ کھا تو لوں صبح سے بھوکی ہوں'۔
وہ اسی طرح سر جھکائے آگے بڑھ گئے۔ اب دیکھو شاہانہ! آپا نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا:
'ہووووں'
شاہانہ نے فوراً پلٹ کر دیکھا، اسے لگا جیسے منوں بوجھ تلے دبی ہوئی کسی کراہ کو نکاسی کی راہ مل چکی ہے مگر سیدھی کھڑی ہوئی تمکنت آپا کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ کہہ رہی تھیں:
'جسے مرنا تھا وہ تو زندہ ہے اور جسے۔۔۔'
وہ شوہر کی طرف اشارہ کر کے بولیں اور کھانے کے لوازمات کی طرف بڑھ گئیں۔

شہلانقوی
نیویارک،امریکا

ایکس ریٹیڈ بھابی

وہ صوفے پر بیٹھ کر پھولی سانسوں کو برابر کرنے لگیں ۔مہنگے کفتان میں گھٹنے دور دور کر کے بیٹھی ہوئی وہ ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بھی اپنے گورے گورے چہرے کو پیپلز میگزین سے جھل رہی تھیں ۔ پھیلے گھٹنوں کی گھڑونچی پر مٹکا سا پیٹ دھرا ہوا تھا۔یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی فیشن ایبل خاتون تھیں جن کے قصے میں نے سنے ہوئے تھے ۔میرے میاں کے دوست، جو مجھے مزاج دار بھابی کہتے تھے ان صاحبہ کو ان کے میاں کے غیاب میں ایکس ریٹیڈ بھابی کہا کرتے تھے ۔میں آج ان سے پہلی مرتبہ مل رہی تھی، ہم کہیں نیویارک میں اور وہ بہت دور اوہایو میں رہتی تھیں ۔

جاوید،میرے میاں اور ان کے کالج کے دوستوں اور ریزیڈنسی کے ساتھیوں کی فون پر باتیں چلتی رہتی تھیں ۔پھبتیوں،لفاظیوں اور غیبتوں میں ان محترمہ کا ذکر ایسے سنا تھا کہ میری آنکھوں میں ان کی ایک خیالی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس تصور کو آج بڑا دھچکا لگ رہا تھا۔

اندرون لاہور کی تنگ گلیوں سے ڈاکٹر چودھری نے امریکہ آکر ایمرجنسی میڈیسن اور نرسوں میں ٹریننگ لی ۔خیر سب نرسیں نہیں تھیں چند ہسپتال کی کلرک بھی تھیں ۔لیکن اپنے اور چلتا پرزہ دوستوں کی طرح ڈاکٹر چودھری کا ارادہ ان گوریوں میں سے کسی کے جال میں پھنسنے کا نہیں تھا۔خاوند کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں ۔اس لیے سارے امتحان پاس کرنے اور ڈپلومے لینے کے بعد جب شادی کا ارادہ کیا تو تابع فرمان بیٹے کی طرح ماں سے دلہن منتخب کرنے کو کہہ دیا۔ڈالر کی تنخواہ کا روپوں میں ترجمہ کیا تو ماں کی آنکھوں میں برادری کی ہر گوری چٹی امیر لڑکی گھوم گئی اور برادری کا کیا ہے کشمیریوں میں بھی لڑکی دیکھی جا سکتی ہے ۔رشتہ لگانے والیوں نے تنخواہ کی خبریں ہر اس گھر میں پہنچا دیں جہاں بیری تھی لیکن والدہ ڈاکٹر چودھری کا کوئی ارادہ ڈھیلے پھینکنے کا نہیں تھا۔ان کے جوڑوں میں درد رہتا تھا وہ تو اس امید میں تھیں کہ بہو آکر ٹانگوں کے علاوہ ان کے کاندھے بھی دبادیا کرے گی ۔

ان کی ایما پر مائیں بہانے نکال نکال کر سجی بنی بیٹیوں کے ساتھ مزاج پرسی کو آنے لگیں ۔آخر ایک لڑکی، ماتھے چاند ٹھوڑی تارہ، باپ کی بہت بڑی بزنس، کئی کئی گھر اور بھئی بیسیوں پیغامات تھے لیکن لڑکی جو خود

امریکہ جانے کی خواہش مند تھی، ان کو قبول نہیں کرتی تھی۔ بس ڈاکٹر چودھری کی والدہ کو وہ پسند آ گئی۔ وہ ہرگز کسی خوب صورت لیکن غریب لڑکی کا چیونٹیوں بھرا کباب بیٹے کو نہ تھماتیں۔

دھوم دھام کی شادی کے بعد طیبہ جب امریکہ آئی تو اس نے بالی وڈ کی حسیناؤں کے انداز اپنا کر دل کے ارمان نکالے۔ لیکن میاں کا اصرار تھا کہ وہ اس کی پرانی معشوقاؤں کی طرح جینز پہن کر گھومے تا کہ سب دیکھ لیں کہ اس کی بیوی ان سے کسی طرح کم نہیں ہے لیکن جب وہ سوئمنگ پول پر بکینی میں نظر آئی اور سیر و تفریح کے وقت نیکر میں تو ڈاکٹر چودھری کے سارے پینڈو دوست ان کی پیٹھ پیچھے اسے ایکس ریٹیڈ بھابی کہنے لگے۔

اس طرزِ لباس میں کچھ اثر اوہایو کے چھوٹے شہر میں رہنے کا بھی تھا۔ نیویارک میں تو اتنے دیسی بستے ہیں کہ ان کے خیال سے اسکرٹ پہننا بھی برا لگتا ہے۔ اب تو شہر میں اچھا خاصا اسلامک ریپبلک آف جیکسن ہائٹس بن چکا ہے۔ جہاں سڑک پر بنگالی مائیں برقعوں کی نقابیں ڈالے سودا تر کاری خریدتی نظر آتی ہیں اور ان کے آگے آگے تنگ جینز میں اسکول سے واپس آتی ان کی بیٹیاں۔ لیکن توبہ توبہ نیویارک میں کوئی جوان دیسی لڑکی نیکر میں نظر نہیں آتی۔

میں اور جاوید ان کے چچا زاد بھائی سے ملنے اوہایو آئے تو ظاہر ہے وہ اپنے یار چودھری سے ملنے اور مجھے ملانے کیوں نہ آتے۔ اور اب وہ دونوں باہر پول کے پاس بیئر پی رہے تھے اور میں اس موبی ڈک کے سامنے چہرے پر مسکراہٹ چپکائے بیٹھی تھی۔

طیبہ جو اب ٹیبی کہلاتی تھیں، ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے آپ کو پوری دنیا کا محور سمجھتی تھیں اور اس وقت اپنی زچگی کا ہر مسئلہ میرے گوش گزار کر رہی تھیں جس میں انگلیاں سوجنے کی وجہ سے انگوٹھیاں نہ پہن سکنے کی بڑی مصیبت بھی تھی، انھوں نے گلے میں لٹکی موٹی سونے کی چین میں پروئی ہوئی ہیروں کی انگوٹھی مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ شروع زچگی کی ابکائیوں کے ذکر کے بعد اب لیٹنے پر تیزابیت ہو جانے کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے قریب رکھے ڈیزائنر پرس میں سے ٹمز کی گولی کھائی اور پھر مجھے بتایا کہ کس طرح ان کے باپ کے ہارٹ اٹیک کی وجہ سے ان کی والدہ ان کے پاس نہیں آسکیں اور اب ان کا ہاتھ بٹانے کو پاکستان سے ایک نوکرانی بھیجی جا رہی ہے جسے ان کی عزیز ظاہر کر کے ویزا دلایا گیا ہے۔ جب وہ یہاں تک پہنچیں اور انھوں نے اپنے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں مرد وہاں نہیں تھے اور ان کی نوکرانی کو لینے ایرپورٹ گئے ہوئے تھے۔ مجھے جاوید پر بے حد غصہ آ رہا تھا، میں یہاں ان صاحبہ کے ساتھ گھنٹوں بور ہونے کے لیے نہیں آئی تھی۔ وہ صوفے پر اور پھیل چکی تھیں لیکن میں ان کے اگلے جملے کے لیے تیار نہیں تھی، پیٹ پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے انھوں نے دردناک لہجے میں کہا،'مٹی کھانے کا دل چاہتا ہے'۔

ان کا مٹی کھانے کا دل چاہ رہا تھا اور میرا ان کو ایک تھپڑ مارنے کا۔ میری آنکھوں میں اپنے گھر میں کام کرنے والی غریب عورتوں کی تصویر گھوم گئی جو بڑے بڑے پیٹوں کے ساتھ ہمارے ماربل چپس کے فرش پوچے سے چمکاتی رہتی تھیں اور اپنی ابکائیوں کو دوپٹے کے ڈھاٹوں کے پیچھے چھپاتی ہمارے سالن بگھارتی رہتی تھیں۔ مجھے ان پر ترس تو آتا تھا لیکن سچ ہے، ان کی مدد کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ اب میں امریکہ میں صرف کھانے پکاتی ہوں اور گھر کی صفائی کرتی ہوں لیکن کراچی میں تو میں ڈاکٹری پڑھ رہی تھی۔ گھر کا کام کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، امی مجھے پڑھتا دیکھتیں تو مارے لاڈ کے ٹرے میں کھانا لگا کر میرے کمرے میں بھیج دیتی تھیں۔

امی نے ایک بار رحم کھا کر نوکرانی سے کہا بھی کہ کب تک اس طرح کام کرے گی، کسی اور کا انتظام کر دے۔ تو اس نے زبان دبا کر کہا تھا، کالے غصہ کرے گا۔ کالے خان کے نشہ کرنے کی عادت کا امی کو علم تھا، ٹھنڈی سانس بھر کر کچھ صدقے کے روپے بھی تنخواہ کے علاوہ دے دیتی تھیں۔ ان بیچاری عورتوں کا نازنخرہ کوئی نہیں اٹھاتا تھا تو وہ مٹی کھا کر منہ کا مزہ ٹھیک کر لیتی تھیں، ان محترمہ ٹیبی کو کس چیز کی کمی تھی کہ وہ مٹی کھانا چاہتی تھیں۔ 'ظفر کہتے ہیں، کیلشیم کی گولی چبا لیا کرو، لیکن میرا دل مٹی کھانے کو چاہتا ہے'۔ شاید دعا قبول ہونے کی گھڑی تھی۔ جاوید اور ظفر ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ گاڑی میں سے سوٹ کیس اتار کر اندر آرہے تھے۔ وہ عورت سلام کر کے دعائیں دیتی، طیبہ کی خیریت پوچھتی سیدھی ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کی پنڈلیاں دبانے لگی۔ 'ہائے ربا میں نے تو جب سنا کہ بی بی کو خود کھانا پکانا پڑتا ہے تو میں نے بیگم صاب سے کہا آپ مجھے فوراً ان کے پاس بھیج دیں'۔

طیبہ عرف ٹیبی کی آنکھوں میں آنسو سے جھلملائے، انھوں نے تقریباً تتلا کر کہا،'مٹی کھانے کا دل چاہتا ہے'۔

'اے میں صدقے واری جاواں، کیا میرے بچے نہیں ہوئے جو مجھے پتہ نہ ہوتا، میں تو چولھے کی مٹی ساتھ لائی ہوں'۔

مجھے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنے سامان میں سے ہلکے رنگ کی جمی مٹی نکال کر ٹیبی کو دی اور وہ اسے کٹر کٹر چبانے لگیں۔

☆☆☆☆

احمد رشید
علی گڑھ، بھارت

مانگ کا مون پردرشن

چاروں طرف آسمان کو چھوتی ہوئی آگ کی سنسناہٹ اور مظلوم چیخ و پکار کا بے ہنگم شور تھا۔ سانپ کے پھنوں جیسی لپٹوں کی پھنکاریں جھونپڑوں کو ڈس رہی تھیں اور انسانوں کے جسم موم کی طرح پگھل رہے تھے۔ زمین اور آسمان کے درمیان آہا ہا کار کی گونج تھی، لیکن ان کی دادوفریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ دو تین خاندانوں پر مشتمل کچے مکان جلا دیے گئے، مرنے والوں کا کوئی حساب نہیں، کتنے زندہ رہے اور کتنے بچ کر بھاگ گئے، اس کی بھی گنتی نہیں تھی۔ کہاں بھاگے، اس کی بھی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ملیچھ تھے انسان تھوڑی تھے جوان کی خبر لیتا۔ انسان تو صرف سرونڑ جاتیہ کے لوگ ہوتے ہیں جن کی ایک بیٹی ایک نوجوان ملیچھ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ یہ تو خدا جانے کہ کون کس کو بھگا کر لے گیا اور کہاں لے گیا؟ ملیچھوں کو سزا اس لیے ملی کہ وہ اپنی مرضی سے نیچ ذات میں پیدا ہو گئے اور بھاگنے والی لڑکی کو سنونڑ جاتیہ کے مطالبہ پر بھگوان نے ان کے پریوار میں پیدا کر دیا۔ جنم کے اس انتر نے ہی نوجوان ملیچھ کو قصوروار ٹھہرایا حالاں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ اس میں لڑکی کا بھی کیا قصور؟ یہ تو ملیچھ کو سوچنا تھا کہ جوانی کا نشہ ہو یا محبت کا سپنا کہ وہ اپنی آنکھ کھلی رکھے۔

آگ وخون کے لپلپاتے شعلوں نے کچے مکانوں کو ڈھیر کر دیا اور مکینوں کو خاک کر دیا تھا۔ ان جھونپڑوں کے آس پاس دومٹی کے گھر مسلمانوں کے بھی تھے۔ آخر گندی قوم تو وہ بھی ہے چماروں اور ہریجنوں کی بستی میں رہنا ان کا مقدر ہے یا دلتوں کے لیے مسلم بستیاں پناہ گاہیں ہیں۔ گاؤں میں کثیر آبادی ٹھاکروں کے ساتھ پانچ پختہ مکان پنڈتوں کے بھی تھے جن کے حکم کے تابع دار ٹھاکر باہو بلی ہونے کا کرتویہ نبھاتے جو بولے پنڈت اس پر ٹھاکر چلے اور رویش نہ چلے تو پاپ لگے کیوں کہ اسے کرانہ کی دوکان چلانی ہے۔ گاؤں میں پھوٹ پڑے یا آگ لگے بنیے کو تو مال کمانا ہے پھر اُدھرمی ہونے کا پاپ اپنے سر لینے کی مجال کس جاتی کو ہے۔ بیچارے پنڈت تو ویسے بھی اتنے رحم دل اور دیالو ہوتے ہیں کہ وہ کبھی خون میں ہاتھ نہیں رنگتے، خون کو دیکھنا بھی وہ پسند نہیں کرتے۔ زندہ یا مردہ انسانوں کو جلنے اور جلوانے میں خون نہ تو دکھائی دیتا ہے اور نہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے خون خرابے کا پاپ وہ کیوں کریں؟ یہ گھناؤنا اور دہشت ناک کام تو ہریجنوں سے آسانی سے لیا جاسکتا ہے۔ بس شراب اور پیٹ بھر کھانے کا بندوبست کرنا ہے، کام نہ چلے تو گرؤ سے بولو ہندو

ہونے کا نعرہ، بدلے میں لوٹ پاٹ مفت میں۔ جانور ہونے کے بعد خون سے بالکل ڈر نہیں لگتا پھر زندہ انسانوں کو جلانے کا منظر تو قابل دید ہوتا ہے اور آسان بھی۔ پلک جھپکتے ہی انسان اور مکان نیست و نابود اس طرح کہ ارتھی استھیوں میں بدل جاتی ہے نہ کوئی نشان اور نہ کوئی ثبوت، بات صرف بلوے کے دائرے میں جاتی ہے پھر دفع 302/307 کیوں کر لگے اتنی آزادی ہمارے آئین نے دی ہے کہ کسی بھی قتل کو ماب لنچنگ اور بلوے میں بدل دیں۔ یہ سب قتل اور ارادۂ قتل، کے دائرے میں نہیں آتا۔ پھر یہ مہان دیش، پولیس اور عدالت ہماری ہیں۔ اگر ہماری مرضی اور آستھا کی حفاظت نہیں کرے گی تو ہمیں اس کے حکم اور فیصلے کو نہ ماننے کا پورا پورا حق ہے۔ اس مہان اور پوتر دیش کا آئین بھی تو ایک دلت نے مرتب کیا، پھر کیوں آئین کی مانیں، کیوں اس ترنگے کو مانیں جو کثرت میں وحدت کی علامت بن کر ہمیں چڑاتا ہے۔ اکھنڈ بھارت کا راشٹریہ دھوج بھی ایک رنگ ہونا ہی ہمارا سپنا ہے۔ دیش سے اونچا راشٹریہ واد ہے اس میں وِوَاد کیا ہے؟

گاؤں میں ایک کہانی پرچلت ہے جو سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے، بزرگوں کی بہ زبانی بیان کی جاتی ہے کہ گاؤں میں نصیب خاں، سید شرافت اور موہن لال کی دوستی بہت مشہور تھی۔ موہن لال کی فطرت جی حضوری کی تھی، ہر وقت دونوں دوستوں کی خوشامد اور تابع داری میں لگے رہنا اس کی عادت تھی۔ ٹھاکر ہرپال سنگھ کی آنکھوں میں ان کی یہ دوستی کھٹکتی رہتی وہ ہر سمے ان کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے اپائے سوچتا رہتا تھا۔ ایک دن اپنے دکھ کا اظہار اس نے پنڈت رام پھل سے کیا۔ پنڈت رام پھل مسکرائے اور گردن ہلاتے ہوئے بولے 'برہما کی بدّھی اور مشتک میرے پاس ہے اور باہو بل تیرے پاس، گاؤں میرا اور تو میری شکتی، چرن داس ہریجن کو ملا لے۔ بس رام کا پھل کھائے جا'۔

ایک روز دو دوست کھیتوں کے بیچ پگڈنڈی سے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف گنّوں کی پکی ہوئی فصل آسمان کی جانب منھ اٹھائے شرشیا کی طرح بھیشم پتاما کی منتظر تھی 'اوئی چمرا کے تیری یہ ہمت کہ میرے کھیت سے بنا میری مرجی کے گنّا توڑے، سارے کسی گھمنڈ میں مت رہیو۔۔۔۔۔ ہم سید ساب کی بہت اجّت کرتے ہیں' موہن پٹ پٹ کر لال ہوتا رہا اور روتا رہا۔۔۔۔ وقت نے آنسو پونچھ دیے، دل میں گرہ لگ گئی، بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ دنوں بعد شرافت نے گنّا توڑا اور ابھی چھیلنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کا بھی وہی حال ہوا 'ابے ہوگا تو سید کا، گھر کی کھیتی ہے کیا۔۔۔۔ سارے ساری اجّت تیری کھاک میں ملا دوں گا۔۔۔۔۔ کھان ساب کی بات الگ رہی۔ ہم ان کی بہت اجّت کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے لیے تو اپنی جان دے دیں گے اور ان کے او پر آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔۔۔۔۔ ہماری طرح ان کی بھی مونچھ لمبی ہے۔۔۔۔۔ بلوان، بلوان کا ساتھی

ہوتا ہے۔سید صاحب پٹتے رہے، ارے بھئی ارے بھئی کہتے رہے اور عزت اترتی رہی۔۔۔۔۔اور ان کی شرافت خاک میں ملتی رہی۔

ایک دن ایسا بھی ہوا کہ گنّا توڑنے کے جرم میں خان صاحب کی بھی شامت آگئی، مونچھ تنی رہی اور آبرو مٹّی میں ملتی رہی۔سوچنے لگے دودھ، دہی، مٹھا اور گھی کو تو مہنگائی چاٹ گئی اور بچی کھچی پونجی، چنے کا ساگ، باجرہ، مکئی جو گاؤں ہونے کی نشانیاں تھیں تو سنسکرتی کھا گئی، تہذیب کی اس نئی پری بھاشا نے ایسی آگ لگائی کہ اس میں پریم، سادگی، ملن ساری جیسی پرانی ہر شے جل کر بھسم ہوگئی۔بس مارو، مارو، سسروں کو اِن کی بڈّھی بھرشٹ ہوگئی ہے کی گونج سارے گاؤں سنائی دے رہی ہے اور آگ اور دھوئیں کی فصل کھیتوں میں اگ رہی ہے۔

سید صاحب کی شرافت لٹی، خان صاحب کی آن بان شان مٹی، آگ جب لگتی ہے تو وہ دیکھتی کم ہے اور جلاتی زیادہ ہے۔موہن لال سمیت صدیوں سے دلتوں کی ہڈیوں کا پتہ بھی نہیں ہے۔قسمت سے گاؤں میں پنڈت رام بھگت کی لگائی ہوئی آگ سے ایک چھ سالہ معصوم بچہ کیسے بچ گیا۔خدا جانے، کہتے ہیں مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ایک مسلمان نے اپنا نصیب سمجھ کر اسے گود میں اٹھالیا اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اظہار کیا کہ میں اسے پال پوس کر بڑا کروں گا۔

دوسرے مسلمان نے کہا 'جیادہ ججباتی ہونے کی جرورت ناہی۔۔۔ یہ ہندو کا بچہ ہے۔۔۔کھول کر دیکھ لے۔

'مجھے کھول کر دیکھنے کی جرورت ناہی۔۔۔ یہ دلت کا چھورا ہے۔۔۔وہ اپنا جیتو چمار جو بیچارا جل گیا کہ جانے بچ گیا'۔

'تو مسلمان ہے کوئی ناگہانی آپھت گلے پڑ جائے گی۔۔۔اور مسلمانوں کے چار پانچ گھر مصیبت میں آجائیں گے۔۔۔تجھے یاد ہے کچھ ہی دن پہلے ٹوپی لگائے، ڈاڑھی والے مسلمان کو ان ٹھاکروں نے پنڈت رام بھگت کی شہ پر اتنا مارا کہ وہ چیختا رہا اور چلاتا رہا۔۔۔اور مر گیا۔۔۔ پورا گاؤں تماشہ دیکھتا رہا۔۔۔ پولس آئی پوچھ گچھ پر پنڈت نے بیان دیا کہ سرکار آتنک وادی تھا۔تصدیق ٹھاکروں نے کردی اور کیس ختم ہوگیا۔۔۔ مسلمان دیکھتے رہے رہ گئے۔۔۔سہمے، ڈرے، بے زبان جانوروں کی طرح۔۔۔ بارہ سالہ معصوم بچے کی آنکھیں کبوتر کی طرح ٹھہر گئی تھیں اور ان آنکھوں میں خون تھا جو پانی بن کر کوروں میں اٹک گیا تھا۔فرشتوں جیسا تقدس اس کے چہرے سے نمایاں تھا اور اس کی بے زبانی کسمپرسی کی داستان بیان کر رہی تھی۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ نیچ ذات کے یہاں پیدا ہونے والے گورے چٹّے بچے طبقہ اشرافیہ کی خوبصورت

غلطیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں، چاہے وہ عمل بالجبر ہو یا فعل راضی بارضا ہو، معاملہ خرید وفروخت کا بھی ہوسکتا ہے، بحالت مجبوری یا بر بنائے آزادی۔ دراصل محبت اور روٹی کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ پیٹ میں روٹی ہو تو انسان لومڑی کی طرح کلانچیں بھرتا ہے۔ بھوکے پیٹ تو ایک اور ایک دو روٹی یاد رہتی ہے، محبت بالعوض روٹی ہو تو اسے بھوک کہتے ہیں۔ بھوک وہ چاہے روٹی کی ہو یا عورت کی دونوں ہی صورتوں میں جسم اور جنس کا رشتہ استوار ہوتا ہے پھر زندہ رہنے کے لیے روح کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، دلت بھی بنا آتما کی جاتی ہے اور مسلمانوں کی حالت بھی اس سے زیادہ بدتر ہے۔ دونوں مسلمان بچہ کو لے کر پنڈت رام بھگت کی حویلی پر پہنچے۔

'پنڈت جی یہ ہندو بچہ ہے'۔

'کاہے۔۔۔ ہندو کیسے ہو جائے گا یہ تو دلت ہے'۔

'ہمارے پاس رہے گا تو مسلمانوں کا چلن سیکھ لے گا۔۔ اسی لیے آپ کی سیوا میں لائے ہیں'۔

اس سے پہلے پنڈت جی کچھ بولتے 'ٹھیک ہے ٹھیک ہے چھوڑ جاؤ' پنڈتائن کی آواز اندر سے آئی جو کمرے کی چوکھٹ پر کھڑی تھیں اور پنڈت جی ہچکچاتے ہوئے خاموش ہو گئے جیسے ان کا منھ کسی نے سی دیا ہو۔

دونوں مسلمان کھڑے کھڑے حویلی کی ڈیوڑھی سے لوٹ آئے اور پنڈت جی پلاسٹک کی کرسی پر اکیلے رہ گئے۔ پنڈتائن کمرے سے باہر آئیں 'ایک کونے میں پڑا رہے گا، ہزار دھندے کرے گا، فری میں تھوڑی کھائے گا۔ ہماری لاڈلی رام دلاری کا من بھی لگ جائے گا، بیچاری اکیلی رہتی ہے'۔

پنڈت جی کی دس سالہ بیٹی رام دلاری ان کو بہت عزیز تھی۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے کیوں کہ شادی کے چھ سال کے بعد بڑے ٹوٹکوں سے وہ پیدا ہوئی تھی۔ جنم سے تین سال پہلے ان کی ماتا جی رام پیاری یہ ارمان دل میں لے کر بھگوان کو پیاری ہو گئیں۔ اس کے جنم پر بڑی خوشیاں منائی گئیں پورے گاؤں میں پرساد بٹا اور دہی بورا کی دعوت ہوئی۔

'کیا ہے رے تیرا نام' پنڈت جی نے چپ کھڑے ہوئے بچے سے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ اپنے پیروں کی طرف نگاہ جمائے ہوئے۔

'ابے گونگا ہے، کیا دیکھ رہا ہے نیچے کی اور؟'۔

'اپنی پیروں کے نیچے زمین دیکھ رہا ہوں' اس نے چونک کر کہا۔

'اپنی زمین مت دیکھ، میرے جوتے دیکھ کہاں ہیں؟'۔

اس نے ادھر ادھر جوتے دیکھا اور پنڈت جی کے سامنے رکھ دیے۔

'میرے پیروں میں پہنا۔۔ تو نے اپنا نام نہیں بتایا'۔

'جی میرا نام چرن داس ہے'۔

'ہاں تو چرن داس، آج سے تو جوتے پہنائے گا، گھر کے کپڑے دھوئے گا، بھینسوں کو چارہ کھلائے گا اور رام دلاری کو اسکول پہنچائے گا اور چھٹی میں واپس لائے گا'۔

وہ سر جھکائے پنڈت جی کے تمام احکامات سنتا رہا۔

'اس کا بھی داخلہ رام دلاری کے اسکول میں کرادو، وہاں اس کی پوری دیکھ بھال رکھے گا، ساتھ لے کر اسکول جائے گا اور آئے گا۔ گاؤں کا کوئی بچہ اس کے ساتھ مار پیٹ نہ کرے دھیان رکھے گا'۔ پنڈ تائن نے ٹھوکا دیا۔

پنڈ تائین کے مفید مشورے کو سن کر پنڈت رام بھگت چراغ پا ہو گئے اور تڑخ کر بولے 'پنڈ تائن پگلا گئی ہو کیا؟'۔

'کا ہے، ہماری چھوری کی سارے دن رکھوالی کرے گا'۔

'بات شکچھا اور گیان کی ہے اس پر تو ہمارا ادھیکار ہے۔۔۔ تم تو صدیوں کی پرم پرا توڑ رہی ہو'۔

'پرمپرا تو بہت پہلے ٹوٹ گئی'۔۔۔ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

'ادھرمیوں نے دیس کا برا حال کر دیا، جاتی واد جو دھرم کی آتما ہے، کو اسے وہ جاتی واد دانو سے لڑنے کی صلاح دیتے ہیں۔ دیش کو خطرناک وائرس کے نرک میں دھکیلنے والے وہی دانو ہیں جو چھوا چھوت کا ورودھ کرتے ہیں'۔

پنڈ تائن، پنڈت رام بھگت کی جھنجھلاہٹ پر مسکرائیں۔

'شودر ہے پڑھ جائے گا تو سر پر موتے گا' پنڈت رام بھگت پھر شروع ہو گئے۔

'مجھے نہیں لگتا کہ دلت ہے، رنگ و روپ سے تو۔۔۔'

پنڈت جی سوچ کر بولے 'ہمیں بزرگوں کی دھروہر میں 'کل جگ' ملا ہے کہ زر، زمین اور کمین کے بھاؤ بڑھ گئے'۔

'موہ مایا جال میں جب دھرم ادھیکاری پھنس جائیں گے تو بھاؤ تو بڑھ ہی جائیں گے اور کمین اس لیے منھ کو آئے کہ ان کی استریوں کو اندھیاری راتوں میں اپنے بستروں میں سلایا اور تڑکے دھتکار دیا۔۔۔ ان کی پیڑھیوں میں وہی رکت سر چڑھ کر بول رہا ہے۔۔۔ دیکھو تو کتنا ملوک ہے اور نام ہے چرن داس۔۔۔'

'اوئے تو یہاں کیا کر رہا ہے۔۔۔ چل دور کونے میں بیٹھ۔۔۔' اور وہ نظریں جھکائے چوکھٹ ہی پر بیٹھ گیا۔

پنڈ تائین نے رام دلاری کو آواز لگائی 'بٹیا، چرن داس کو دو روٹی، پیاز کی گانٹھ اور ہری مرچ پروس دے'۔

رام دلاری پیتل کی تھالی پروس کر رسوئی سے جیسے ہی نکلی 'اری پتر میں لا' پنڈت رام بھگت نے آواز لگائی۔

رام دلاری الٹے پاؤں رسوئی میں لوٹ گئی۔

پنڈ تائین طنزیہ مسکرائیں اور سختی سے بولیں 'تم کاہے کے رام بھگت ہو۔۔۔۔رام کی دلاری سے کچھ نہ کہنا، یہ گھر کی لکشمی ہے۔۔۔۔' قریب کھڑے ہوئے پنڈت جی کے کان پر منھ رکھ بدبدائیں۔۔۔۔' بھول گئے چھوری گنگا جی کا وردان ہے'۔

رام بھگت کی بولتی بند ہوگئی جیسے ان کی دکھتی رگ پر ظالم نے انگلی رکھ دی ہو۔۔۔۔۔اور وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئے۔۔۔۔ چرن داس ہکا بکا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔۔۔مگر اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ماجرا کیا ہے۔

چرن داس کا داخلہ بھی رام دلاری کے اسکول میں ایک ہی کلاس میں مل گیا۔کلاس فیلوز ہونا دونوں کے ساتھ ساتھ رہنے سہنے کی وجہ بنا۔

پنڈت جی کو بچپن کی معصوم دوستی اندر ہی اندر اس لیے گدگداتی تھی کہ جگر کے ٹکڑے کا سائیں سائیں حویلی میں اکیلا پن دور ہوگیا۔۔۔۔لیکن ایک ساتھ کھان پان پر پابندی تھی، برتن علیحدہ کر دیے گئے، جنھیں وہ خود دھوتا ایک کھڑیا (چھوٹی کوٹھری) جو بھینسوں کے بھس رکھنے کی تھی دے دی گئی جس میں وہ رات کو سوتا اور پڑھتا۔اسکول کے بعد سارا دن خدمت گاری میں لگا رہتا اور گھریلو کام کاج ذمہ داری سے نبھاتا لیکن پنڈت جی کو جوتے پہنانے کا کام کبھی نہیں بھولتا۔حویلی کی حدود کے باہر ڈیوڑھی کے ایک کونے میں کتے کی طرح ایک تھالی جسے وہ ہاتھ میں لیتا اور پنڈ تائن کھانا پروس دیتیں۔اس معاملہ میں پنڈت جی کو رام دلاری پر قطعاً وشواس نہیں تھا کیوں کہ ایک دن صحت مند کھان کی تھالی پروسنے کو وہ دیکھ چکے تھے۔۔۔۔اس میں کوئی گھاٹا نہیں تھا کہ تین پراڑیوں کے پریوار کا بچا کھچا جھوٹن اور خوراک کی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے کچھ تازہ کھانا اس میں ڈال دیا جاتا۔خصوصی طور سے پنڈت جی کی موجودگی میں یہ معمول رہتا۔۔۔۔اور ان کی غیر موجودگی میں پنڈ تائین کی آنکھ بچا کر تازہ بھوجن کی صحت مند تھالی رام دلاری، چرن داس کو ایسے کھلاتی جیسے وہ بھی پریوار کا چوتھا پراڑی اور اہم سدسیہ ہو۔

دسواں درجہ امتیازی نمبروں سے پاس کرنے پر پنڈت جی کو ایک جلن اور کڑھن ہوئی، سوچنے

لگے، دلت کے مقابلے میں پنڈت کی بیٹی گیان شکچھا جس پر اس کا جنم سدھ ادھیکار ہے کیوں کر پیچھے ہو۔ انھوں نے اپنے دکھ کا اظہار اپنی دھرم پتنی سے کیا تو وہ مسکرائی اور کہنے لگی 'گیان اور شکچھا کسی ویکتی وشیش کی جا گیر نہیں۔ جو محنت کرے گا، لگن اور دھیان سے پراپت کرے گا، یہ اسی کی سگی ہوتی ہے'۔

یہ سن کر خاموش ہو گئے اور تلملاتے ہوئے منھ ہی منھ میں بڑبڑائے 'ہے رام۔۔۔۔ کانوں میں سیسہ پگھلانے کا رواج کیوں سماپت ہو گیا' اور من ہی من میں سنو و دھان اور سنو و دھان رچیتا کو کوسنے لگے۔۔۔۔ نیچ ذات جب سے گیانی ہوئے ہیں یہ تو آزادی اور ادھیکاروں کی بات کرنے لگے۔۔۔۔ برہمنی دور میں اسی لیے ان کا پھن کچلا جاتا تھا کہ اگر نچلی جاتی کے گیانی ہو گئے تو

سانپ کی طرح برہمنوں کو ڈس لیں گے۔۔۔۔

'ہاں جی۔۔۔ کن و چاروں میں ڈوبے ہو۔۔۔ زیادہ مت سوچو۔۔۔ اس بہانے سے ہماری بٹیا پڑھ لکھ کر ودوان ہو رہی ہے۔۔۔۔ ورنہ دیہاتی گنوار رہ جائے گی۔۔۔۔ چرن داس اس کی بہت مدد کرتا ہے'۔

اس رات پنڈت جی سو نہیں سکے یہ سوچ کر کہ برہمن کی بیٹی ایک دلت کے احسان سے شکچھا میں رو چی لیتی ہے۔۔۔۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دی کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔۔۔۔ ہم اس نیچ کو یہ یاد دلاتے رہیں گے کہ تو دلت ہے۔۔۔۔ تا کہ زیادہ اڑان نہ بھر سکے اور بیٹی کا غلام بنا رہے۔

وقت کسی کا سگا نہیں ہوتا بڑے بڑے بلوان اور باہو بلی اس کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں۔ ایک منھ زور گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑے جا رہا تھا اور چرن داس اس گھوڑے کی لگام پوری طاقت سے تھامے تھا اور وہ اس کے زانوؤں کی گرفت میں جیسے بے بس ہو۔ ایک ماہر شہ سوار کی طرح اسے سمت و رفتار دے رہا تھا۔ گریجویشن میں چرن داس نے ٹاپ کیا اور رام دلاری نے فرسٹ ڈویژن کی ڈگری اس کے چرنوں میں رکھتے ہوئے کہا 'یہ تمھاری بدولت ہے' وہ مسکرایا 'یہ شکچھا ہے اس کی قدر کرو'۔

دونوں نے ایم۔ اے سیاسیات میں داخلہ لے لیا تھا۔ ادھر نہایت خاموشی سے چرن داس نے ایلائڈ سروس کی تیاری شروع کر دی چوں کہ وہ جانتا تھا کہ پنڈت رام بھگت کے سینے میں سانپ لوٹ جائے گا۔ وہ پوری لگن اور دلچسپی سے رام دلاری کی تعلیم پر بھی توجہ دے رہا تھا۔ رام دلاری اپنی تعلیم سے زیادہ چرن داس پر ایسی توجہ دے رہی تھی کہ دل ہی دل میں وہ اس کی چرن داسی بنتی جا رہی تھی۔ دراصل بیل نزدیکی درخت پر پروان چڑھتی ہے۔ چرن داس کا قریب ہونا، گھر میں رہنا، کلاس فیلو کا دوستی میں بدلنا یہ سب پریم سیڑھیاں ہیں۔ پنڈت رام بھگت کے چرنوں سے نکل کر چرن داس رام دلاری کے دل میں رام بن کر سما گیا تھا۔

کلاس کے بعد، دونوں اسٹوڈنٹس کینٹین کے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ چاروں طرف طلبا کی گپ

شب، ہنسی دل لگی اور مباحثوں کی گونج میں پرچ پیالیوں کے کھنکنے کا شور بھی شامل ہو گیا تھا۔ آج کا لیکچر 'شہریوں کے بنیادی حقوق' موضوع بحث تھا۔

'آئین نے تمام شہریوں کو برابری کے حقوق دیے ہیں' رام دلاری نے گفتگو شروع کی۔

'آزادی کے بعد بھی انسانی استحصال کا سب سے بھیانک روپ ہمیں ذات پات کی تفریق اور مذہبی تعصب میں نظر آتا ہے' چرن داس نے کہا۔

'مسلم معاشرہ بھی اس سے الگ نہیں وہاں بھی ادنیٰ و اعلیٰ، چھوٹا بڑا، اونچ نیچ کا فرق بری صورت میں قائم ہے'۔

'مسلمان انسانی مساوات کا تصور اپنے ساتھ لے کر آئے لیکن ہندو معاشرہ کے اثرات نے اسے توڑ دیا۔۔۔۔ان کے سماج میں برہمن وادی تقسیم اس قدر مضبوط ہو گئی ہے کہ ان کے اندر بھی سید، پٹھان اور دھنے جلاہے کا فرق نظر آنے لگا ہے' چرن داس نے تاریخی حوالے سے اپنی بات کہی۔

'لیکن اس فرق نے ظالمانہ صورت اختیار نہیں کی ہے، صرف شادی بیاہ اور دیگر معاشرتی مسائل میں دکھائی پڑتا ہے'۔ رام دلاری نے کہا۔

'وہ بے چاری ہم سے زیادہ مظلوم قوم ہے کیوں کہ اس کا سب سے بڑا جرم تو مسلمان ہونا ہے مطلب آتنک وادی ہونا ہے۔ قدرتی آفت ہو یا دیش کے دیگر مسائل پیدا کرنے کا ذمہ دار ہونے کے سبب بھیانک ظلم کا شکار بھی ہوتا ہے'۔

'چھوڑو، کیا لے کر بیٹھ گئے ظلم وستم کی باتیں۔۔۔۔اپنے غموں سے فرصت نہیں، کیوں دوسروں کے دکھ درد کا حساب کریں'۔ رام دلاری نے مسکراتے ہوئے چرن داس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

چرن داس نے کینٹین کے چاروں طرف طائرانہ نظر ڈالی اور رام دلاری سے مخاطب ہوا 'کیا کہہ رہی ہو؟'

'کچھ نہیں۔۔۔۔تمھاری آنکھوں میں جھانک رہی ہوں' زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

'رہنے دو، ڈوب جاؤ گی'۔

'کبھی نہ ابھرنے کے لیے ڈوبنا چاہتی ہوں'' سنجیدگی سے:

'کیوں؟'۔

'موتی چننے کے لیے ڈوبنا ضروری ہے'۔

'جب تہہ میں جا کر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔۔۔۔تو آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب جاتی ہیں'۔

'نہیں۔۔۔۔موتی بٹورتی ہیں۔۔۔۔'(وقفے کے بعد) رام دلاری نے مسکراتے ہوئے کہا 'تم

میرے دل میں براجمان ہو۔

'تم رام بھکت کی رام دلاری ہو۔۔۔۔ چرن کا دل میں براجمان ہونا، توہین دل ہے'۔

'تمھارے چرنوں میں آنکھیں بچھانا ہی میرے لیے سورگ سے کم نہیں'، رام دلاری کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب رہی تھیں۔

چرن داس سنجیدگی سے مسکرایا اور رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے مس کرتے ہوئے بولا''انھیں بچا کے رکھو یہ بہت قیمتی ہیں'۔

شب تار کالے بادلوں میں لپٹ کر ڈراؤنی ہوگئی تھی۔ بھیانک بجلی تڑکی، بادل گرجے اور ایسی طوفانی بارش ہوئی کہ چاروں طرف ماہ مئی کی لگائی آگ ٹھنڈی ہوگئی ہو۔ سیاہ بادل چھٹے آسمان کا سینہ چیر کر وہ صبح نمودار ہوئی جو سعی و جہد کے بعد کوئی پیغام لاتی ہے۔

چرن داس کے ڈی ایم ہونے کی اطلاع نے رام بھکت کے سر پر بم پھوٹنے کا سا کام کیا۔ منہ ہی منہ میں بدبدایا 'اب یہ ڈھیڑا ہمارے او پر راج کریں گے'دل ہی دل میں کرانتی کاریوں کو گالی دی۔ کیا اس دن کے لیے دیس کو آزاد کرایا تھا، گوروں کا راج کیا برا تھا جن کے بارے میں منوسمرتی بھی خاموش ہے۔ ان کی گنتی بروں میں ہے نہ اچھوں میں۔۔۔۔ دور ریڈیو سے آواز آرہی تھی، ایسا کل جگ آئے گا، ہنس چگے گا دانہ دنکا کوّا موتی کھائے گا۔ گانے کے انکشاف سے ہونٹ ہی ہونٹ میں محمد رفیع کو کوسا۔۔۔۔ اور منہ پر تالا سا لگ گیا۔

پنڈ تائی پیتل کی تھالی میں کھوئے کے لڈو لائیں اور اپنے ہاتھوں سے چرن داس کے منہ میں رکھنے لگیں اور اسی ہاتھ سے رام دلاری اور پنڈت جی کو کھلائے۔

چرن داس نے جھک کر جیسے ہی پنڈت جی کے ننگے پاؤں میں جوتے پہنانے کی کوشش کی وہ ایک ہی جھٹکے میں پیچھے ہٹے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے، 'سرکار! مجھے کیوں پاپ کا بھاگیدار بنا رہے ہیں؟'۔

اس بدلتے منظر نامے کو دیکھ کر رام دلاری مسکرا رہی تھی اور چرن داس کھڑا اپنے پاؤں کے نیچے اپنی زمین تلاش کر رہا تھا۔

پنڈت رام بھکت، پنڈ تائین کے کان میں کہہ رہے تھے'' دونوں کی سیتا اور رام کی سی جوڑی لگتی ہے'۔

ہاں کہہ کر اوپر نیچے گردن ہلا رہی تھیں، سورج کی کرنیں چاروں طرف پھیل چکی تھیں۔

رخصت ہوتے وقت رام دلاری کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے یا کہ بچھڑنے کا غم یہ خود اس کو بھی پتہ نہیں تھا۔

'ان آنسوؤں کو بچا کر رکھو، یہ بہت قیمتی ہیں بعد میں کام آئیں گے'۔ چرن داس نے مسکراتے

ہوئے اسے تسلی دی۔

دن، دنوں میں بدلے منتظر آنکھیں پتھرانے لگیں۔۔۔۔ جب کیفیت نے شدت اختیار کی تو محبت کی بیماری دل سے جسم کو لگنے لگی۔ مہینے سال میں بدل گئے، دو سال تک چرن داس کا نہ فون آیا اور نہ ہی کوئی اطلاع ملی۔ رام دلاری کو کوئی ایسا جان لیوا روگ لگا جس نے پرانی عشقیہ داستانوں کی یادیں تازہ کر دیں جس میں محبوب کے لیے جان قربان کر دی جاتی ہے۔۔۔۔۔ پریم روگ نے اندر ہی اندر جسم کو دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا۔ کھانسی، بخار اور کمزوری نے ٹی بی کی شکل اختیار کر لی۔ لاغر بدن پیلا پڑتا گیا۔ آخر کار بستر سے لگ گئی۔۔۔۔ اور لب و دہن پر چرن داس نام کے وظیفہ کی رٹ لگ گئی۔

چرن داس کی اپنی زندگی تھی اور زندگی نوکری کے لیے وقف تھی۔ اپنے ہی سماج میں اس نے ایک خوبصورت لڑکی سے یہ سوچ کر شادی کر لی کہ دلت کو ڈی ایم کی بیوی کہلانے کا مان نصیب ہو جو اسی کا حق ہے۔

ادھر رام دلاری کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی، پریم کا لاعلاج روگ کسی کسی کو ایسا لگتا ہے کہ آزارِ جاں بن جاتا ہے۔ رام بھکت کے سمجھانے بجھانے کے باوجود اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میری آخری ملاقات کرا دی جائے۔

مرینہ سے گوالیار صرف ایک گھنٹہ کا سفر تھا۔ دوسروں کی مدد سے رام دلاری کو کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا اور پنڈت جی آگے ڈرائیور کی سیٹ کے قریب بیٹھ گئے۔ کار ہوا کی رفتار سے ڈی ایم آفس پہنچی۔

پنڈت جی نے ڈی ایم۔ آفس کی نیم پلیٹ پر نظر ڈالی، سی ڈی گوتم (آئی اے ایس) سوچنے لگے چرن داس کا پد بڑا ہو گیا لیکن نام سکڑ کر چھوٹا ہو گیا۔ ڈی ایم کی اجازت سے آفس کے اندر داخل ہوئے اور جاتے ہی ایک ہی سرعت میں چرنوں میں گر گئے اور سسکتے ہوئے بولے 'سرکار! رام دلاری نے آپ کا بہت انتظار کیا۔۔۔۔ انتظار کی آخری گھڑی آپ کے درشن کے لیے تڑپ رہی ہے'۔

اسی لمحہ چرن داس آفس سے نکلے، کار کی پچھلی کھڑکی کھولی، رام دلاری آخری سانسیں گن رہی تھیں۔ منتظر آنکھیں کھلنے کے ساتھ اس کی بندھی مٹھی کھلی، ہتھیلی پر سندور کی ڈبیہ کا ڈھکن کھلا تھا۔ 'تم میرے من مندر میں دیوتا کی طرح براجمان ہو'۔

اس نے چٹکی بھر سندور مانگ میں بھرا، رام دلاری کو لگا کہ 'مانگ کا مون پر درشن' جیسے سپھل ہو گیا ہو، ہونٹوں پر آخری مسکراہٹ کو لیے صدا کے لیے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر مجاہد مرزا
ماسکو، روس

ریٹائرمنٹ

شاہد صدیقی کی اہلیہ جسے اس نے کبھی بیوی نہیں جانا تھا، اس کے لیے گرم چائے کی پیالی دوسری طرف دھرنے کو جھکی تو سہارا لینے کی غرض سے اسے اپنا ایک ہاتھ شوہر کی دائیں ٹانگ کی ران پر دھرنا پڑا تھا۔ چند روز سے شدید زکام میں مبتلا ہونے کی وجہ سے شاہد صدیقی کا بدن ویسے ہی دردوں کی پوٹلی بنا ہوا تھا۔ اسے اس کے ہاتھ کے اتفاقی دباؤ سے لمحہ بھر کا سکون محسوس ہوا تو بولا کہ میری رانیں دبا دو۔ بیوی نے ایک نگاہِ تغافل اس کی جانب ڈالی جس کی بے اعتنائی کو رفع کرنے کی خاطر شاہد صدیقی نے خجل سی مسکان مسکراتے ہوئے کہا کہ بھئی میں بیمار ہوں۔ بس وہ تڑخ گئی اور خم ٹھونک کے کھڑی ہوگئی اور لگی بولنے: 'میں بیمار ہوتی ہوں تو کبھی پوچھا کیا؟ اس روز دواخانے گئے تو مٹھی بھر دوا اپنے لیے لیتے آئے لیکن یہ نہ ہوا کہ بیوی کے لیے بھی دوا لے آتے'۔

ایسی ہی باتیں ہوتیں اور وہ بھی تب سے جب سے شاہد صدیقی کو بیوی بچوں کے ہمراہ رہنا پڑا تھا۔ ایسا نہیں کہ سوال گندم جواب چنا کی سی صورت حال اوائل سے ہی نہیں تھی۔ شاہد صدیقی کو بیاہ کا خیال کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ وہ بیس برس کی عمر سے ہی بہ طور سرکاری کمپاؤنڈر مختلف ہسپتالوں میں کام کرتا رہا تھا۔ کبھی اس سے آگے بڑھ کر سوچا تھا ہی نہیں۔ سوچتا بھی کیوں، اکیلی جان، شوق کوئی خاص تھے نہیں۔ والدین اس کے بچپن میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ایک بھائی تھا جس نے اپنی بیوی کی شدید مخالفت کے باوجود اسے دسویں جماعت تک پڑھا دیا تھا جس کے بعد وہ کمپاؤنڈری سکھانے کے سکول چلا گیا تھا۔ سرکاری خرچ تھا۔ اسے بھابی کے رویے کی وجہ سے بھائی کے گھر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی اور بھائی نے بھی مڑ کے نہیں پوچھا تھا۔

ایک عرصہ دلی، آگرہ اور گوڑگاؤں کے ہسپتالوں میں کام کرتے اس کا شہروں سے جی اوبھ گیا تھا۔ محکمہ صحت کے سپرنٹنڈنٹ بلمپت سانٹھے اس پر مہربان تھے۔ جب شاہد صدیقی نے ان سے اپنی اکتاہٹ کا ذکر کیا تو انھوں نے اسے کہا کہ آسام کی بستی بندنگ میں اسامی ہے، چاہو تو میں وہاں تمھیں بھجوانے کا بندوبست کر سکتا ہوں، وہ رضامند ہو گیا تھا اور بوریا بستر سمیٹ کے پندرہ روز بعد ہی بندنگ جا پہنچا تھا۔ ہسپتال میں ہی ایک چھوٹا سا کوارٹر اسے رہنے کو مل گیا تھا۔

ٹھگنے قد کی ایک ہنسوڑسی لڑکی بستی سے ایک بار ڈسپنسری آئی تو بائیس برس کی اس عام سی لڑکی کی پچپن برس کے شاہد صدیقی سے اچھی دعا سلام ہوگئی تھی۔لڑکی کا نام گل دانہ تھا جس کے اجداد افغانستان کے ہزارہ قبائل سے تھے۔صرف اس لڑکی کا بات بے بات ہنسنا اور اچھا سبھاؤ ان دونوں کے نزدیک آنے کی وجہ بن گئے تھے۔لڑکی کا ایک بھائی تھا،اس سے چھوٹا جو چائے کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔بھائی کو جب پتا چلا کہ ڈسپنسر شاہد صدیقی سے اس کی آپا کا سلوک ہے تو اس نے ایک روز خود ہی جا کر شاہد صدیقی سے بہن کے رشتے کی بات کی تھی۔شاہد کو نہ گل دانہ میں دلچسپی تھی نہ ہی اس کے خیال میں وہ مناسب تھی کیوں کہ لڑکی کی رانیں بہت فربہ اور ٹانگیں چھوٹی تھیں۔سر کے بال بھی چھدرے تھے اور ایک آنکھ بھی بعض اوقات ایسے لگتی جیسے وہ دوسری آنکھ سے چھوٹی ہو۔سرین بھاری تھے۔اسے یوں لگتا جیسے وہ چوکور بلکہ مستطیل تکیہ ہو۔

لیکن وہ اکیلا تھا۔اس نے سوچا چلو کیا مضائقہ ہے،بیوی کی بیوی ہوگی اور خدمت بھی کرتی رہے گی۔ اس نے ہاں کر دی۔گل دانہ کے بھائی نے اپنی آپا کو یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ ہمارا ایک کمرے کا گھر ہے۔جہیز دینے کو کچھ ہے نہیں۔شاہد صدیقی سرکاری ملازم ہے۔نکاح ہونے کے دو ماہ بعد ہی شاہد صدیقی کا تبادلہ اسی کلومیٹر دور کر دیا گیا تھا۔وہ کبھی دو ہفتے کے بعد تو کبھی تین ہفتوں کے بعد گل دانہ کے ہاں آتا۔بھائی دن بھر کے لیے کام پہ چلا جاتا اور انھیں میاں بیوی ہونے کا موقع مل جاتا۔یوں پانچ برس میں چار بچے ہو گئے تھے۔

ساٹھ سال کی عمر میں اسے پنشن دے دی گئی تھی۔آخر بچوں کو پالنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ایک بار پھر سانٹھے صاحب کام آئے تھے۔اگر چہ وہ بھی ریٹائر ہو چکے تھے مگر ان کا ایک شناسا ڈاکٹر جیسلمیر میں تھا،وہ یہی کر سکتے تھے کہ اسے سفارشی رقعہ لکھ دیتے۔

کہاں آسام کہاں راجستھان۔مگر بے کس لوگوں کی بھی بھلا کوئی زندگی ہوتی ہے۔بیوی کو سمجھا بجھا کے وہ جیسلمیر چلا آیا تھا۔ملازمت مل گئی تھی،تنخواہ کم تھی۔وہ ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے ملحق ایک کمرے میں ان کے ڈرائیور اور مالی کے ساتھ رہتا رہا،خود پہ حسب عادت نہ ہونے کے برابر خرچ کرتا اور باقی گھر یعنی گل دانہ کو بھجوا دیتا۔

سات سال بیت گئے۔بچے پہلے سے بڑے ہو گئے۔گل دانہ کے بھائی نے بھی بیاہ کر لیا۔اب ضروری ہوگیا کہ بیوی بچوں کو لے آیا جائے۔ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے اس نے گل دانہ اور بچوں کو بلا لیا تھا۔ گل دانہ ڈاکٹر صاحب کے گھر کا کام کرتی اور بوڑھا ہو چکا شاہد صدیقی بچوں کے ساتھ کرائے پر لیے ایک کمرے اور باورچی خانے والے گھر میں رہتا۔اب وہ کبھی کبھار ہی ڈاکٹر صاحب کے کلینک جا سکتا تھا کیوں کہ اس کے

گھٹنوں کے جوڑ سوج گئے تھے۔

ہنس مکھ گل دانہ بالکل بدل چکی تھی۔ جسم اس کا بھی ڈھلنے لگا تھا۔ یوں شاہد کے لیے وہ قابل توجہ نہیں رہی تھی۔ شاہد صدیقی کی تمام عادات جن کی وہ عادی نہیں تھی، اسے زہر لگنے لگی تھیں۔ شاہد اگر کوئی بات کرتا تو وہ اس کا جواب دینے کے بجائے بلاوجہ جلی کٹی سنانے لگ جاتی۔ شاہد بہت ضبط کرتا مگر پھٹ پڑتا۔ وہ اسے طعنے دیتی کہ ٹانگ پہ ٹانگ دھرے لیٹے رہتے ہو، بچے بڑے ہو رہے ہیں کوئی ان کی فکر نہیں آپ کو۔ وہ چیخ پڑتا کہ آخر اس عمر میں وہ کیا کرے۔ وہ کہتی لوگ تو اسی سال کی عمر تک بھی کام کرتے ہیں اور آپ سڑسٹھ برس کی عمر میں چار پائی سے لگ کے بیٹھ گئے ہیں۔

شاہد صدیقی کا کبھی کبھار تو دل کرتا کہ خودکشی کر لے مگر پھر استغفار پڑھتا۔ اسے ساری عمر بچوں کے ساتھ رہنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ بچے شور کرتے اور شرارتیں بھی۔ وہ جھنجھلا کے بچوں کو ڈانٹتا تو گل دانہ کود کے سامنے آجاتی اور اس کے اونچا بولنے پر معترض ہو کے ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔

وہ اس کے قریب نہیں لگتی تھی، کبھی اسے شاہد صدیقی کی سڑی ہوئی داڑھ کے سبب اس کے منہ سے بساند آتی تو کبھی اسے لگتا کہ جو مرد وا عورت کو مطمئن نہ کرے بس اپنا مطلب پورا کرے اس کے قریب کیا جانا؟ کبھی کہتی دانت صاف کر کے میرے نزدیک آئیں اور کبھی کہتی مجھے تو کسی مرد کی قربت کی ضرورت ہی نہیں۔

اب خود شاہد صدیقی بھی گل دانہ کی قربت سے گریز کرنے لگا تھا کیوں کہ وہ کہتی کہ جب تک مجھے پوری طرح انگیخت نہ کر لیں، کچھ اور مت کریں۔ اگرچہ دونوں کے ذوق میں خاصا فرق تھا مگر وہ خدا کے لیے، خدا کے لیے کہتے ہوئے جاری رکھنے کو کہتی، جب تک گل دانہ معراج کے نزدیک پہنچنے کو ہوتی، شاہد صدیقی کا کام تمام ہو جاتا۔ شاہد صدیقی کو اپنا آپ تو پرانا ٹرک نہ لگتا لیکن بیوی ایسے لگتی جیسے پرانی گاڑی جو گرم کیسے بنا اور دھکا لگائے بغیر سٹارٹ نہ ہوتی ہو۔ اس کے بارے میں یہ سوچتا اور لاحول ولا قوہ پڑھتے ہوئے اپنی سوچ سے نفرت کرتا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری
ہندواڑہ، جموں وکشمیر

داستانِ شوقین

زندگی ایک سبک رفتار دریا کی طرح سفر کرتی ہے۔آگے بڑھتی ہے۔راستے میں چاہے گھاس پھونس آئے یا پتھروں سے ٹکرائے لیکن سفر جاری رہتا ہے۔دریا کارواں سفر سمندر کے گہرے اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے اور زندگی کا سفر بھی۔۔۔؟اس بارے میں انسان صرف سوچ سکتا ہے،باقی کچھ بھی نہیں۔میرے اندر کا دریا بھی اب سمندر کے گہرے اندھیرے کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے بعد والے سفر پر میں بھی صرف سوچ سکتا ہوں۔۔۔دوسرے کئی لوگوں کی طرح۔۔۔۔۔!

زندگی کا یہ دریا تجربات ومشاہدات اور احساسات وجذبات کے پانی سے بنتا ہے جس کی سطح پر خوشیوں کے خوبصورت پھول بھی تیرتے ہیں اور گہرائی میں غموں کے پتھر بھی ڈولتے رہتے ہیں۔انسان کی زندگی بھی ایک دریا کی طرح سفر کرتی ہے اور جب اچانک کسی چہرے کا خوبصورت عکس پانی سے ابھرتا ہے تو انسان کی نظروں کو مسحور کر کے دل و دماغ پر بھی سحر طاری کر دیتا ہے۔یہ تو انسان کی فطرت ہے کہ وہ خوبصورت شے کو دیکھ کر مسرور ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مسرور نہ ہو جائے تو اس کا جمالیاتی احساس مردہ ہوا ہوگا۔میں دریا کنارے زندگی کے نشیب وفراز میں کھویا ہوا ہوں۔دریا سے آرہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور ابھرتی ڈوبتی لہروں کی مستی سے محظوظ ہو رہا ہوں۔ماضی کی حسین یادیں دل و دماغ میں نقارہ بجا بجا کر ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا رہی ہیں۔ان ابھرتی ڈوبتی لہروں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے درمیان ایک جل پری ساحل کی طرف بڑھتی ہے۔ ساحل پر پہنچ کر وہ ایک ناگن کی طرح انگڑائی لیتی ہے۔اس کے خوبصورت پیر ریت پر چلتے ہوئے سفید خرگوش کے نرم و نازک پیر لگ رہے ہیں جو ریت کی جلن سے جیسے گھوڑے کی دلکی چال چل رہے ہیں۔میرے چہرے کو گیلے بالوں کے شبنمی قطرے فرحت پہنچا رہے ہیں۔میں ہوا کے خوش گوار جھونکے کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جس نے مجھے یہ راحت پہنچانے میں دوستی کا ثبوت دیا۔میرے ہاتھ میں شاعروں کے شاعر اسپنسر کی شہرۂ آفاق کتاب 'فیری کوئین' ہے۔جل پری سامنے سے گزرتے ہوئے ایک نشیلی نظر مجھ پر ڈالتی ہے یا کتاب پر، مجھے پتہ نہیں چلتا۔میری مدہوش آنکھیں جل پری کے گلابی سراپے کا دیدار اس وقت تک کرتی ہیں جب تک نہ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔میں کافی دیر تک اس کے سحر انگیز حسن کا اسیر ہو کر رہ جاتا

ہوں۔اب فیری کوئین کے مطالعہ کا جادو جل پری کے سحر میں تبدیل ہو چکا ہے اور گھر پہنچ کر بھی دل و دماغ پر بے قراری کا عالم چھایا رہتا ہے۔شب بھر عجیب قسم کا خمار دماغ کی آزادی کو غلام کر جاتا ہے۔دل کا کبوتر درگاہِ گنبد کی خاموش فضا کے برعکس جنگل کی سائیں سائیں کرتی ہواؤں میں رقص کرنا چاہتا ہے۔وہ افیمِ عشق کے نشے میں مست ہوا ہے۔سمجھانے کے باوجود کہ جل پریوں کی فینٹسی میں گرفتار ہونا' کرب کے عالم میں انگاروں پر لیٹنا ہے'اس بار رقصِ اسیری کے لیے پھڑ پھڑا رہا ہے۔

وقت کا دریا بہتا رہا۔دل کا کبوتر بھی کبھی کبھی فینٹسی کے جال میں غٹرغوں غٹروں کرتا رہا۔ایک دن اچانک یونی ورسٹی کے کتب خانے میں میری سماعت کو کسی کی جادو بھری رسیلی آواز نے یہ کہتے ہوئے اپنی طرف کھینچا کہ کیا آپ ہی شوقین صاحب ہیں؟ کتاب سے نظر ہٹا کر چہرے کو دیکھتے ہی میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔حیرانی کے عالم میں ؛ میں نہ ہاں کہہ سکا اور نہ ہی نا۔بس خاموش بت بنا اسے دیکھتا رہا۔مجھے زندگی میں پہلی بار تجربہ ہوا کہ فینٹسی بھی کبھی کبھی حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے۔اس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کی پتیاں چمک رہی تھیں۔گلابی ہونٹوں نے جب دوبارہ میرا نام دہرایا تو مجھے اپنے جذباتی احساس کے کانٹے کی چبھن دل پر محسوس ہوئی اور منہ سے نکل پڑا:

'جی۔۔۔میں ہی شوقین ہوں'۔

'اچھا۔۔۔'اس کے گلابی ہونٹ پھر سے ہلنے لگے۔'صبح سے آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں،اب کسی اسکالر سے آپ کا موبائل نمبر لیا تو کال کنیکٹ نہیں ہو رہی تھی ،پھر انھوں نے ہی بتا یا کہ شاید وہ لائبریری میں ہونگے،وہاں پر اکثر سگنل پرابلم ہوتی ہے تو میں یہاں پر چلی آئی'۔

اس کے شہد بھرے الفاظ سن کر مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا واقعی گلستان ریگستان کی تلاش میں نکل آیا ہے۔میرے سوکھے لب ہلے:

'کیوں،کیا کوئی کام ہے؟ویسے یہاں پر میں نے آپ کو آج پہلی بار دیکھا ہے'۔

'جی۔۔۔'گلابی ہونٹ وا ہوئے،'آپ صحیح فرما رہے ہیں،دراصل میرا داخلہ پی ایچ ڈی میں ہوا ہے،اب موضوع کے مواد سے متعلق میڈم سے مشورہ ہو رہا تھا تو انھوں نے آپ سے ملنے کے لیے کہا اور یہ بھی بتایا کہ ایک تو آپ سینئر ہیں اور دوسرے ہمارے موضوعات بھی کچھ حد تک ملتے جلتے ہیں'۔

'اچھا اچھا،کوئی مسئلہ نہیں ہے'۔اب میں سنجیدہ ہو کر بول پڑا۔'دراصل میں نے ایم۔فل بھی کیا ہے اس لیے یہ سینئر کا لفظ نمودار ہو گیا۔نہیں تو ہم غالباً ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں'۔

یہ سن کر وہ تھوڑا بہت مسکرائی اور بول پڑی:

'پھر تو اور بھی اچھی بات ہے۔آپ کی تو Research Methodology پر خاص نظر ہوگی'۔
'خاص تو نہیں کہہ سکتا' تاہم تھوڑا بہت پتہ ہے'۔میں انکساری کے ساتھ ساتھ تھوڑا اسینئر ہونے کا وزن بھی بڑھانے لگا۔
'مثلاً مواد کی تلاش،تحقیق کا طریقۂ کار،ابواب بندی،کتابیات وغیرہ۔ویسے آپ کا موضوع کیا ہے؟''۔
'میں سمجھتی تھی کہ آپ پہلے میرا نام پوچھیں گے'۔اس کے لہجے میں سریلی شوخی نمودار ہوئی: 'لیکن اسکالر جو ٹھہرے'اس لیے صرف ریسرچ کے ہی گن گانے لگے'۔
اس نے جب دبے لفظوں میں نام نہ پوچھنے کا گلہ کیا اور مقالے کا خاکہ بھی ٹیبل پر رکھا دیا تو میں خاکے میں ابواب پر نظر ڈالتے ہوئے دل ہی دل میں خوش ہوا کہ چلو ٹھیک ہی ہوا جو اس نے خود ہی یہ راگ چھیڑا،میں ہنس کر بولا کہ آپ کا نام خاکے پر بھی موجود ہے، پھر بھی آپ سے سننا چاہوں گا۔باقی رہی موضوع اور ابواب کی بات تو دو باب کچھ حد تک ایک جیسے ہیں،ان کے لیے فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔
'شائستہ۔ہہ۔ہہ۔۔۔'اس کے گلابی لبوں سے شائستہ لہجے میں نکلا۔
'شائستہ'میرے لبوں نے بھی دھیمی آواز میں دہرایا: 'واہ،نام تو آپ کے لہجے کی طرح ہی شائستہ ہے۔آپ کی سوچ اور صورت کے عین مطابق۔بہر حال'جب بھی آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے گی تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بتا دینا'۔
'جب بھی کیا'اب تو کئی برسوں تک ضرورت پڑے گی۔جب تک نہ ڈگری مل جائے'۔وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔
'میرے پاس آپ کا نمبر ہے،آپ بھی میرا نمبر سیو کریں تا کہ فون پر بھی گفتگو ہوتی رہے'۔
اس کے ہنسنے کی آواز سن کر میں ادھر ادھر جھانکنے لگا اور مطمئن ہوا کہ اس وقت لائبریری میں ہمارے نزدیک کوئی نہیں بیٹھا ہے،نہیں تو وہ ڈسٹرب ہو جاتا۔میں نے اس کا نمبر سیو کر لیا۔اب وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بول پڑی کہ ویسے شوقین صاحب،آپ کے دیدار دریا کے کنارے پر بھی ہوئے ہیں۔آپ کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔اب پتہ چلا کہ آپ واقعی نام کے ہی نہیں کام کے بھی شوقین ہیں۔وہاں پر بھی کتاب سے دوستی اور یہاں پر بھی اس سے رشتہ۔میں یہ سوچ کر فوراً بول پڑا کہیں وہ میری بات سنے بغیر ہی نہ چلی جائے،ہاں وہ انگریزی شاعر اسپنسر کی مشہور کتاب 'فیری کوئین'تھی لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ وہاں پر بھی پانی سے اصلی فیری کوئین نکلے گی اور پھر اس کے ساتھ ملاقات ہوگی،یہ سن کر وہ مسکرائی اور شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔
اس کے چلے جانے کے بعد جیسے کئی دنوں کی بے قراری کو قرار آگیا۔میرے دل و دماغ پر جل

پری کی جو فینٹسی چھائی ہوئی تھی اب وہ حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔ میں تھوڑی دیر تک شائستہ کے خیالات میں ہی کھویا رہا پھر دوبارہ مطالعہ کرنے میں لگ گیا لیکن اب مطالعہ کی پہلی والی کشش ماند پڑ گئی اور شام چھ بجے میں ہوسٹل چلا آیا۔ وہاں پر کمرہ لاک تھا، پتہ نہیں میرا روم میٹ سجاد کہاں پر غائب تھا۔ میں نے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں بیڈ پر کتابیں بے ترتیب پڑی تھیں۔ پہلے کتابیں جمع کر کے ٹیبل پر رکھ دیں اور پھر وارڈ روب سے رات کا ڈریس نکال کر پہن لیا۔ فریج کا دروازہ کھول کر ٹھنڈا مشروب ڈھونڈنے لگا لیکن اس میں آم اور کیلوں کے بغیر کچھ بھی نہیں تھا۔ فریج کو بند کرتے ہوئے سجاد پر تھوڑا بہت غصہ آیا کہ ہمیشہ فریج کو خالی کر جاتا ہے۔ اب میں ستانے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا۔ ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ سجاد ہاتھ میں مشروب کی دو تین بوتلیں لے کر حاضر ہوا اور مجھے وہاں پر دیکھتے ہی بول پڑا کہ یار، مجھے معلوم تھا کہ اگر آپ روم میں آئے ہوں گے تو فریج خالی دیکھ کر مجھے میٹھے میٹھے لفظوں سے ضرور نوازا ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ چند دوست ایک گھنٹے تک یہاں پر گپ شپ مار رہے تھے تو میں اگر انھیں جوس کے لیے نا بھی کہتا تو بھی وہ کہاں ماننے والے تھے۔ اس لیے سارا ختم ہوگیا۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ لیجیے جناب جوس اور یہ رہا پانی۔ شوق سے اپنی پیاس بجھائیں۔ سجاد کی اداکاری دیکھ کر میرا غصہ کافور ہوا اور جوس کی بوتل کھولتے ہوئے کہہ اٹھا کہ یار تجھے وکالت کی تعلیم پڑھنے کے بجائے کوئی ایکٹنگ کمپنی جوائن کرنا چاہیے تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ فلم انڈسٹری کے مشہور کامیڈین بن جاتے۔ 'اور آپ اسکرپٹ رائٹر، اسکالر صاحب'۔ کہتے ہوئے سجاد بھی ہنس پڑا اور مجھے بھی ہنسنے کا ٹیبلٹ کھلا گیا۔ سجاد ہنسنے کے بعد یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا کہ مجھے ڈل کی سیر کے لیے جانا ہے، آج ایک خاص ساتھی کے لیے شکارا بک کرایا ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں اس کے شکارے اور شکار کے ساتھ ساتھ خود کو بھی کوسنے لگا کہ ہمیشہ موج مستی کرتا رہتا ہے اور آج زندگی میں پہلی بار میں کچھ خاص بتانے کی تاک میں بیٹھا تھا کہ جناب دوست کے ارمانوں کی چتا جلا کر جشنِ دوستی منانے چلے گئے۔ خیر اب میرے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی کیوں کہ پتہ نہیں وہ کب رات کو لوٹے گا۔ ویسے یہ بھی ریسرچ کرتا ہے لیکن کیا معلوم یہ پڑھنے میں سیریس کیوں نہیں ہے۔ رات کو میں میس میں کھانا کھانے کے بعد سیدھا بیڈ پر لیٹ گیا۔ آج تو نیند بھی پتہ نہیں سجاد کی طرح کس جشن پر چلی گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے صرف شائستہ کا سراپا رقص کرتا رہا اور دماغ میں اس کی باتیں گونجتی رہیں۔ خصوصاً 'کیا آپ ہی شوقین صاحب ہیں؟' ہائے۔۔۔ آج پہلی بار کسی حسینہ کی سریلی آواز میں شوقین کا لفظ اس ادا سے سنا کہ سنتے ہی کانوں میں رس گھول گیا اور دل کی سونی نگری گل و گلزار بن گئی۔ ان ہی خیالات میں کھو کر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح باتھ روم سے فریش ہو کر چائے ناشتہ ہوا اور پھر گائیڈ سے ملنے ڈپارٹمنٹ چلا گیا۔ ان کے

کمرے میں داخل ہوتے ہی شائستہ پر نظر پڑی۔آج وہ سبز ڈریس میں واقعی جل پری لگ رہی تھی۔پروفیسر صاحبہ مجھے دیکھتے ہی بولی کہ شوقین !کل میں نے شائستہ کو آپ کے بارے میں بتایا تھا۔خیر،آج انھوں نے آپ کی بہت تعریف کی پھر بھی چوں کہ ان کا پی ایچ ڈی میں ڈائرکٹ داخلہ ہوا ہے اس لیے وقتاً فوقتاً ان کی مدد کرتے رہنا'بہتر میڈم'بولتے ہوئے میں نے چند کتابوں کے بارے میں پوچھا اور کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد میں یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا کہ میڈم، مجھے اب لائبریری جانا ہے۔میڈم نے شائستہ سے کہا کہ آپ بھی شوقین کے ساتھ لائبریری چلی جاؤ اور ہاں شوقین !لائبریرین کو بتانا کہ یہ میڈم کی خاص اسکالر ہیں،اس لیے انھیں مواد کے لیے کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں ہونا چاہیے۔میں'اچھا'میڈم کہتے ہوئے وہاں سے نکل پڑا اور شائستہ بھی میرے ساتھ چلی آئی۔لائبریرین کو میڈم کی بات بتائی اور اس نے شائستہ کا فارم منگوا کر رجسٹر میں رکھنے کے ساتھ ساتھ بتا دیا کہ جس بھی کتاب یا میگزین ضرورت ہو تو بلا کسی جھجک کے نکال لینا اور ہاں اگر کوئی کتاب موجود نہ ہو تو بتا دینا،ہم منگوا لیں گے۔شائستہ نے شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں کتابوں کی تلاش میں جت گئے۔میں نے شائستہ کو بتایا کہ جو جو کتاب موضوع کے مطابق ہمیں نظر آئے گی تو اس کا نام نوٹ کرتی رہنا۔آدھے دن تک ہم لوگ اسی کام سے جڑے رہے۔جب کئی کتابوں کی ایک لسٹ تیار ہو گئی تو میں نے کہا فی الحال اتنا کافی ہے۔اب آپ حسب ضرورت یہ کتابیں لائبریری سے نکال سکتی ہیں۔اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم کیفے ٹیریا میں چلے گئے۔
وہاں پر کھانے پینے کے بعد دوبارہ لائبریری میں واپس لوٹے۔ریک سے چند کتابیں نکال کر ٹیبل پر رکھ دیں اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔شائستہ نے بیٹھتے ہی شکریہ ادا کیا۔میں نے کہا کہ شائستہ ایک بات بتاؤ،کیا میڈم آپ کو پہلے سے ہی جانتی ہیں۔شائستہ مسکرائی اور بولی کہ جی ہاں شوقین صاحب۔اصل میں ہم قریبی رشتہ دار ہیں اور ان کا بیٹا اور میں بارہویں تک ایک ساتھ پڑھتے تھے۔اس کے بعد وہ ایم بی بی ایس کے لیے سلیکٹ ہو گیا اور میں نے گریجویشن میں سبجیکٹ چینج کیے۔شائستہ کی بات سن کر میں تھوڑی دیر تک خاموش رہا اور پھر بے قراری میں پوچھ ہی بیٹھا کہ پھر تو آپ لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا رہتا ہی ہوگا۔شائستہ نے یہ سن کر کہا کہ ہاں آنا جانا تو رہتا ہے لیکن میں کم ہی جاتی ہوں۔باقی گھر کے دوسرے لوگوں کا اکثر آنا جانا رہتا ہے۔اس کے بعد میں نے موضوع بدلنا ہی مناسب سمجھا اور پھر کتاب کھول کر مطالعہ کرنے لگا۔شائستہ نے بھی ایک کتاب کھولی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔دوران مطالعہ میں نے کہا کہ جو جو باتیں یا مضامین موضوع سے متعلق ہوں ان کو ڈائری میں نوٹ کرتے رہنا اور پھر مضامین کی زیراکس بھی نکلوانا تا کہ بعد میں حسب ضرورت کام آسکیں۔لائبریری سے نکلتے وقت میں نے پوچھا کہ آپ کہاں پر ٹھہرتی ہیں،ہوسٹل یا کسی رشتہ دار کے ہاں۔ابھی ایک رشتہ دار کے گھر پر ہوں لیکن میڈم نے کہا ہے کہ چند دنوں میں ہوسٹل کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

میں شائستہ کے ساتھ مارکیٹ تک چلا گیا۔اس نے مجھے مارکیٹ میں ڈراپ کر دیا اور میں دودھ اور روٹی خرید کر ہوسٹل چلا گیا۔ہوسٹل کی طرف چلتے چلتے میں سوچتا رہا کہ آج سجاد کو اس بارے میں بتا ہی دوں گا تا کہ وہ بھی خوش ہو جائے اور اپنے ماہرانہ مشوروں سے نوازے۔کیوں کہ وہ اس میدان کا کھلاڑی ہے،ہمیشہ مجھے محبت کے قصے سنا سنا کر تنگ کرتا رہتا ہے۔میں جوں ہی کمرے میں داخل ہوا تو سجاد نے کہا کہ چلو اچھا کیا جو دودھ اور روٹی ساتھ لائے۔اب جلدی چائے بنائیں گے کیوں کہ مجھے کہیں جانا ہے۔واپس کب آو گے۔کیا بھروسہ اگر دوستوں نے جلدی چھوڑا تو نو بجے تک نہیں تو پھر گیارہ بارہ کے درمیان۔آج مجھے نہ جانے کیوں سجاد کی بات بری لگی۔بہرحال میں نے کہا کہ جلدی آنا' آج ایک اہم بات بتانی ہے۔بتانی کیا مشورہ کرنا ہے۔اس نے پانی میں پتی ڈال کر بتایا،تو پھر بولو نا،میں بات سن کر ہی جاؤں گا۔نہیں،آپ جلدی آنا پھر ٹھیک رہے گا۔چائے پینے کے بعد وہ چلا گیا اور میں بھی ہوسٹل میں ایک اور دوست کے کمرے میں چلا گیا۔رات کا کھانا کھانے کے بعد میں دیر تک سجاد کا انتظار کرتا رہا جب مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ شاید بارہ کے بعد ہی آئے گا تو میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ابھی لیٹا ہی تھا کہ سجاد آ گیا اور آتے ہی لحاف کے اندر دبک گیا۔میں نے کمبل سائڈ میں رکھا اور کہنے لگا کہ یار آج ایک اہم مسئلے پر بات کرنی ہے۔اس نے کروٹ بدل کر کہا کہ میں کل تمھارا نیا افسانہ سنوں گا۔ویسے ایک بات بتاؤں تم اپنی افسانوی کتاب چھاپ کر مجھے دے دینا،میں وعدہ کرتا ہوں کہ بڑھاپے میں ضرور پڑھوں گا۔مذاق چھوڑ یار،مجھے واقعی ایک اہم مشورہ کرنا ہے۔اس نے لحاف سر کے اوپر ڈالتے ہوئے کہا کہ پھر کبھی اس وقت نیند آ رہی ہے۔میں دل کے ارمان دل میں ہی چھپا کر رہ گیا اور دوبارہ کمبل اوڑھ کر سو گیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ان مہینوں میں نہ صرف ریسرچ کا کام ساتھ ساتھ چلتا رہا بلکہ دماغ کی ریسرچ کا کام بھی ہوتا رہا۔اب کسی قسم کا تکلف ہمارے خیالات کے سننے سنانے میں آڑے نہیں آتا تھا۔ڈپارٹمنٹ سے لائبریری،لائبریری سے مارکیٹ اور کبھی کبھی کشتی میں بیٹھ کر جھیل ڈل کی سیر۔اب سب کچھ دلچسپ انداز سے چل رہا تھا۔اتنے مہینے گزرنے کے بعد میری سوچ میں انوکھا بدلاؤ آتا رہا۔پہلے رات دن ذہن کے افق پر تحقیق کے خشک افکار کا غلبہ رہتا اور کبھی کبھی شاعری اور افسانے پڑھ لکھ کر دل کے گلشن کو نکھارنا پڑتا لیکن اب تو خود زندگی شاعری اور افسانے کا لطف دینے لگ گئی۔کشتی میں جھیل ڈل کی سیر کا اپنا ہی مزہ ہوتا۔خصوصاً چاندنی راتوں میں جھیل کا نظارہ اتنا مسحورکن ہوتا کہ انسان دنیا و فیہا کو بھول کر فطرت کی سحر انگیزی میں کھو کر رہ جاتا۔ان راتوں کی رومان پرور فضا کے درمیان خوبصورت کشتیوں میں سوار فطرت پرست جوڑے مست ماحول کے اسیر ہو جاتے۔ایک دفعہ چاندنی رات میں کشتی جھیل کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی اور سرد ہوا کے جھونکے

جب شائستہ کے ریشمی بالوں کو چھوتے تو ریشمی بال گلابی چہرے پر سنپولوں کی طرح رینگتے رہتے اور اس کی نرم ونازک انگلیاں چہرے پر آویزاں سنپولوں کے ساتھ بین کی طرح الجھتی رہتیں۔ یہ منظر میری آنکھوں کے لیے کسی شاہ کار پینٹنگ کے نظارے سے کم نہیں تھا۔ ایک بار سیر کے دوران شائستہ نے جھیل کے کنارے حضرت بل کی برف رنگ درگاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ کتنی حسین اور مقدس درگاہ ہیں، اس کے سفید گنبدوں کی چمک آنکھوں کو روشن کرتی ہے۔ میں نے گنبدوں کی طرف دیکھا اور بول پڑا کہ شائستہ ان گنبدوں کی خاموش فضا میں کبوتروں کی غٹرغوں فرحت آفریں سماباندھ رہی ہیں۔ جب میری نظروں کو آپ کا دل فریب جلوہ مسحور کرگیا تھا تو میرے دل کا خاموش کبوتر بھی بہت عرصے تک مست ہو کر پھڑ پھڑا اتار ہا۔ شائستہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد کہہ اٹھی اور پھر میرے دل کا شریر کبوتر بھی آپ کے جلوے سے پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ اب دونوں کبوتروں کی غٹرغوں میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ کشتی کنارے پر لگی اور ہم دونوں اتر کر یونیورسٹی کے احاطے میں پہنچ گئے۔

ایک دن ہم کشمیر یونیورسٹی کے باہر جھیل ڈل کے کنارے والی پارک میں گھوم رہے تھے۔ یہ پارک یونیورسٹی طلبہ میں تقدیر پارک کے نام سے مشہور ہے۔ پارک کے رنگا رنگ پھول بنتے بگڑتے رشتوں کی سینکڑوں کہانیوں کی گواہی ہمیشہ دیتے رہتے ہیں۔ گھومتے گھومتے شائستہ ایک گلاب سونگھتے ہوئے پوچھ بیٹھی کہ آپ کس قسم کی شاعری اور افسانے پسند کرتے ہیں تو میں بول پڑا کہ ہر قسم کی شاعری اور افسانے مجھے پسند ہیں۔ یہ سن کر پھر بولی کہ خود کس قسم کے افسانے لکھتے ہیں، ویسے چند میری نظروں سے گزرے بھی ہیں تو میں نے کہا کہ پھر بتانے کی ضرورت کیا ہے۔ اچھا آپ کو کس قسم کے موضوعات پسند ہیں؟ یہ سن کر وہ میرے چہرے کو تکنے لگی اور مسکراتے ہوئے بولی:

'محبت۔۔۔ محبت کے۔۔!'۔

'بس محبت کے'۔ میں جیب سے موبائل نکالتے ہوئے بولا۔

'ہاں۔۔ محبت کے' وہ دوبارہ پھول سونگھتے ہوئے بولی 'ابھی ہماری عمر محبت کے فسانے اور گیت سننے کی ہے۔ اس کے بعد دوسرے موضوعات بھی پسند آتے رہیں گے'۔

یہ کہہ کر وہ پوچھ بیٹھی کہ اچھا ایک بات بتاؤ۔ آپ نے ایک دن میڈم اور رہمارے تعلق سے متعلق پوچھا تھا تو میڈم کے بیٹے کے بارے میں سن کر کیوں دلچسپی سے سوال کیے تھے؟ یہ سن کر میں سمجھ گیا کہ دل کی چوری پکڑی گئی اور بات ٹالتے ہوئے کہہ دیا کہ بس یونہی۔ اچھا ٹھیک ہے لیکن ایک بات بتاتی چلوں کہ وہ میرا رشتہ دار ہے اور کلاس میٹ تھا، بس بات اتنی سی ہے۔ میں یہ سن کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا اور دل میں

خوش ہوا کہ اب راستہ صاف ہوگیا۔آج تک ہم لوگوں نے اس طرح سے کبھی بھی اس موضوع پر بات نہیں کی تھی جب کہ میں سمجھتا تھا کہ محبت کی کہانی ایک ہی کردار کے ارد گرد گھوم رہی ہے لیکن اس دن کے بعد کہانی میں دو کردار آگئے۔ پھر یہ کہانی رفتہ رفتہ آگے بڑھتی گئی اور ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات و جذبات کے امانت دار بن گئے۔اب میرا دل شائستہ کے نام پر دھڑکتا تھا اور اس کا دل میرے نام پر۔اب زندگی گلستان بننے لگی اور یہاں محبتوں کا سمندر تھا۔اب ڈل کے کنارے مغل باغات کی سیر کا کچھ اور ہی مزہ آتا تھا اور چشمۂ شاہی کا نظارہ فردوسِ نگاہ لگتا تھا۔ ہم دونوں اکثر چشمۂ شاہی کے فردوسِ نگاہ سبزہ زار گنگناتے آبشار اور رنگ برنگے گلزاروں کے دل آویز نظاروں میں پہروں کھو جاتے اور بے کنار آسمان کے نیلے عالم کو تکتے رہتے۔خاموش فضا میں کبھی کبھی ملائم ہوائیں پیڑوں کی شاخوں سے ٹکراتیں اور ان پر بیٹھے پرندوں کی سریلی آوازیں ہماری سماعتوں کو قیدی بنا کر بانسری کی میٹھی آواز کی حریف بن جاتیں۔ایک روز پتہ نہیں شائستہ پر کونسا سحر چھا گیا۔اس نے ایک لان میں آویزاں کشمیر کے روایتی لباسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ باہر کے سیاح ان لباسوں کو پہن کر تصویریں کھینچواتے رہتے ہیں اور اپنی محبتوں کو یادگار بناتے ہیں، کیوں نہ ہم بھی انھیں پہن کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے کلچر سے محظوظ ہو جائیں اور تصویر کھینچوا کر اپنی محبت کو یادگار بنائیں۔اس کے ساتھ ہی وہ مقامی باشندے سے ایک لباس لے کر ٹینٹ میں چلی گئی اور کشمیری پوشاک میں جنت کی حور بن کر میرے سامنے آئی۔ پھر مجھے بھی اپنے روایتی لباس میں دیکھنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔ یہاں پر کچھ لوگ لباس بدلنے کے لیے ٹینٹ بھی ساتھ استادہ کرتے ہیں۔ یہ تجارت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔میں بھی ٹینٹ میں جا کر لباس پہن کر آگیا اور وہ مجھے دیکھ کر کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔تصویریں کھینچوا کر ہم اب تھوڑا دور جا کر چنار کے سائے میں بیٹھ گئے۔ چشمۂ شاہی کے دل کش نظاروں اور سریلی آوازوں کے سحر انگیز ماحول سے شائستہ جھوم اٹھی۔وہ بار بار میرے سراپے کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔میں نے اس کا یہ رومان پرور حال دیکھ کر کہا کہ آپ تو کشمیری پوشاک میں 'زون' لگ رہی ہو۔وہ بھی بے ساختہ بولی کہ آپ بھی تو 'یوسف بادشاہ' لگ رہے ہو۔ہم دونوں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔اسی دوران پتہ نہیں اس کے من میں کیا سوجھی کہ سنجیدہ ہو کر بولی کہ شوقین اگر ہماری زندگی میں بھی کوئی اکبر بادشاہ آیا اور یوسف شاہ کو قید کروا کر زون کو ہجر کے کرب میں مبتلا کر گیا تو پھر کیا ہوگا۔میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ کیوں ایسی منحوس باتیں بولتی ہو۔ یوسف اور زون کی جدائی کے باوجود ان کی محبت کی کہانی ہر کشمیری کے دل میں زندہ ہے۔اسی دوران میری نظر سجاد پر پڑی۔وہ کسی اور حور کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کر ہماری طرف ہی بڑھ رہا تھا۔میں اسے دیکھ کر اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے سوچنے لگا کہ پتہ نہیں انگور کا لطف اٹھانے کے دوران یہ لنگور کہاں سے آن ٹپکا۔اگر اس نے مجھے یہاں پر دیکھا اور کچھ

پوچھ لیا تو ۔۔۔؟ تھوڑا قریب آ کر اس کی نظروں میں جب میرا حلیہ آ گیا تو چند لمحات تک وہ مجھے گھورنے لگا۔ شاید سوچنے لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے تو وہ اپنے ساتھی کا ہاتھ چھوڑ کر میری طرف بڑھنے لگا لیکن اس کی ساتھی نے اس کا ہاتھ دوبارہ تھاما اور دونوں آپس میں کچھ کھسر پسر کرنے لگے۔ اسی دوران دونوں ہمیں نظر انداز کر کے دوسری جانب چلے گئے۔ میں نے راحت کی سانس لی۔ میرا تذبذب دیکھ کر شائستہ پوچھ بیٹھی کہ کیا ہوا۔ میں خود پر قابو پاتے ہوئے بولا کہ کچھ خاص نہیں، بس ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ پورا دن چشمۂ شاہی کے رومان انگیز ماحول میں گزارنے کے بعد جب ہم واپس یونیورسٹی آئے تو دن بھر کے رومانی ماحول کا سحر ابھی بھی ذہن پر چھایا ہوا تھا لیکن جوں جوں میں ہوسٹل کی جانب بڑھنے لگا، توں توں میں سوچنے لگا کہ اگر سجاد روم میں ہوگا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور پوچھے گا اور میں کسی بہانے سے اسے مطمئن کر دوں گا۔

میں جب ہوسٹل کے روم میں پہنچا تو شومئی قسمت سجاد وہاں پر جیسے میرا ہی منتظر تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بول پڑا کہ بھئی تم چشمۂ شاہی میں اتوار کے روز اور وہ بھی لڑکی کے ساتھ کشمیری ڈریس میں، کیا ماجرا ہے جناب۔ پہلے میں نے آنا کانی کرنا چاہی اور یہ کہہ دیا کہ کچھ نہیں بس آج چشمۂ شاہی گھومنے کا موڈ بن گیا تھا۔ وہ زور زور سے ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ بچو میں تو اس کھیل کا کھلاڑی ہوں۔ آپ کو وہاں دیکھنے کے بعد میں نے فوٹو گرافر سے تمام داستان سن لی۔ آپ تو اس لڑکی کے ساتھ اکثر وہاں دیکھے گئے ہیں۔ بھئی، آپ تو خاموش عاشق نکلے اور مجھے بتایا تک نہیں، شاید میں بھی کچھ مدد کرتا۔ اب بات صرف سیر سپاٹے تک ہی محدود ہے کہ داستانِ عشق شروع بھی ہو گئی ہے۔ چھوڑ یار، اب تجھے بتانے کا کیا فائدہ، جب بھی تجھے بتانا چاہا تو تو ہنسی مذاق سمجھ کر کبھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ ہائے میرے شریف مجنون، چلو کوئی بات نہیں، میں خوش ہوا کہ میرا سنیاسی دوست دنیا کے رنگ میں رنگ گیا۔ اس کے بعد جب بھی میں بات کرتا تو سجاد داستانِ عشق کے واقعات کو ہی سننا پسند کرتا۔ ایک دن میڈم نے دورانِ گفتگو بتایا کہ اگر آپ دونوں چاہیں گے تو ملک کی دو تین یونیورسٹیوں میں سیمینارز میں شرکت کے لیے جا سکتے ہیں، کیوں کہ اب آپ تحقیق کے آخری مراحل سے گزر رہے ہیں۔ قریباً ایک ہی سال بچا ہے اور اب تو مقالے کے ساتھ رسائل میں شائع شدہ مضامین اور قومی سطح کے سیمینارز میں پریزنٹیشن کی ایک دو اسناد بھی ساتھ رکھنا پڑتی ہیں۔ میں وہاں کے پروفیسرز سے فون پر بات کروں گی، اس طرح آپ لوگوں کو باہر کی یونیورسٹیوں کو دیکھنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ میں نے وہیں پر جانے کا کہہ دیا لیکن شائستہ نے کہا کہ وہ گھر والوں سے پوچھ کر بتائے گی۔ یہ سن کر میڈم نے کہا کہ وہ آپ مجھ پر چھوڑ دو۔ ایک مہینے کے بعد ہم دونوں پندرہ دنوں کے لیے وادی سے باہر چلے گئے اور وہاں پر کئی سیمینارز میں شرکت کرنے کے علاوہ مختلف کتب خانوں سے مواد

بھی حاصل کرتے رہے۔کئی نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور نئے نئے تجربات سے بھی گزرتے رہے۔واپسی پر جب میڈم کو اپنے تجربات اور مشاہدات بتائے تو وہ بھی خوش ہوئیں۔ریسرچ کا کام اب آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔ہم لوگ بھی اب زیادہ دھیان کام کی طرف دیتے رہتے۔اب کبھی کبھار ہی گھومنے پھرنے کا موقع ملتا تھا۔ایک دن شائستہ نے فون کیا کہ آج کسی بھی وقت کسی جگہ ضروری ملنا ہے۔میں نے ٹائم بتا دیا اور طے شدہ وقت پر یونیورسٹی سے باہر والے تقدیر پارک میں بیٹھ گئے۔مجھے شائستہ کچھ پریشان سی نظر آئی۔میں نے جب وجہ پوچھی تو وہ بول پڑی کہ صبح گھر سے فون آیا تھا کہ کل میڈم اپنے شوہر کے ساتھ ہمارے گھر گئی تھیں اور اباجان سے میرے بارے میں پوچھ رہی تھی۔میں اسی لیے تھوڑی پریشان ہوں۔خیر،میں کل امی سے بات کروں گی کیوں کہ یہ مجھے چھوٹی بہن نے فون پر بتادیا،اسے پورا پتہ نہیں تھا۔یہ سن کر میں نے کہا کہ کوئی پرابلم نہیں،اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔تھوڑی دیر تک پارک میں بیٹھ کر مقالوں کے بارے میں باتیں ہوئیں اور پھر ہم دونوں ہوسٹل کی طرف چلے گئے۔اصل میں شائستہ کی مبہم باتوں سے میری بھی پریشانی بڑھ گئی اور میڈم کے بیٹے اور شائستہ کے ہم عمر ہونے کا خدشہ ذہن پر چھا گیا۔سجاد کے آتے ہی اسے شائستہ کی بات اور اپنے خدشات کا بتاتے ہوئے کہا کہ شاید رشتہ جوڑنے کی بات چھڑی ہو۔وہ سنتے ہی کرسی پر ڈھے گیا اور بتانے لگا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ دونوں کے لیے دوہری مشکل کھڑی ہوگئی۔ایک طرف سے گائیڈ کے عزت و احترام کی تلوار اور دوسری جانب اپنی محبت اور سماجی بندھن کی زنجیر۔آدھی رات تک میں پریشانی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔اگلے دن جب پھر شائستہ کا فون آگیا تو میں کل والی جگہ پر پہنچ گیا۔تھوڑی دیر کے بعد شائستہ بھی آگئی۔اس کے چہرے کا رنگ فق تھا۔میں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔وہ آتے ہی رونے لگی اور روتے روتے بول پڑی کہ شوقین،زون کا یوسف سے جدا ہونے کا وقت آگیا ہے۔میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جھیل ڈل کے خاموش پانی کا سینہ چیرتے چیرتے اچانک محبت کا ایک شکارہ ڈوب گیا اور اس میں سوار دو دیوانے پانی کے اندھیرے میں کھو گئے۔اب میری آنکھوں سے بھی جدائی کا آبشار گرنے لگا اور غروبِ آفتاب کے ساتھ ساتھ ہم دونوں فاتح ہونے کے باوجود الگ الگ راستوں پر شکست خوردہ سپاہیوں کی طرح چل پڑے۔ہوسٹل میں پہنچتے ہی سجاد نے بے چینی سے پوچھا کہ کیا ہوا تو میرے آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھیں بھی آب دیدہ کر گیا۔چند دنوں کے بعد جب ہم مقالہ جمع کرانے کے لیے ڈپارٹمنٹ پہنچے اور میڈم کے ٹیبل پر مقالے کی بائینڈ کاپیاں رکھیں تو انھوں نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ شوقین اب شائستہ میری اسکالر ہی نہیں بلکہ بہو بھی بننے والی ہیں۔یہ سنتے ہی مجھے پہلی بار میڈم کے الفاظ ایسے زہریلے تیر محسوس ہوئے کہ جنھوں نے معصوم کبوتروں کو نیم بسمل کر کے رکھ دیا ہو۔

اور آج اکبر بادشاہ نے نفرت کی بجائے محبت سے زون اور یوسف کو جدا کر دیا ہو لیکن مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ میں نے میڈم اور شائستہ کو مبارک باد دے دی۔ وہاں سے جلدی نکل کر ہم دونوں بہار میں بھی خزاں کا ماتم مناتے ہوئے ڈل کے کنارے پر پہنچ گئے اور میں نے کشتی والے کو اشارہ کیا لیکن شائستہ نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ آج کشتی میں ڈل کی سیر نہیں کریں گے بلکہ یہاں پر ہی جھیل کی گہرائی کا ماتم منائیں گے۔ شام کے دھندلے سایوں کے ساتھ ہی ہم تقدیر پارک میں چلے گئے۔ شائستہ کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا اور وہ میرے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور روتے بلکتے کہنے لگی:

'شوقین۔۔۔کیا ہماری داستان وقت کے دریا کا حصہ بنے گی؟'۔

''مجھے۔۔۔جھیل سی آنکھوں کے کملاتے کنول' آنسوؤں کے دریا میں ڈوب کر لے گئے۔ دل کی سسکیاں زبان سے صدا دینے لگیں:

'آج تک میں دوسروں کے افسانے لکھتا تھا لیکن اب شوقین اور شائستہ کا افسانہ دنیا کے سامنے آئے گا'۔

'آہ۔۔!'۔

کرب ناک کسک دلوں کو چھلنی کر گئی' اور دو آزاد کبوتروں کی پرواز وقت کے دریا میں مقید ہو گئی۔

آج میرے ہاتھ میں اسپنسر کی کتاب 'فیری کوئین' نہیں' بلکہ ایک اور ناول 'قیامت سے قیامت تک' ہے۔ یہ ناول رزم گاہِ عشق کی داستان الم سناتا ہے۔ ناول پڑھنے کے دوران' وقفے وقفے سے میں دریا کی ابھرتی ڈوبتی لہروں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ لہریں زندگی کی لہروں کی مانند لگتی ہیں' کبھی ابھری اور کبھی ڈوبی۔ زندگی کا کاروان چلتا رہتا ہے ایک سبک رفتار دریا کی طرح چلتے چلتے سمندر کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے۔ آج سمندر کی لہروں سے کوئی جل پری نکلتی نظر نہیں آتی ہے۔ میری نظریں ساحل کا نظارہ کرتی ہیں۔ دور سے آتے ہوئے ایک جوڑا اور دو بچے دکھائی دیتے ہیں۔ میں کتاب میں دوبارہ کھو جاتا ہوں۔ بچوں کی آواز اب کانوں تک آنے لگتی ہے۔ میں دوبارہ نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ اب بچے اور مرد شاید ان کا باپ ہو' کے چہرے صاف دکھائی دیتے ہیں' بچوں کی عمر قریباً تیرہ سے پندرہ سال کی لگ رہی ہے۔ بچے دریا میں نہانے کی ضد کر رہے ہیں۔ بچوں کے ساتھ باپ بھی دریا میں اتر رہا ہے۔ میں مسکرا کر پھر کتاب پر توجہ دیتا ہوں۔ اچانک ایک آواز کانوں سے ٹکراتی ہے۔ میں کتاب سے نظریں ہٹا کر دیکھتا ہوں۔ ایک نسوانی وجود ڈھلتی عمر کے ساتھ ساتھ ڈھلتی جوانی کی عکاسی بھی کر رہا ہے۔ سلام کی آواز میرے احساس کو تھوڑا بہت متاثر کرتی ہے میں سوچتا ہوں کہ شاید یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ میں ناول بند کر دیتا ہوں۔ ناول بند کرتے ہی وہ نیچے بیٹھ جاتی ہے اور پوچھتی ہے کہ 'فیری کوئین' کے

بجائے 'قیامت سے قیامت تک'۔ یہ سن کر مجھ پر سکتا ساطاری ہوجاتا ہے۔میں سامنے والے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں۔جھیل سی آنکھیں اب درد کے کنویں بن گئی ہیں۔گلابی ہونٹوں پر کانٹوں کی چبھن نظر آتی ہے۔میرے منہ سے لرزتی آواز نکلتی ہے۔۔۔شائستہ۔ہہ۔۔ہہ۔۔۔۔۔!

'ہاں شائستہ۔۔۔'اب شائستہ لہجے کے بجائے دردبھری آواز آتی ہے۔'کیا ہمارا افسانہ بن گیا تھا یا وہ بھی وقت کے دریا کے ساتھ بہہ گیا'۔

'نہیں'،میں ناول 'قیامت سے قیامت'کی طرف دیکھ کر کہتا ہوں'وقت کا دریا تخلیق کو نہیں مٹاسکتا۔اچھی تخلیق اپنے تخلیق کار کی کہانی کو ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔اگلی اتوار کو اسی ساحل پر وہ زندہ ملے گی۔یوسف اور زون کی کہانی آج بھی زندہ ہے'۔

بچے نہا کر ریت پر دوڑنے لگتے ہیں۔ان کی ماں کے پیر بھی اب ریت پر چلنے لگتے ہیں لیکن اب خرگوش کے نازک پیروں کی نزاکت ختم ہوگئی ہے۔اگلی اتوار دوبارہ میرے کانوں کے ساتھ بچوں کی آواز ٹکراتی ہے۔بچے پھر دریا میں اتر رہے ہیں۔نسوانی آواز میں آج مٹھاس ہوتی ہے۔کبوتروں کی غٹرغوں فضا کو خوش گوار بناتی ہے۔میں بیگ سے کتاب نکالتا ہوں۔وہ کتاب ہاتھ میں لے کر فہرست دیکھتی ہیں۔'میری زبان سے'داستانِ شوقی'' نکلتا ہے۔افسانہ ایک کردار کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کردار کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے۔کہانی شروع ہوجاتی ہے۔میری نظریں کہانی کے کردار کے چہرے کا ماتم منارہی ہیں اور دماغ کے اندر افسوس کا نقارہ بج اٹھتا ہے کہ وقت کتنا بے رحم ہے کہ گلابی چہروں کے حسن کو جھریوں کے زہریلے کانٹوں سے ریزہ ریزہ کرتا رہتا ہے۔وہ اگر حسن پرست ہوتا تو حسین شے کو ہمیشہ حسین ہی رکھتا۔اب فیری کوئین'قیامت سے قیامت'بن گئی ہے۔کہانی ختم ہوجاتی ہے اور کردار کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک کر کہانی کے اندر جذب ہوجاتے ہیں۔جل پری کے قدم دریا کی جانب بڑھتے ہیں۔پانی کی سطح پر پھولوں کے ساتھ ساتھ داستان شوقین بھی تیر رہی ہے۔میں دریا کی ابھرتی ڈوبتی لہروں کو دیکھتا ہوں۔سریلی لہروں کے بہاؤ میں داستانِ شوقین و شائستہ کی گونج کانوں کو سنائی دیتی ہے۔دل و دماغ کے عالم میں شاد عظیم آبادی کا شعر محشر برپا کردیتا ہے۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

☆☆☆

عشرت معین سیما
برلن، جرمنی

مانوس خوشبو

میں آج صبح سو کر اٹھا تو مجھے اپنا سر بہت بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی بھاری بوجھ نے سر پر زبردستی خود کو سوار کروالیا ہو۔ میں جس کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا وہ اپنے طول وعرض میں بہت بڑا تھا۔ بے شمار سامان سے بھرا ہوا یہ کمرہ جس کے ایک چوڑے بستر پر ملائم کمبل اور کئی تکیوں کے درمیان، میں ایک نرم گدے میں تقریباً دھنسا ہوا تھا۔ بستر کے دائیں جانب شاید ایک وسیع کھڑکی تھی جو گہرے نیلے رنگ کے پردوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

'میں کہاں ہوں؟' میں نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

' آپ اپنے کمرے میں ہیں۔۔۔ اپنے بستر پر۔۔'

میرے پہلو سے کھنکھناتی ہوئی ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اپنے دائیں جانب پہلو سے ملائم سرخ شب خوابی کے لباس میں ایک حسینہ کو کروٹ بدل کر کمبل سے نکلتے ہوئے دیکھا۔

'تم کون ہو؟'۔ اب کی بار میں نے زور سے آواز لگاتے ہوئے اس عورت سے پوچھا۔

'میں کہاں ہوں، تم کون ہو؟ یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟ ارے! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ نیند میں ہیں کیا اب تک؟'

وہ عورت اپنے کھلے ہوئے لمبے سیاہ بالوں کو جوڑے کی صورت میں باندھتی ہوئی بستر پر اٹھ بیٹھی، اس کے جسم کی خوشبو کچھ مانوس تھی لیکن اس کی شکل اور وجود کی انسیت مجھے اپنے ذہن پہ زور ڈالنے کے باوجود یاد نہ آئی البتہ سر میں درد اور بھاری پن بڑھنے لگا۔ میں نے فوری طور پر بستر سے نکل کر کھڑے ہونا چاہا لیکن کمبل ہٹاتے ہی اپنا ادھ ننگا جسم دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

'یہ۔۔۔ میں۔۔۔؟' میں نے بستر کا کمبل کھینچ کر اپنے جسم کے گرد لپیٹنا چاہا لیکن دوسری جانب اس عورت نے کمبل اپنی جانب زور سے گھسیٹتے ہوئے کہا کہ کیا کر رہے ہو عظیم۔ طبیعت ٹھیک ہے تمھاری؟۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے پیروں میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہے۔ میں لڑکھڑایا اور دوبارہ بستر پہ گر گیا۔ اس سرخ شب خوابی کے لباس والی عورت نے بڑھ کر مجھے اپنی باھوں میں لینے کی کوشش

کرتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا 'عظیم! میں تمھیں رات کہہ رہی تھی کہ زیادہ ڈرنک نہ کرو۔۔۔لیکن تم سنتے کب ہو میری۔۔۔تمھیں پتہ ہے کہ میں نے کس مشکل سے رات ڈرائیو کر کے تمھیں گھر تک پہنچایا ہے؟۔۔۔اگر شیر خان نہ ہوتا تو تمھیں بیڈ روم تک لانا میرے لیے کتنا مشکل ہوتا؟'۔

وہ عورت اپنی کھنکتی آواز میں بول رہی تھی مگر مجھے کچھ یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کون ہے اور کس رات اور کس ڈرنک کا ذکر کر رہی ہے۔ یاد تو مجھے یہ بھی نہیں آرہا تھا کہ یہ جگہ کون سی ہے جہاں میں موجود ہوں۔شاید میرے سر میں درد اور بھاری پن کا احساس مجھے زیادہ سوچنے بھی نہیں دے رہا تھا۔میں خود کو اپنے بھاری سر کے سامنے مجبور و بے بس محسوس کر رہا تھا۔لیکن ساتھ ہی میں اس عورت کے ساتھ بستر میں بیٹھنا یا لیٹنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔۔۔وہ بھی اپنی اس بے لباسی کی صورت میں۔۔۔میں نے اس کے بازوؤں کے حصار سے خود کو ایک قوت سے جھٹکا دے کر نکالا اور دوبارہ بستر سے نکلنے کی کوشش کی لیکن دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

'اوہ مائی گاڈ!' وہ عورت چلاتی ہوئی بستر سے نکلی اور مجھے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔اس کی مانوس سی خوشبو میرے نتھنوں میں گھس کر سیدھے دماغ کی کسی رگ کو جھنجھوڑنے لگی، کچھ یاد دلانے کے لیے ذہن پر زور زور سے دستک دینے لگی لیکن ذہن و دل کے دروازے اتنی طاقت سے مقفل تھے کہ مجھے ایسا لگنے لگا کہ اگر میں نے مزید اپنے ذہن پر زور ڈالا تو دماغ کی ساری رگیں پھٹ جائیں گی اور وہ خوشبو خون کی مہک بن کر میرے کانوں، ناک اور آنکھوں سے بہنے لگے گی۔خون کا تصور آتے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔پھر مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ دوسری بار جب میری آنکھ کھلی تو میں دوبارہ ایک نرم گداز بستر پر تھا۔لیکن یہ پہلے والا کمرہ نہیں تھا۔اس کمرے میں ایک عورت اب شب خوابی کے لباس کے بجائے سرمئی رنگ کے سوتی لباس میں سر ڈھانپے ہوئے کونے میں رکھے ایک صوفے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔کمرے میں اس کے اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔میرے حرکت کرتے ہی وہ تیزی سے اٹھی اور تقریباً دوڑ کر میرے قریب آ کر بستر کے کنارے مجھ پر جھک کر کھڑی ہوگئی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی:

'کیسی طبیعت ہے عظم بیٹے؟۔۔۔شکر ہے تم کو ہوش آیا'۔

اس عورت کے چہرے پر نور تھا اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھی تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میرے لیے بہت فکر مند رہی ہے۔میں نے اس کے جھریوں سے بھرے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا:

'مجھے کچھ یاد نہیں آرہا کہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ۔۔۔آپ کون ہیں؟ میں کہاں ہوں؟'۔

'عظیم بیٹے! تم اپنے گھر میں ہو۔۔۔تم نے مجھے نہیں پہچانا؟'۔

اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب کے ساتھ ساتھ ایک سوال بھی داغ دیا۔ میں نے آنسو اس کے گالوں پر بہتے دیکھے اور اس کی قربت سے پھوٹنے والی اس دوسری مانوس خوشبو کو محسوس کیا۔ یہ خوشبو کسی پھول کی خوشبو سے زیادہ بھینی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر دوبارہ زور ڈالا لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آیا، کہ وہ عورت کون ہے اور جو پچھلی بار مجھے دکھائی دی تھی وہ کون تھی۔ ان دونوں عورتوں کے وجود سے الگ الگ مانوس خوشبوؤں نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ اگرچہ اس وقت مجھے اپنا سر بھاری نہیں محسوس ہو رہا تھا اور نہ ہی کوئی درد تھا۔ لیکن ایک احساس تھا کہ شاید میں ضرورت سے زیادہ نیند لے چکا ہوں۔ مجھے بھوک اور پیاس کے شدید احساس نے اب اس عورت کے ساتھ کوئی تکرار یا پوچھ گچھ کرنے نہیں دی۔ میں نے اس عمر رسیدہ عورت سے کہا کہ مجھے بھوک لگی ہے کیا کچھ کھانے کو مل جائے گا؟

اس عورت نے مجھے غور سے دیکھا اور کچھ کہے بغیر پلٹ کر صوفے کے پاس رکھے انٹرکام سے کسی کو فون کر کے کھانا لانے کا کہا۔ میں بستر پہ لیٹے لیٹے ہی چاروں طرف جائزہ لے رہا تھا۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں میں نے پہلی بار ایک عورت کو شب خوابی کے لباس میں اور خود کو بے لباس دیکھا تھا۔ اپنی بے لباسی کا خیال آتے ہی میں نے اپنے جسم کی طرف نگاہ ڈالی۔ میں ہلکے آسمانی رنگ کے دھاری دار پاجامے اور سفید ٹی شرٹ میں تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بہت زیادہ دیر لیٹے رہنے سے میرے جسم کی ہڈیاں چر چرا رہی ہیں اور جسم کی رگیں اکڑ سی گئی ہیں۔ میں نے اپنے سر پہ ہاتھ پھرا اور لمبی سانس لے کر اٹھتے ہوئے بستر کے سرہانے کھسک کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت قریب میز پر سے پانی کا گلاس اٹھا کر میرے قریب لیے آئی اور میرے ہونٹوں سے لگانے لگی۔ اس کی مانوس خوشبو میرے نتھنوں سے پھر ٹکرائی اور مجھے اپنے ذہن میں پھر ارتعاش سا محسوس ہونے لگا۔ میں نے اپنی سانس روکتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی، میں نے خالی گلاس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے آہستہ سے شکریہ کہا اور آنکھیں موند لیں۔

پانی پینے کے بعد میں خود کو ذرا بہتر محسوس کر رہا تھا۔ آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی مجھے اس کمرے میں اس عورت کی موجودگی کا احساس اس کی خوشبو کی بدولت ہو رہا تھا۔ چند منٹ یونہی گزر گئے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ عورت اس کمرے میں میرے لیے فکرمند ہو کر صوفے پر بیٹھی ہوئی دوبارہ تسبیح پڑھنے میں مصروف ہو گئی ہے۔ مجھے اب اس کمرے میں اس کے وجود سے کوئی فکر نہیں ستا رہی تھی۔ میں ذہن پہ زور دے کر سوچ رہا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور میں اس کے پاس کیسے پہنچا؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ذہن کسی گاڑی کے تیز رفتار پہیے کی طرح گھوم گھوم کر واپس اس کی مانوس خوشبو میں الجھ رہا تھا لیکن اس کی شکل اور وجود مجھے ذہن و دل

کے کسی گوشے میں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنی یاد داشت کھو بیٹھا ہوں۔

اچانک مجھے تازہ روٹی کی خوشبو نے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ ایک مانوس چہرے والا درمیانے قد کا ادھیڑ عمر مرد دونوں ہاتھوں میں ٹرے سنبھالے صوفے کے قریب رکھی میز کے سامنے کھڑا تھا۔میں اس آدمی کے حلیے پر زیادہ زور نہیں دے سکا کیوں کہ کھانے کی خوشبو نے میرا دھیان اس پر سے ہٹا دیا تھا۔میں پوری قوت سے بستر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میرے قدم زمین پر جم ہی نہ سکے اور میں لڑکھڑاتا ہوا یک دم فرش پر آرہا۔میرا سر کسی چیز سے ٹکرا گیا تھا اور میرے سر سے خون ابل ابل کر کمرے کا سفید چکنا فرش سرخ کر رہا تھا۔وہ عورت زور سے چلائی۔عظیم!!! عظیم بیٹے۔۔۔خون کی بو کمرے میں پھیل رہی تھی میں اس بو کو برداشت نہیں کر پایا اور زمین پر بے سدھ پڑا رہا۔

جب تیسری بار میری آنکھ کھلی تو کمرے کی دیوار پر داہنی جانب گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کر کے شور مچا رہی تھیں ایسا لگ رہا تھا کہ یہ شور میرے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ مل کر مجھے کوس رہا ہے اور ماتمی انداز میں نوحہ کناں ہے۔کمرے میں شاید کئی لوگ اور بھی تھے جو مجھے دکھائی تو نہیں دے رہے تھے لیکن ان کی موجودگی میں محسوس کر رہا تھا۔عجیب بات یہ تھی وہ لوگ یہ شور محسوس نہیں کر رہے تھے۔میرا سر ایک درد سے پہلے ہی بہت بوجھل تھا پھر یہ گھڑی کی ٹک ٹک، جب میں نے گھڑی پر سے نظریں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لینا چاہا تو ایسا لگا کہ کئی آوازیں میرے قریب اور کچھ آوازیں مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ہلکے گلابی رنگ کی دیوار پر لٹکی اس گھڑی کے ارد گرد کئی اور تصاویر بھی ٹنگی ہوئی مجھ پر نگاہیں گاڑے ہوئی تھیں۔کبھی کبھی ایسا بھی لگ رہا تھا کہ یہ تصویریں مجھ سے بے نیاز آپس میں محوِ گفتگو ہیں اور گھڑی کے شور میں اپنی آوازوں کو بھی چپکے چپکے بلند کر رہی ہیں۔شاید مجھے یہ آوازیں ناگوار لگ رہی تھیں۔میرا سر درد سے بوجھل تھا اور بھوک نے جسم کو ناتواں کر ڈالا تھا لیکن اب مجھے خوف تھا کہ اگر میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو دوبارہ زمین بوس ہو کر بے ہوش ہو جاؤں گا اور پھر نہ جانے کتنے دنوں تک ہوش میں نہ آؤں۔دیوار پہ لگی گھڑی چھ بجا رہی تھی۔کمرے میں صبح کا اجالا پھیل رہا تھا یا شام رخصت ہو رہی تھی میں اندازہ نہیں کر پایا۔میں چند لمحے گھڑی اور دیوار پہ لگی تصویروں کو دیکھتا رہا۔۔۔دماغ بوجھل تھا، آنکھوں میں بھی کمرے کا اندھیرا اتر کر ہر چیز دھندلا رہا تھا اور جسم کمزوری سے ہلنے جلنے کے قابل نہیں لگ رہا تھا۔اچانک کمرے میں کسی نے بلب جلا دیا، مجھے کسی کی دبے قدموں کی چاپ اپنے قریب آتے سنائی دی۔۔۔اچانک کمرے میں گلاب اور موتیا کے پھولوں کی خوشبو پھیل گئی۔۔۔بہت مانوس خوشبو۔۔۔

'پاپا! آپ جاگ گئے؟ دیکھیے میں آپ کے لیے کتنے پیارے پھول باغ سے چن کر لائی ہوں، آنکھیں کھولیں پاپا! ذرا سی ہمت کریں میں آپ کے پاس ہوں'۔

ایک مانوس آواز اور خوشبو نے رفتہ رفتہ میرے ذہن کے پردے ہٹانا شروع کر دیے۔لیکن میرا فالج زدہ جسم میری کوشش کے باوجود ہل جل نہیں سکا۔میں اپنی ادھ کھلی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے بھی اپنے زندہ ہونے کا کوئی ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہا۔مجھے رفتہ رفتہ یاد آنے لگا کہ کئی ماہ قبل ہونے والے میری کار کے ایکسیڈنٹ میں میری ماں، بیوی اور میری بیٹی بھی میرے ساتھ تھیں۔ہم ایک قریبی عزیز کی شادی سے واپس گھر کی طرف آرہے تھے۔میری بیوی سرخ گلاب اپنے جوڑے میں لگائے ہوئی تھی اور میری ماں کی کلائی میں سفید موتیا کے گجرے اپنی خوشبو بکھیر رہے تھے۔شادی کی تقریب میں کچھ من چلے دوستوں کے ساتھ اس روز میں نے تھوڑی شراب بھی پی لی تھی۔تقریب کے بعد گھر واپسی پر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھے ہلکا سا نشہ محسوس بھی ہو رہا تھا۔میری بیوی نے میری اس کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔تب ہی اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ گاڑی چلانا چاہتی ہے لیکن ماں اور بیٹی کو میری شراب نوشی کی حرکت کی بھنک نہ پڑے اسی زعم میں، میں نے بیوی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ خود ہی سنبھال لی تھی۔میری بیوی اپنا سر جھٹکتی ہوئی میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔حادثے سے قبل میری پندرہ سالہ بیٹی اور میری ماں پچھلی سیٹوں پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔میں نے بے دھیانی میں گاڑی غلط سمت ڈال دی تھی یا اس کی رفتار بڑھا دی تھی مجھے یاد نہیں۔یاد ہے تو بس اتنا کہ ایک خوفناک دھماکے کے بعد چاروں طرف خون ہی خون بکھر گیا تھا اور اس خون کی مہک میں شراب کی بو اور موتیا کے پھولوں کے گجرے اور گلاب کی خوشبو گھل کر میرے دماغ میں گھسی جارہی تھی۔اس اچانک ہونے والے حادثے نے زندگی کا پہیہ یک دم جام کر دیا تھا۔یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے میں بے بسی سے اپنی بیٹی کی جانب دیکھ رہا تھا اور وہ شاید میری جانب سے کوئی ردعمل نہ پا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دیوار پہ لگی میری بیوی اور ماں کی تصویر پر موتیے اور گلاب کے پھولوں کی مالا چڑھانے لگی۔

☆☆☆☆

راجہ یوسف
سری نگر

زندہ ون کا گورکن

زندہ ون گاؤں کے بیچوں بیچ حیات ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کا پانی زندہ ون گاؤں اور آس پاس کے علاقوں کے لیے آبِ حیات سے کچھ کم نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی جھرنوں کا شفاف اور جھلملاتا پانی بل کھاتا گاؤں میں پہنچ جاتا تھا اور یہاں اس چشمے کے پانی میں مل جاتا تھا جو گاؤں کے متبرک اور تیرتھ استھاپن 'ناگہ راد' میں ابلتا تھا۔ جہاں سے حیات ندی جنم لیتی تھی' 'ناگہ راد' تمام دھرموں اور مذاہب کا تیرتھ اور مقدس مقام تھا۔ یہاں ایک طرف شیوجی کا پرانا مندر اور دوسری جانب میاں احمد صاحب کی زیارت گاہ تھی۔ بعد میں جدید طرز کا گوردوارہ بھی بنا یا گیا تھا۔ چشمے کے شفاف پانی سے میاں احمد صاحب کے مزار پر آنے والے زائرین وضو کرتے تھے اور مندر میں جانے والے یاتری اشنان۔ گاؤں کے سبھی لوگ خوش حال تھے، پریشان بس محمد رمضان تھا۔

محمد رمضان زندہ ون گاؤں کا واحد گورکن جس کے پاس نہ کھیتی تھی اور نہ کوئی دوسرا کام۔ اس کے گھر میں اس کی بیوی کنج کے علاوہ ماں زون دید، دو چھوٹے بچے عبدالسلام اور سونی تھے۔ گزارے کا انحصار گاؤں والوں کی مہربانی پر تھا۔ مُردوں کو دفنانے کا کام محمد رمضان کے ذمہ تھا۔ جب کہ کوئی عورت مر جاتی تھی تو اسے زون دید ہی نہلاتی اور کفن پہناتی تھی۔ پہلے پہل جب کوئی گاؤں میں مر جاتا تھا تو محمد رمضان کے گھر میں عید ہوتی تھی۔ پندرہ دن تک تعزیتی کھانا گھر میں آجاتا تھا۔ چوتھے پندرھویں اور چالیسویں پر تو وازہ وان سے بھری ترامی ان کے ہاں پہنچ جاتی تھی۔ سبھی گھر والے مزہ لے لے کر رستہ، گوشتابہ اور کباب کھاتے تھے۔ جب ذیلدار کے گھر کا کوئی مر جاتا تھا تو اس کی برسی پر وازہ وان کے ساتھ ساتھ کچھ کپڑا، لتّا اور نقدی بھی آجاتی تھی۔ زون دید اور کنج کے پاس مری ہوئی عورتوں کے کئی جوڑے کپڑے پڑے تھے۔ کبھی کوئی دیالو عورت مر جاتی تو اس کی گلٹ، تانبے یا پیتل کے جھمکے اور چوڑیاں بھی مل جاتی تھیں۔ وصیت کرتی تو اس کا قیمتی سوٹ اور چاندی کا چھلا بھی مل جاتا تھا جب کہ مردوں اور بچوں کے کپڑے محمد رمضان اور عبدالسلام کے حصے میں آجاتے تھے۔

لیکن اب وقت بدل رہا تھا۔ زندہ ون کے گلاب لوگ اڑوس پڑوس کے بول شہروں میں آنے

جانے لگے جہاں کسی طرح ان کے گلشن ذہنوں میں کیکر کے بیج ڈالے گئے جو یہاں کی پھلواریوں میں آہستہ آہستہ جڑیں پھیلانے لگے تھے۔ اب یہاں بھی لوگ اپنے ہی بارے میں سوچنے لگے تھے۔ اقربا پروری بڑھ رہی تھی۔ غریب پروری مفقود ہو رہی تھی۔ ہاتھ پھیلانے والوں کو دھتکارا جا رہا تھا۔ نذرو نیاز، خیرات پر طرح طرح کے فتوے لگ رہے تھے۔ ناگہ راد جیسی متبرک جگہ پر قبضے کی سوچ بڑھنے لگی تھی۔ اب اگر کوئی مر بھی جاتا تھا تو لوگ زیادہ دنوں تک اسے یاد نہیں رکھتے تھے۔ محمد رمضان کا حال دن بدن برا ہو رہا تھا۔ مردے کو دفنانے کے بعد اس کے ہاتھ پر سو دو سو روپے رکھ کر ٹرخایا جاتا تھا۔ چوتھے اور چالیسویں پر کھانا آنا بھی بند ہو گیا تھا۔ ایسے میں اب محمد رمضان کو خود ہی برتن لے کر لوگوں کے دروازوں پر جانا پڑتا تھا جہاں سے اکثر وہ خالی ہاتھ ہی لوٹ آتا تھا۔ ایسے وقت پر زون دید اور کنیج کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کے آنسو آجاتے تھے اور بچوں کے چہروں پر یاس اور ناامیدی کا سوکھا پن جم جاتا تھا۔

کئی دنوں سے سونی بیمار تھی۔ بخار سے برا حال تھا۔ محمد رمضان نے حکیم صاحب کے گھر کے گرد کئی چکر کاٹے مگر خالی ہاتھ ہونے کے سبب اندر جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ پچھلی سردیوں میں جب زون دید کو کھانسی ہو گئی تھی تو اس کی دوائی کے پیسے ابھی تک حکیم صاحب کو نہیں دیے تھے۔ کنیج میاں احمد صاحب کے آستانے سے مٹی لائی تھی جس کا لیپ سونی کے ماتھے پر سوکھ بھی چکا تھا مگر سونی کا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آنکھ بچا کر شیو جی کے مندر سے دھول بھی اٹھا لائی تھی پر کوئی افاقہ نہ ہوا اور یوں بنا علاج کے ایک دن سونی بخار کے ہتھے چڑھ گئی۔

سونی کی موت نے جیسے زون دید کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ کنیج گم سم رہنے لگی تھی۔ عبدالسلام ڈرا ڈرا اور سہما سہما لگ رہا تھا۔ محمد رمضان بے چین اور پریشان تھا۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور شام کو دیر سے لوٹتا تھا۔ زون دید خاموش لیکن مایوس نگاہوں سے بیٹے کو تکتی رہتی تھی۔ آخر ایک شام کچھ زیادہ ہی دیر سے گھر آ کر محمد رمضان نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

'ماں میں یہ گاؤں چھوڑ کر شہر جا رہا ہوں، وہاں کوئی کام کروں گا۔ مزدوری کر کے کچھ کما لوں گا۔ اپنی بے سروسامانی اور تم لوگوں کی فاقہ کشی اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتی'۔ عبداسلام دن بدن کمزور ہو رہا ہے کہیں سونی کی طرح۔۔۔'' اس کے آگے محمد رمضان کچھ کہہ نہ سکا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ کنیج نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ بھی شوہر کے ساتھ شہر جانا چاہتی تھی۔ شہر میں کچھ کام کر کے اپنے میاں کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔ زون دید کی خشک آنکھیں تر ہو گئیں۔

محمد رمضان تیاریوں میں جُٹ گیا تو زون دید زیادہ پریشان ہو گئی۔ وہ محمد رمضان کی منت سماجت

کرنے لگی۔گھر چھوڑ کر نہ جانے کے لیے ہاتھ جوڑنے لگی مگر محمد رمضان کے سامنے گھر کی افلاس کسی اژدر کی طرح پھن پھیلائے کھڑی تھی۔وہ زون دید کے پاؤں پڑا۔اس کے ہاتھ چومے۔وہ ماں کو بھی اپنے ساتھ شہر لے جانا چاہتا تھا لیکن زون دید نے اس کی ایک نہ مانی۔آج شام کے دھندلکے میں جب محمد رمضان اپنی بیوی اور بچے کو لے کر جانے لگا تو اچانک زون دید کی خشک آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ان آنکھوں کا پانی حیات ندی کے آبِ حیات سے بھی زیادہ متبرک، شفاف اور پاکیزہ تھا۔اس نے نم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔جب اس کی نگاہیں لوٹ کر آگئیں تو محمد رمضان اور کنج نے اس کی آنکھوں میں شعلے دیکھے، تپش دیکھی، نفرت سے بھرا جوش و جلال دیکھا۔وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھی۔۔۔۔۔قبر کھودنے والا پھاوڑا اٹھایا اور قبرستان کی طرف بڑھنے لگی۔محمد رمضان اور کنج بھی اس کے پیچھے پیچھے حیران و پریشان قبرستان پہنچے۔زون دید قبرستان کے بیچوں بیچ حنظل کے پیڑ کے قریب کھڑی ہوگئی۔محمد رمضان نے آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں تو اسے لگا جیسے پورا ناگ راد اندھیرے میں ڈوب رہا ہے۔ماحول میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا ہو رہی ہے۔

اچانک بجلیاں کڑکنے لگیں، زور زور سے آندھیاں چلنے لگیں اور کچھ ہی پل میں بوندا باندی شروع ہوگئی۔زون دید نے ایک نظر اپنے بیٹے محمد رمضان پر ڈالی پھر آسمان کی طرف دیکھا۔پھاوڑا اٹھا کر سر سے بلند کیا اور پوری طاقت کے ساتھ حنظل کے درخت کے تنے پر دے مارا۔پھاوڑے کا تیز دھار والا پھل درخت کے سینے میں اندر تک گھس گیا پھر جیسے ناگ راد میں چھپے بیٹھے سارے حشرات الارض جاگ گئے ہوں جیسے میاں احمد صاحب کے مزار کی ساری چادریں ہوا میں اڑنے لگی ہوں۔روحیں آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہوں جیسے شیو جی کے مندر کی ساری گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔ترشول آسمان کو چھید رہے ہوں محمد رمضان ماں کی طرف دوڑنے لگا، وہ چلا رہا تھا۔

''نہیں ماں نہیں۔۔۔ایسا مت کرو ماااااں'' محمد رمضان دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔زون دید ہاتھ اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔اس کے سر کی چادر ہوا میں اڑ گئی تھی۔الجھے سفید بال ہوا میں لہرا رہے تھے، اب بارش تیز ہوگئی تھی۔محمد رمضان بڑی مشکل سے زون دید کو گود میں اٹھا کر گھر لایا۔کنج اور عبدالسلام بھی اندر آگئے۔وہ سارے بھیگ چکے تھے۔محمد رمضان نے زون دید کو ایک چھٹی چادر پر لٹا دیا۔وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی، اس کا سینہ دھونکنی کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا۔محمد رمضان نے ماں کا سر اپنی گود میں لے لیا اور اس کے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔کنج ساس کے پیر سہلا رہی تھی تو عبدالسلام نے دادی کا ہاتھ اپنے ننھے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔آہستہ آہستہ زون دید کی اترتی چڑھتی سانسوں میں ٹھہراؤ سا آگیا۔اس نے آنکھیں کھولیں۔حسرت سے بیٹے کو دیکھا پھر بہو اور پوتے کو دیکھا۔یاس اور ناامیدی اس کے چہرے کو مرجھا چکی تھی۔اس نے

آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ بادلوں کی گھن گرج میں کنیز کی چیخیں دب کر رہ گئیں۔

زون دید کی موت کوئی بڑا حادثہ یا کوئی تاریخی واقعہ نہ تھا جو وہ حالات بدلنے کا سبب بنتی۔شاید حالات کو بدلنا ہوتا ہے اور ایسے کئی واقعات ایک ساتھ مل جاتے ہیں جو تاریخ رقم کر دیتے ہیں یا کبھی ایسے حالات بنائے جاتے ہیں جن سے پوری انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔یہ انسان ہی تو ہے جس نے ماحول میں تعصب کا زہر گھول دیا ہے۔انسان کو انسان کے خلاف اکسانے کا ایسا نشہ اگایا ہے جس کا اثر صدیوں تک زائل ہونے کے آثار ہی نہیں لگ رہے ہیں۔پھر اس زہریلی ہوا سے زندہ ون کی صاف وشفاف فضا کیسے بچ پاتی؟

یہاں کے برف سے ڈھکے پہاڑ جیسے اچانک آتش فشاں بن گئے۔ناگ راد کے سوتے نفرت اور تعصب کے فوارے ابلنے لگے۔حیات ندی کا شفاف پانی سرخ ہوگیا۔زندہ ون جیسے مرگ ون میں بدل گیا۔مرغ زار قبرستان بن گئے۔روز ایک دو تین یہاں تک کہ کبھی کبھی دس بارہ لوگ مرنے لگے۔سرسبز اور شاداب ناگ راد تیزی کے ساتھ کیکروں کا جنگل بن رہا تھا۔

محمد رمضان کے گھر پر اب بھیڑ لگی رہتی ہے، دن تو دن، رات کو بھی اس کے دروازے پر مرنے والوں کے رشتہ دار اور احباب منت سماجت کرتے رہتے ہیں۔وہ قبریں کھود کر رکھنے لگا اور اپنی مرضی سے ان کا معاوضہ بھی، اب وہ کسی کے چوتھے چالیسویں یا برسی پر کسی کے گھر نہیں جاتا ہے۔نہ کھانا لانے والوں کو گھر آنے دیتا ہے۔اس کے گھر میں ہر روز اچھے اچھے پکوان بنتے ہیں۔کنیز اور عبدالسلام کے لیے کپڑے بازار سے آتے ہیں۔گھر میں عیش و آرام کی ساری چیزیں تو آ گئیں لیکن زون دید اور سونی کی کسمپرسی والی موت یہ لوگ نہیں بھول پا رہے ہیں، شاید اسی وجہ سے حنظل کے پیڑ سے پھاوڑا نکالنے کی طرف ان کا ظن نہیں جا رہا ہے جو ابھی بھی کسی مقدس نشانی کی طرح لٹک رہا ہے اور حنظل کی پیٹھ سے گاڑھا گاڑھا سبز مواد رِس رہا ہے۔

☆☆☆☆

سلمان باسط
مشی گن، امریکا

کیا کیا ہمیں یاد آیا

فیڈرل گورنمنٹ ڈگری کالج کھاریاں کینٹ میں انگلش کے لیکچرار کی ایک سے زیادہ اسامیاں خالی تھیں۔ کالج کو اساتذہ کی اشد ضرورت تھی مگر حکومت کی جانب سے تعیناتیاں نہیں ہو پا رہی تھیں۔ ان دنوں انگلش کے ایم اے کم کم ہی دستیاب ہوا کرتے تھے۔ محکمہ پرنسپل صاحبان کو مقامی طور پر مسائل حل کرنے کی تلقین کرتا رہتا تھا۔ اباجی کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے تعینات تھے اور ان کی پیشکش تھی کہ امتحان سے فراغت ملتے ہی مجھے عارضی نوکری مل سکتی ہے۔ سب سے اہم اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں امتحان کے بعد ایک دن بھی فارغ نہ رہنے کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں اس کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر چکا تھا اور اسی کالج میں اپنے اساتذہ کا رفیق کار بننا ایک ایسا اعزاز تھا جسے میں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ 31 جنوری 1982 کو میں آخری پرچہ دے کر لاہور سے کھاریاں پہنچا اور یکم فروری کی صبح کو ملازمت جوائن کر لی۔ اگرچہ یہ باقاعدہ ملازمت نہیں تھی۔ یہ ایک مقامی بندوبست تھا جس میں 600 روپے کا معمولی سا اعزازیہ طے تھا مگر میرے لیے اس وقت پیسے سے زیادہ دوسرے عوامل زیادہ اہم تھے۔ لیکچررشپ کی صورت میں میرے دیرینہ خواب کی تکمیل ہو رہی تھی۔ میں نے پہلے دن اپنا واحد سوٹ زیب تن کیا اور کالج جا پہنچا۔ تمام پروفیسرز نے کھلی باہوں سے میرا استقبال کیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایئر کی کلاس میں داخل ہوا تو اپنے لیے 'سلام علیکم سر،، کے الفاظ اجنبی سے لگے۔ پہلے تو غیر ارادی طور پر مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا کہ شاید یہ استقبالیہ نعرہ کسی اور پروفیسر کے لیے ہے لیکن دروازے پر کسی کو نہ پا کر مجھے یقین کرنا پڑا کہ عمر بھر اپنے اساتذہ کو سر کہہ کر مخاطب کرنے والا اب خود سر کا خطاب پا چکا ہے۔ میں اپنے ذہن میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ مجھے اپنے شاگردوں سے کیا بات کرنی ہے۔ اپنے مختصر تعارف کے بعد میں نے انگریزی زبان و ادب کے بارے میں اپنے دماغ کی میگزین میں بھرے ہوئے تمام کارتوس چلا دیے۔ خوش قسمتی سے ایک بھی نشانہ خطا نہ ہوا۔ پتہ بھی نہ چلا کب کلاس کا وقت ختم ہو گیا جب میں نے دوسرے مضمون کے پروفیسر صاحب کو رجسٹر تھامے دروازے پر بے قرار پایا تو وقت کی گزران کا علم ہوا۔ میں نے طلبہ کو خدا حافظ کہا۔ پروفیسر صاحب سے معذرت چاہی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا 'ایک کلاس کا دورانیہ چالیس منٹ ہوتا ہے پروفیسر صاحب، ممکن ہے

پروفیسر صاحب کے الفاظ انھوں نے طنزاً ہی کہے ہوں لیکن مجھے اِن الفاظ نے کچھ ایسا خمار عطا کیا کہ کلاس روم سے سٹاف روم کی طرف جاتے ہوئے میں اپنے قدم زمین پر نہیں، بادلوں پر رکھ رہا تھا۔

کھاریاں کینٹ کے کالج میں بمشکل چند روز ہی گزرے تھے کہ مجھے فیڈرل گورنمنٹ ڈگری کالج پشاور کینٹ میں لیکچرر کی حیثیت سے تعیناتی کا پروانہ ملا۔ میں نے سامان اٹھایا اور پشاور جانے والی بس میں سوار ہوگیا۔ محض تئیس برس کا سن اور گریڈ سترہ کی من چاہی ملازمت۔ میں دھنک پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ تعبیر میں ڈھلتے میرے خواب مجھے اڑائے پھر رہے تھے۔ میں خوش نصیب تھا کہ میرا شوق ہی میرا پیشہ بن چکا تھا۔ ان دنوں گریڈ سترہ کی ابتدائی تنخواہ تقریباً سولہ یا سترہ سو روپے تھی۔ مجھ ایسے بے فکرے اور فارغ البال نوجوان کے لیے یہ خاصی معقول رقم تھی۔ میں اپنے خوابوں کی گٹھڑی اٹھائے پشاور پہنچا۔ بس سے اترنے کے بعد سیدھا کالج کی راہ لی۔ مارچ کی دس تاریخ تھی۔ سرما کی دھیرے دھیرے دل اور زمین میں رسنے والی بارش نے سردی کے باوجود ہر طرف رومان بھر دیا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ پرنسپل آفس میں داخل ہوا تو اس کشادہ کمرے پر پرنسپل آفس کے بجائے سٹاف روم کا گمان ہو رہا تھا۔ ایک طرف ہیٹر کے گرد جمع کچھ پروفیسر حضرات بے نیازی سے بلند آواز میں گپ شپ کر رہے تھے۔ دیگر افراد میں سے بھی جس کا جیسے جی چاہتا بلاتکلف کمرے میں اپنی مرضی کی سمت میں اپنی مرضی کی حرکت کر رہا تھا۔ پرنسپل پروفیسر نذیر گل صاحب ایک لمبی سی میز کے سامنے اپنی کرسی پر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ میں نے ان کے پاس پہنچ کر اپنی آمد کا مدعا بیان کیا۔ پرنسپل صاحب نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور خالصتاً پشتو لہجے کی اردو میں کہا کہ میں جو بھی کہنا چاہتا ہوں بلند آواز میں کہوں کیوں کہ کمرے میں شور کی وجہ سے وہ نارمل آہنگ کی گفتگو سننے سے قاصر تھے۔ میں نے نسبتاً آواز بلند کرتے ہوئے اپنی آمد کی غایت دوبارہ بیان کی۔ پرنسپل صاحب ابھی معاملہ سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ پروفیسرز کے جمگھٹے میں سے ایک آواز آئی:

'یہ اپنا بھتیجا ہے جی۔ رانا صاحب کا بیٹا' میری بصارت نے آواز کا تعاقب کیا تو معروف ادبی شخصیت فضل حسین صمیم صاحب کو کھلی باہوں کے ساتھ اپنی طرف لپکتے ہوئے پایا۔ صمیم صاحب منگلا کینٹ میں اباجی کے کولیگ رہے تھے۔ وہ برال کالونی کی سیکنڈ ایوینیو میں ہم سے چند مکان چھوڑ کر رہائش پذیر تھے۔ تب وہ ہمارے انکل ہوا کرتے تھے۔ میں اور بھائی جان منگلا میں بھی صمیم صاحب کے ساتھ اپنے ادبی ذوق کی تسکین کی خاطر ملا کرتے تھے اور وہ ہم دونوں سے بہت شفقت کیا کرتے۔ ایک نئی اور اجنبی جگہ پر صمیم صاحب کا شفیق چہرہ دیکھ کر میرے دل کی بے ترتیب دھڑکنیں ہموار ہوگئیں۔ صمیم صاحب نے سب سے میرا بھرپور تعارف کروایا۔ اس جاندار تعارف سے دیگر پروفیسر صاحبان بھی وقت کے بازار میں ڈھل کر آنے والے نئے سکے کی

طرف ملتفت ہوئے۔ انھوں نے بھی باری باری مجھے خوش آمدید کہا اور چائے پیش کی۔ اجنبیت اور بیگانگی کا احساس چائے کے کپ سے اٹھنے والی بھاپ کے ساتھ ہی کہیں اڑ گیا اور میں نے گریڈ سترہ کا گزیٹیڈ افسر بن کر اپنی سکڑی ہوئی ٹانگیں قدرے پھیلا دیں۔ کلرک کو وہیں بلا کر میری جائننگ کے کاغذات تیار کرنے کو کہا گیا۔ میں ضروری کاغذات پر دستخط کر چکا تو صمیم صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور کالج بلڈنگ سے باہر لے آئے۔ میں نے مروت اور احترام میں منزل کے بارے میں استفسار بھی نہ کیا۔ مجھے منزلِ مقصود کا علم تب ہوا جب وہ مجھے ہمراہ لیے اپنے گھر میں داخل ہوئے۔ اگرچہ ان کے اہلِ خانہ موجود نہیں تھے لیکن انھوں نے بصد اصرار میرے لیے دوپہر کے کھانے کا اہتمام کیا۔ صمیم صاحب نے اپنی محبت کے بھالے سے میرے دل میں ایسا گہرا گھاؤ لگا دیا جو آج تک نہیں بھرا۔ کھانے کے بعد میں نے صمیم صاحب سے اجازت لی۔ سامان عارضی طور پر ان کے گھر چھوڑا اور بھائی جان کے پاس کامرہ چلا گیا جو اس وقت وہاں فلائیٹ لفٹننٹ کی حیثیت سے تعینات تھے۔

کامرہ پاک فضائیہ کا ایک ایسا بیس تھا جہاں جنگی جہاز تیار بھی کیے جاتے تھے اور ان کی اوورہالنگ بھی ہوتی تھی۔ بھائی جان کچھ عرصہ قبل ہی کوہاٹ سے یہاں بیس ایجوکیشن آفیسر کی حیثیت سے پوسٹ ہو کر آئے تھے۔ خوبصورت مگر ویران کامرہ ائیربیس کے رہائشی علاقوں میں اِکادکا لوگ ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔ مجھے حیرت ہوتی کہ اتنی بڑی رہائشی کالونی کے مکین کہاں جا چھپتے ہیں کہ سراغ تک نہیں ملتا۔ لڑاکا جہازوں کی گھن گرج وقفے وقفے سے البتہ سنائی دیتی رہتی یا ائر فورس کی ہلکے رنگ والی دیدہ زیب یونیفارم میں ملبوس کبھی کوئی سمارٹ سا فوجی نظر آ جاتا۔ سکوت کی سرحدوں سے ملتا سکون جو اکتاہٹ کی حدِ فاصل چھو لیتا۔ کامرہ کے بہت قریب محض چند کلومیٹر کے فاصلے پر اٹک شہر تھا جسے کبھی کیمبل پور کہا جاتا تھا مگر پھر مقامیت کے پرستاروں نے ماضی کی سلیٹ سے یہ نام مٹا کر نیا نام لکھ دیا۔ بیت چکے زمانے کے طلسم کے اسیر، کچھ عمر رسیدہ لوگ ابھی بھی اِس شہر کو اِسی نام سے بے ساختہ پکارتے۔ پرانی محبتیں اور پرانے عقیدے کب مرتے ہیں۔ اٹک شہر ان دنوں ایک قصبے سے زیادہ کی قامت اور وجاہت نہیں رکھتا تھا۔ ایک چھوٹا سا مین بازار، دیہاتی ملبوس میں لپٹے اکثر گاہک، دکانوں پر بجتے ہوئے علاقائی نغمے اور مخصوص مقامی سٹائل کی مونچھوں کے حامل مرد ہی مرد۔ یہ شہر اٹک اور کامرہ کینٹ سے چشم تماشا لے کر آئے ہوئے اہلِ دل کے ارمانوں کا خون کرنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ بعد میں بھائی جان کے پاس کئی بار کامرہ جانا ہوا۔ ہر بار قدرے شہری ماحول کی رونق دیکھنے کے لیے اٹک جانا ہوتا لیکن ہر بار ایسے ہی دل شکن تجربات سمیٹ کر واپسی ہوئی۔ ممکن ہے اب اٹک نے چولا بدل لیا ہو لیکن میں گئے وقتوں کی بات کر رہا ہوں۔

میں ایک رات کامرہ میں گزار کر اگلی صبح پشاور پہنچا تو موسم کھل چکا تھا۔ بارش نے اپنا ستار ایک طرف

رکھ دیا تھا اور بادلوں نے دھنک رنگ چنری اتار پھینکی تھی۔ سنہری اور نرم لمس والی مہربان دھوپ ہر کسی پر ملتفت تھی۔ پشاور صدر کے علاقے میں واقع ہمارے کالج اور اس کے عقب میں ہائی سکول کے لان خوش رنگ پھولوں سے مہک رہے تھے۔ میرے سامنے سب سے اہم مسئلہ رہائش کا تھا۔ بظاہر یہ مسئلہ فوری طور پر حل ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ کالج ہال کے اوپر والی منزل پر کچھ کمرے ہیں جن میں نئے آنے والے لیکچررز عارضی طور پر کچھ عرصے کے لیے قیام کر سکتے ہیں۔ ایک عجیب و غریب دشواری یہ آپڑی کہ مجھے جس کمرے میں رہائش اختیار کرنا تھی اس کی چابی نہیں مل رہی تھی۔ بہت تلاش بسیار کے بعد انتظامیہ نے اس روز کے لیے ہتھیار ڈال دیے۔ مجھے چابی مل جانے یا نئی کلید تیار کروا لینے تک کا وقت ہال میں گزارنے کا مشورہ دیا گیا۔ میرے پاس اِس ناخوشگوار حل کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ اباجی کے ایک پرانے لیکن نوجوان کولیگ خورشید صاحب مجھے آملے۔ وہ بھی اسی کالج میں کیمسٹری پڑھانے پر مامور تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر چلنے اور وہاں قیام کرنے کی پرزور دعوت دی لیکن میں کسی پر بار نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں نے ان کی اصرار بھری پیشکش نرم لفظوں میں قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ سراپا خلوص خورشید صاحب نے ایک پیشکش مسترد کیے جانے کے بعد دوسری پیشکش کر دی کہ مجھے ہمراہ بازار لے جا کر ضروری خریداری کرنے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔ میں نے یہ پیشکش بلا تردد قبول کر لی کیوں کہ میں پشاور سے بھی ناواقف تھا اور پشاور کے بازاروں اور وہاں بکنے والی اجناس سے بھی ناآشنا تھا۔ مجھے اب تک پشاور آ کر صرف جنس وفا سے واسطہ پڑا تھا جو وافر مقدار میں دستیاب ہو رہی تھی۔ خورشید صاحب کے ساتھ جا کر میں نے جو ضروری اشیا خریدیں ان میں ایک چارپائی بھی شامل تھی جس نے آنے والے دنوں میں میری خواب آور نیندوں کا سہارا بننا تھا۔

میں نے اپنی چارپائی کالج ہال کے سٹیج پر جا بچھائی۔ نیم دائرے کی شکل کا یہ سٹیج وسیع و عریض ہال کی نسبت چھوٹی جگہ تھی جس کی ہال کی جانب والی سمت کو اگر دیوار تصور کر لیا جاتا تو اسے ایک کشادہ کمرہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ میں نے کچھ دیر تو کیسٹ پلیئر پر اپنے پسندیدہ نغمات سن کر وقت اور دل دونوں کو بہلایا۔ جب رات خوب ڈھل گئی تو میں نے سٹیج کے ایک کونے میں لگے سوئچ کی مدد سے جلتے ہوئے واحد برقی قمقمے کو بھی گل کر دیا۔ سونے کے لیے بستر پر لیٹنے کا ارادہ کیا تو بے ساختہ ایک نظر تاریک ہال پر ڈالی۔ کسی نادیدہ خوف کے سنپولیے میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسرانے لگے۔ میں ایک سنپولیے کا سر کچلتا تو دوسرا پھن اٹھا کر میرے سامنے لہرانے لگتا۔ میرے سامنے پھیلے مستطیل شکل کے نہایت کشادہ ہال کے دونوں جانب نشستوں کی قطاریں تھیں۔ کبھی مجھے لگتا ایک پچھلی نشست سے کسی نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا ہے۔ کبھی یہ سر کسی دوسری نشست سے بلند ہوتا نظر آتا۔ رفتہ رفتہ نشستیں غیر مرئی حاضرین سے بھرنے لگیں۔ لاموجود، موجود پر غالب آنے لگا تو میرے حواس مختل

ہونے لگے۔ آیت الکرسی کا ورد کرنا شروع کیا تو گھبراہٹ میں الفاظ گڈ مڈ ہو گئے۔ مجھے یک دم محسوس ہوا کہ کسی چیز کے غرانے کی آواز بھی آ رہی ہے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہال کا جائزہ لیا مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے لپک کے اضطراری انداز میں گل کی ہوئی روشنی جلانا چاہی تو سوئچ آن کرنے کے باوجود بلب نہ جلا۔ میں نے لگاتار کئی بار سوئچ آن اور آف کیا مگر روشنی مجھ سے روٹھی رہی۔ غراہٹ کی آواز اب نہ صرف بڑھ رہی تھی بلکہ اُس کا دورانیہ بھی طویل ہو رہا تھا۔ یہ آواز عجیب طرح گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اب یہ بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بیرونی دروازہ کس طرف ہے جس سے میں ہال میں داخل ہوا تھا۔ میں اپنی چارپائی سے اٹھ کر دروازے تک جانے کا خطرہ بھی مول لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ اتنی مسافت طے کرنے کے دوران ان ہونی کہیں وقتِ مقررہ سے پہلے نہ ہو جائے۔ خوف میرے رگ و پے میں پوری طرح اتر چکا تھا۔ سونا تو درکنار میں لیٹنے کا رسک بھی لینے کو تیار نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی میں لیٹا کوئی نادیدہ قوت مجھ پر حملہ آور ہو جائے گی۔ میں نے بالآخر چارپائی پر دونوں پاؤں کے بل بیٹھ کر اس طرح نشت سنبھال لی کہ اگر کوئی ناگہانی صورتِ حال پیش آ جائے تو اپنے دفاع میں کچھ نہ کچھ کر سکوں۔ وہ 'کچھ نہ کچھ' کیا تھا، اِس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نادیدہ اور نا آشنا غراہٹ، ہال کی نشستوں پر بے بدن حاضرین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مکمل تاریکی کے احساس سے میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ بارہا اپنی مردانگی کو آواز دی۔ خود کو بزدلی کا طعنہ دیا۔ اپنے بہادر راجپوت اجداد کی درخشاں تاریخ کو یاد کیا لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ وہ رات میں نے چارپائی پر پنجوں کے بل بیٹھ کر کاٹی۔ جانے کتنے گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ بالآخر قریب کسی مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی تو دفعتاً مجھے ایک روشن دان سے پھڑ پھڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں نے شاید آواز اور روشنی سے بھی تیز رفتار سے روشن دان کی جانب دیکھا تو ایک کبوتر کو باہر کی جانب پر فشاں ہوتے پایا۔ میرے خوف کی دیوار میں پہلی دراڑ پڑ گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں رات بھر جس غراہٹ سے خوف زدہ رہا وہ اس کبوتر کی غٹرغوں تھی۔ اذان ختم ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ باہر صبحِ صادق کی ہلکی ہلکی روشنی بھی پھیل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے صبح کے نور نے ہال کے اندر کے مناظر بھی واضح کرنا شروع کر دیے۔ میں نے دزدیدہ نگاہی سے ہال کی نشستوں کی جانب دیکھا تو رات بھر موجود رہنے والے حاضرین بھی رخصت ہو چکے تھے۔ بلب جلانے کے لیے اٹھا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ رات کو جس سوئچ سے میں بلب روشن کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ دراصل سوئچ کی ہمسائیگی میں واقع تھا اور میں گھبراہٹ میں غلط سوئچ سے روشنی کرنے کی سعی ناکام کرتا رہا۔ اب بیرونی دروازہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے خوف کا بت مکمل طور پر مسمار ہو چکا تھا۔ میں نے اِس بت کی کرچیاں سمیٹ کر ایک طرف رکھیں اور اپنے مسجود کے حضور حاضر ہونے کی تیاری کی، اٹھ کر وضو کیا۔ فجر کی

نماز ادا کی۔ نیند میرے انگ انگ سے ٹپک رہی تھی۔ میں اسی سٹیج پر بچھی اسی چار پائی پر لیٹا اور لمبی تان کر سو گیا۔

غالباً میری تین راتیں کالج ہال کے سٹیج پر گزر چکی تھیں کہ آخر کار مطلوبہ کمرے کا تالا کسی اسم کے پھونکے جانے سے کھل گیا اور میں نے خود کو سامان سمیت ہال سے اس کمرے میں منتقل کر لیا۔ یہ ایک بڑے کمرے کا نصف تھا۔ بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر کے اسے دو کمروں کا نام دے دیا گیا تھا۔ نرم دل دیوار کی ہمت بھی چھت سے ذرا پہلے ٹوٹ گئی تھی۔ دیوار کے دوسری طرف پروفیسر ابراہیم خٹک صاحب رہائش پذیر تھے۔ اس نیم کش دیوار کا فائدہ یہ تھا کہ رات کو اپنے اپنے بستر پر لیٹ کر ہم دونوں تب تک باتیں کرتے رہتے جب تک نیند ہمارے لبوں سے لفظ نہ اچک لیتی۔

شعبہ انگریزی ان دنوں اساتذہ کی دستیابی کے حوالے سے خاصا قلاش ہوا کرتا تھا۔ میرے جائن کرنے سے قبل ڈگری کالج کی تمام کلاسز کو پڑھانے کے لیے صرف دو اساتذہ میسر تھے۔ ایک شعبہ کے سربراہ پروفیسر اختر صاحب اور دوسرے ابراہیم خٹک صاحب۔ اختر صاحب دہلوی لہجے میں اردو اور فرنگی لہجے میں انگلش بولتے تھے۔ خوش مزاج اور مشفق پروفیسر اختر صاحب ریٹائرمنٹ کے قریب تھے۔ ان دنوں انٹرمیڈیٹ کی کلاسز امتحانات قریب ہونے کی وجہ سے ختم ہو چکی تھیں اور ڈگری کلاسز ان دونوں محترم اساتذہ کے سپرد تھیں۔ مجھے مژدہ سنایا گیا کہ ستمبر تک مجھے کسی کلاس میں جانے کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کھاؤں پیوں اور عیش کروں۔ مجھے کالج پر جنت کا گمان ہونے لگا جہاں مجھے صرف کھانے پینے اور عیش کرنے کو بھیجا گیا تھا۔ گھومنے کی بھی آزادی تھی مگر کسی نے بھی ہنوز کسی شجرِ ممنوعہ کے بارے میں ہرگز کوئی اطلاع نہ دی تھی۔

ابراہیم خٹک صاحب نے از خود میرا چارج سنبھال لیا۔ میں نے کھانا کہاں سے کھانا ہے۔ کپڑے کہاں سے دھلوانے ہیں۔ کن لوگوں پر اعتبار کرنا ہے، کن سے محتاط رہنا ہے اور خریداری کے لیے کہاں کہاں جانا ہے۔ پہلا مرحلہ کھانے کا تھا جو خٹک صاحب نے یوں طے کیا کہ مجھے تفصیل بتانے کے جھنجٹ میں پڑنے کے بجائے ساتھ لیا اور صدر کے علاقے میں ہی واقع دہلی مسلم ہوٹل نام کے ایک ریستوران میں لے گئے۔ قربت کی وجہ سے یہ فاصلہ پیدل ہی طے کیا۔ کالج والی سڑک پر بائیں جانب کچھ دور چلنے کے بعد بائیں طرف ہی خانہ فرہنگ ایران کا دفتر تھا جس کے صدر دروازے کے باہر بڑے بڑے بینرز پر مرگ بر امریکہ، مرگ بر روسی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ میرے پشاور چھوڑنے تک یہ بینرز وہیں آویزاں رہے۔ امریکہ اور روس پر موت کے سائے منڈلاتے دیکھنے کی حسرت دل میں ہی رہی۔ اس کے بعد ہم مزید بائیں جانب مڑے اور مال پر تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد دائیں طرف ارباب روڈ پر قدم رکھ لیے۔ ہمارے اس سفر میں یہ واحد دایاں موڑ تھا ورنہ باقی تمام سفر کے دوران ہم بائیں بازو کے ہی علمبردار رہے۔ ارباب روڈ کے اختتام پر ہم پھر بائیں سمت میں

مڑ گئے اور کچھ ہی فاصلے پر دہلی مسلم ہوٹل جا پہنچے۔ کاؤنٹر براجمان گول چہرے اور آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک سجائے ایک قدرے فربہ مگر خوش مزاج نوجوان نے ہمارا بہت بے تکلفی سے استقبال کیا۔ خٹک صاحب نے پہلے تو سلیم نام کے اس نوجوان کی شان میں مغلظات سے معمور قصیدہ پڑھا جس کے جواب میں سلیم مسلسل کھلکھلاتا رہا۔ قصیدہ تمام ہو چکا تو ویٹرز کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا دور چلا۔ اس طویل تمہید کے بعد میرے تعارف کی نوبت آئی۔ خٹک صاحب نے سلیم کو بتایا کہ آج سے یہ بھی یہیں کھانا کھائے گا۔ مجھ سے پوچھنے کا تکلف بھی نہ کیا گیا، آیا میں بھی اس فیصلے پر راضی ہوں۔ سلیم نے بڑی محبت سے مجھے خوش آمدید کہا اور اتنے وثوق سے مجھے کھانے کے پیسوں کی چنداں فکر نہ کرنے کو کہا کہ ایک بار تو مجھے بھی لگا میرا کھانا اس لنگر سے جاری ہو چکا ہے۔

میرے آرڈر دینے سے پہلے ہی چکن کڑاہی، پلاؤ، رائتے، سلاد اور گرم گرم پشاوری نان سے میز سج گئی۔ میں ششدر بیٹھا سب دیکھتا رہا۔ ظالموں نے مجھے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے قبل مینیو پر ایک نظر ڈالنے کی بھی فرصت نہ دی۔ کھانا کھا چکے تو خوشبودار فیرنی چن دی گئی۔ میں نے غیر ارادی طور پر جیب ٹٹول کر وہاں موجود رقم کی حیثیت کا جائزہ لیا۔ دھڑکتے دل اور ہاتھ لرزاتے خدشات کے ساتھ مزیدار فیرنی کو بدمزہ طریقے سے کھایا۔ ابھی فیرنی ختم ہی ہوئی تھی کہ دہلی مسلم ہوٹل کے جنات نے پلک جھپکتے ہی ہماری میز پر پشاوری قہوہ لا رکھا۔ خٹک صاحب کے لیے قہوے کے ساتھ ایک تازہ اور کڑک نان خصوصی طور پر آیا۔ تام چینی کی چینک کے ساتھ دو چھوٹی چھوٹی گول پیالیاں ہمارے سامنے تھیں۔ خٹک صاحب نے چینک سے پیالیوں میں قہوہ انڈیلا تو نرم و نازک پیالیوں سے گرم قہوے کی بھاپ کے ہمراہ نتھنوں میں خوشبو گھس آئی۔ خٹک صاحب نے نان کے دو ٹکڑے کیے اور آدھا میری طرف بڑھا دیا۔'اس کے بغیر قہوہ پینا حرام ہے'۔ یہ کہتے ہوئے خٹک صاحب نے شربتی آنکھوں اور پان زدہ ہونٹوں سے بے اختیار اور بے باک قہقہہ لگایا۔ میں نے ان کی پیروی میں نان کا ایک کرکرا سا ٹکڑا منہ میں رکھ کر دانتوں تلے چبایا اور قہوے کی پہلی چسکی لی تو خٹک صاحب کی بات پر فوراً ایمان لے آیا۔ میں نے اپنی تئیس سالہ زندگی میں اس سے قبل ایسا پرلطف قہوہ کبھی نہیں پیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے میں نے بھی اس ذائقے دار کھانے کے بل کو قہوے کی بھاپ کے ساتھ اڑائے رکھا۔ قہوہ ختم ہوا تو خٹک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے اٹھنے کے ساتھ ہی بل کے بارے میں میرے خدشات بھی پوری قامت سے کھڑے ہو گئے۔ میں نے متجسس نظروں سے ان کی جانب دیکھا تو انھوں نے میری نگاہوں کو پڑھ لیا۔ اسی بلند آہنگ میں گویا ہوئے کہ مہینے کے آخر میں حساب ہو گا اور جو بل بنے گا ادا کر دیا جائے گا۔ روز روز اس مالیاتی جھنجٹ میں نہیں پڑا جاتا۔ کھانا ختم ہوتے ہی سلیم ہماری طرف لپک آیا۔ مجھ سے اس نے کھانے کے بارے میں استفسار کیا۔ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ میں نے بھی دل کھول کر داد دی۔ خٹک صاحب نے سلیم کو پیسوں کے

بارے میں میرے سوال کے بارے میں بتایا تو سلیم جھٹ بول اٹھا کہ آج کا کھانا تو میری طرف سے تھا۔ آپ مہمان ہیں۔ کل سے آپ کا حساب لکھ لیا کروں گا۔ میں نے اصرار کیا تو وہ بھلا مانس اس موضوع پر بات کرنے کو ہی تیار نہ تھا۔ مجھے ہار ماننا پڑی۔ دہلی مسلم ہوٹل سے اٹھا تو میں پشاور اور اہلِ پشاور کی محبت اور روایتی مہمان نوازی کے سامنے دل بھی ہار چکا تھا۔

کالج میں امتحانات قریب آنے کے باعث تدریسی سرگرمیاں نہیں تھیں۔ ہم سارا دن سٹاف روم، کیفے ٹیریا، لان اور کیمپس کے کونوں کھدروں کو گپ شپ کارنرز بنائے رکھتے۔ دوپہر ہوتی تو میں اور ابراہیم خٹک صاحب دہلی مسلم ہوٹل سے اپنی بھوک مٹانے چل پڑتے۔ کھانا کھاتے۔ باتیں کرتے۔ قہقہے لگاتے مگر وقت کی ریزگاری خرچ ہونے میں ہی نہ آتی۔ گاہکوں کا رش ذرا تھمتا تو سلیم کیش کاؤنٹر سے اٹھ کر ہماری میز پر آبیٹھتا۔ قہوے کا ایک اور دور چلتا۔ خٹک صاحب کے سامنے میکانکی انداز میں سنہری رنگت والا ایک کرارا سا نان آتا۔ خٹک صاحب گرم نان کی اشتہا پر قابو نہ پا سکتے تو نان کی حدت کو دونوں ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے آدھا حصہ میری طرف بڑھا دیتے۔ ہم نان کی خستگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے قہوے کی سُرکیاں بھرتے جاتے۔ ریستوران کے شیشوں سے باہر نظر آنے والے متحرک مناظر میں دوڑتی گاڑیاں، سست و تیز قدموں سے اپنی مطلوبہ منازل کی طرف بڑھتے لوگ اور موسم کی جولانیاں شامل تھیں۔ یہ سب تماشہ ہماری آنکھوں کی پتلیوں پر رقم ہوتا رہتا۔

میں اپنے کمرے میں لوٹتا تو تنہائی ڈسنے لگتی۔ دھیمے سروں میں کیسٹ پلیئر پر میرے پسندیدہ گیت بجتے رہتے اور میں بستر پر نیم دراز ہو کر یا تو اپنے محبوب مشغلے میں مگن ہو جاتا اور گزرے وقت کی راکھ کریدنے لگتا یا اپنی غزلوں کے مصرعے اور نظموں کی سطور سیدھی کرتا۔ دوپہر سہ پہر میں ڈھلتی اور کالج ہال کی بالائی منزل پر میرے کمرے سے دکھائی دینے والے سرکشیدہ درختوں کے سائے لمبے ہونے لگتے تو میں کمرے کے دروازے پر لگی آہنی کنڈی میں وہ ٹرائی سرکل تالہ اڑس کر باہر نکل آتا جو ان دنوں چینی صنعت کی اولین نشانیوں میں سب سے مقبول شے تھی۔ میں طویل راہداری سے بوجھل قدموں کے ساتھ گزرتا ہوا سیڑھیاں اتر کر کالج بلڈنگ کے سامنے والے لان میں آبیٹھتا۔ نرم گھاس کے قطعے پر بیٹھ کر ہلکا سا پیچھے کی جانب جھکتا اور کہنیوں کے سہارے بدن کو ٹکا لیتا۔ نیلے آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے رہتے۔ پرندے اونچی نیچی اڑان بھرتے رہتے۔ سبز درختوں کی شاخوں پر مختلف رنگوں کے شگوفے کھلے ہوتے۔ میں مناظر کی اس دھنک میں کھو جاتا۔ کیاریوں میں کھلے ہوئے خوشنما پھولوں کی مہک ان مناظر میں گھلنے لگتی تو میرے اندر بے کلی کسی خودرو جھاڑی کی طرح اگنے لگتی۔ اس بے کلی نے زندگی بھر چین سے جینے نہ دیا۔ حسن اور دلکشی سے وابستہ اپنی بے کلی

مجھے کبھی سمجھ نہ آئی۔

شام کا جھٹپٹا پھیلنے لگتا تو ابراہیم خٹک بھی اپنی بلوریں آنکھوں سے مسکان چھلکاتے اور پان چباتے میرے پاس آ بیٹھتے۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے رہنے کے بعد ہم ایک دوسرے سے بغیر کچھ کہے اٹھتے اور صدر کی جانب چل پڑتے۔ مال سے ہوتے ہوئے ارباب روڈ کے آخری سرے پر پہنچتے تو خٹک صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر گورا بازار کی تنگ رہداریوں کی جانب موڑ لیتے۔ میں مسکراتا ہوا ان کے ساتھ سرک جاتا۔ گورا بازار خواتین کے لیے مختص تھا۔ اس بازار میں بکنے والی سبھی اشیاء خواتین کے استعمال کے لیے تھیں لیکن شے کی حقیقت سے ماورا گھومنے والے نوجوان مردوں کی بھی خاصی تعداد ہمہ وقت موجود رہتی۔ یہ نوجوان صرف بازار سے گزرتے تھے، خریدار نہیں تھے۔ یہاں سے نکلتے تو ہمارے قدم بے اختیار دہلی مسلم ہوٹل کی طرف اٹھ جاتے جہاں سلیم ہمارا منتظر ہوتا۔ دہلی مسلم ہوٹل میں ہماری میز پر اب دو افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اقبال نقوی اور طاہر پرواز نیشنل سینٹر سے منسلک تھے اور کھانا کھانے کے لیے انھیں بھی اس ریستوران سے بہتر جگہ نہیں ملی تھی۔ طاہر پرواز کے ملی نغمے 'امید صبح جمال رکھنا، خیال رکھنا' نے بعد میں عالمگیر کے لبوں سے ادا ہو کر بہت شہرت پائی۔ طاہر پرواز خوش گفتار، بے تکلف اور زود گفتار شخص تھا۔ دوستوں کا دوست۔ طاہر پرواز سے بعد میں بھی ملاقاتیں رہیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہم اسلام آباد کے سیکٹر آئی ایٹ کی ایک ہی گلی میں رہائش پذیر تھے۔ اقبال نقوی ایک خاموش طبع، سلجھا ہوا اور سنجیدہ نوجوان تھا۔ کھانے کے دوران کی ہماری گفتگو کھانے کے بعد بھی جاری رہتی۔ کھانا کھانے اور خوشبودار قہوہ پی لینے کے بعد ہم سب چہل قدمی کے لیے صدر کی مختلف سڑکوں کو ناپتے۔ ابراہیم خٹک صاحب کو تقریباً سارا پشاور جانتا تھا۔ اس مٹرگشت کے دوران وہ مختلف دکانداروں کے ساتھ چہلیں کرتے اور ان پر جملے کستے۔ دکاندار بھی جواباً لطیف جملوں سے وار کرتے۔ خٹک صاحب پان کے رسیا تھے۔ ایک مخصوص دکان سے روزانہ پان کا ذخیرہ حاصل کرتے۔ پان حاصل کر لینے کے بعد پان والے کے ساتھ ناقابل اشاعت اور ثقیل گالیوں کا تبادلہ کرنا کبھی نہ بھولتے۔ وہ منہ، ہونٹوں اور دانتوں کو گلال بناتے ہوئے کسی کے ساتھ پشتو کسی کے ساتھ ہندکو اور ہمارے ساتھ ٹھیٹھ پنجابی میں گفتگو کرتے اور قہقہے لگاتے رہتے۔ وہ سترہ برس لاہور میں مقیم رہے تھے اور وہ اس بات پر بہت فخر کیا کرتے تھے۔ پشاور صدر کی سڑکوں پر ہمارے قدموں کی چاپ کو قرار آنے لگتا تو ہم اپنی اپنی خواب گاہوں کو لوٹ جاتے اور بستروں پر اپنے بے قرار بدن بچھا دیتے۔

میرے بچپن کے دنوں کی پلے میٹ اور میری خالہ زاد روبینہ کے ساتھ میری نسبت بہت پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ میں ایم اے کے آخری سمیسٹر میں تھا جب ایک ویک اینڈ پر گھر آیا تو اباجی نے رات کے کھانے پر اعلان نما انداز میں مجھے بتایا کہ پڑھائی مکمل ہوتے ہی میری شادی کر دی جائے گی۔ تب باپ سے

بحث کا رواج نہیں ہوا کرتا تھا۔ مجھے شادی سے انکار نہیں تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ ابھی شادی کے لیے میری عمر بہت کم ہے۔ دوسرے میں کچھ عرصہ اپنی مرضی کی آزاد اور بےفکری والی زندگی بھی جینا چاہتا تھا اور خواہش تھی کہ ملازمت مل جانے کے بعد اپنی کمائی کے چند سکے اپنی جیب میں بھی ڈالوں جو کچھ عرصہ وہاں کھنکتے رہیں۔ میں نے منمناتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ ابھی میری عمر کم ہے۔ اباجی نے قدرے ملامت سے کہا کہ تمھارا یہ تصور غلط ہے۔ تم جوان ہو اور ایم اے بھی کرنے والے ہو۔ ان شاءاللہ جلد جاب بھی ہو جائے گی۔ تمام کام وقت پر ہو جائیں تو مستقبل خود ہی بہتر ہو جاتا ہے۔ اللہ کا بھی یہی حکم ہے۔ ہم نے تمھاری پڑھائی کی تکمیل کا انتظار کیا۔ اب شادی ہو جانی چاہیے۔ میرے پاس اس کے بعد نہ تو دلائل تھے اور نہ انھیں پیش کرنے کا یارا۔ یوں بھی میں ہارا ہوا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ رات کو امی جی کے سامنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہی تو انھوں نے بھی صاف کہہ دیا کہ جو کہنا ہے اپنے اباجی سے کہو۔ میں تو واٹرلو سے پہلے ہی شکست کھا کر پلٹ چکا تھا۔ بالآخر کمک نہ پا کر ہتھیار ڈال دیے اور تیئیس برس کی بالی عمر میں یہ بھاری پتھر اٹھانے پر تیار ہو گیا۔

19 اپریل 1982 کی صبح ہم کھاریاں کینٹ سے بارات لے کر راولپنڈی روانہ ہوئے۔ میرے گھر والوں، دوستوں اور اعزہ کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ سبھی باراتی چند گاڑیوں اور ایک بس میں سوار تھے۔ بارات کی روانگی کے موقع پر نہ تو پٹاخے چھوڑے گئے، نہ ڈھول باجے کا اہتمام ہوا اور نہ ہی کسی نے وجد میں آ کر رقص کیا۔ گزشتہ رات مہندی کی کسی تقریب کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ گھر کے ماتھے پر قمقمے بھی روشن نہ ہوئے۔ بس قریبی رشتہ دار اور میرے کچھ دوست بارات میں شریک تھے۔ اس تمام تر پرہیزی شادی کی وجہ یہ تھی کہ اباجی نہ تو نمود و نمائش کے قائل تھے اور نہ دھوم دھڑکے کے بارے میں نیک خیالات رکھتے تھے۔ امی جی، بھائی جان اور میرے کچھ کزنز کے اصرار پر بارات کی روانگی سے قبل نمائی سی سہرا بندی کی ایک تقریب ضرور ہوئی جس میں غنیمت تھی کہ سہرا تو نہیں باندھا گیا البتہ مجھے کرنسی نوٹوں والے لاتعداد ہاروں سے لاد دیا گیا۔ اس خطرے کو بھانپتے ہوئے میں نے اور اعجاز نے نوٹوں سے یکسر انکاری ایک سادہ سے ہار کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سہرا بندی کی تقریب اور فوٹو سیشن کے فوراً بعد میں نے نوٹوں والے ہاروں سے نجات حاصل کر لی۔ پورا راستہ سکون سے گردن کو ہر بوجھ سے آزاد رکھ کر کاٹا۔ دلہن کے گھر کے قریب پہنچ کر اعجاز کا لایا ہوا وہ ہار پہن لیا تا کہ دولہے اور دیگر باراتیوں میں امتیاز کیا جا سکے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ بارات میں مجھ سے زیادہ وجیہہ کئی لوگ شامل تھے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ آج کے معروف سیاستدان اور کھاریاں کینٹ کالج کے عزیز دوست قمر زمان کائرہ بھی بارات میں شریک تھے۔ قمر زمان کائرہ زمانہ طالب علمی سے ہی بہت شائستہ اور مہذب انسان تھے۔ اباجی کا استاد کی حیثیت سے بہت احترام کرتے تھے۔ تب بہر حال ان سمیت کسی کے گمان بھی نہ تھا

کہ ایک روز وہ ملک کی سیاست میں مرکزی کردار ادا کریں گے۔ بارات دینہ پہنچی تو میرے دوستوں شیخ ضیاالحق، اعجاز، افتخار اور ظاہر شاہ نے باراتیوں کو ایک ریستوران پر پرتکلف ناشتہ کروایا۔ باراتیوں نے بھی اس پرتکلف ناشتے کے ساتھ کافی بے تکلف سلوک کیا۔

دوپہر کے وقت ہم راولپنڈی پہنچے۔ پھولوں سے سجی میری گاڑی دلہن کی گلی میں داخل ہوئی تو بلاوجہ ہی میرے دل کی دھڑکن ناہموار ہونے لگی۔ کسی بھی مشکل موقع پر اعتماد نہ کھونے والا اسلمان باسط بارات کے استقبال کے موقع پر بری طرح جھینپ گیا۔ ہر شخص مجھے گلے لگانا، گلاب کے پھولوں کا ہار پہنانا اور خوش اخلاقی سے مسکرا کر میری طرف دیکھنا اپنا فرض سمجھ رہا تھا۔ ہر نگاہ مجھ پر مرکوز تھی حتیٰ کہ گلی کے تمام گھروں کی چھتوں پر ہر عمر کی خواتین بھی موجود تھیں اور انگلیوں کے اشاروں سے ایک دوسری کو میری پہچان کروانے میں کمر بستہ تھیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں دولہا نہیں بلکہ کرکٹ یا ہاکی کا ورلڈ کپ جیت کر اس گلی میں داخل ہوا ہوں۔

ان دنوں بارات کے لیے شادی ہالز کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ ایک تو شادی ہال ہی بہت کم تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میزبان اس بات کو معیوب خیال کرتے تھے کہ مہمانوں کو گھر کے بجائے ہوٹل یا شادی ہال میں کھانا کھلایا جائے۔ تیسری وجہ سب سے دلچسپ تھی۔ پورا محلہ دفاتر سے چھٹی لے کر، دکانیں بند کر کے اور سارے کام چھوڑ کر پوری دل جمعی سے شادی میں شریک ہوتا تھا۔ لوگ اپنے گھروں اور دلوں کے دروازے مہمانوں کے لیے کشادہ رکھتے تھے۔ لڑکی کی شادی میں تو ہر شخص بڑھ چڑھ کر اپنا کردار ادا کرتا تھا۔ غالباً اسی لیے میرے اور بارات کے استقبال کے لیے پورا محلہ موجود تھا۔ بارات سے ایک رات قبل زور کا جھکڑ چلا، جم کر برکھا برسی اور تمام شامیانے زمیں بوس ہو گئے۔ اِس مسئلے کو تمام محلے نے ذاتی سمجھ لیا۔ محلے کے بزرگوں نے مسجد میں ہنگامی میٹنگ بلائی۔ سب سر جوڑ کر بیٹھے۔ آسمان پر چھائے بادلوں کے تیور دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ شامیانوں اور قناتوں کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا جائے اور پوری گلی اپنے ڈرائنگ رومز کو باراتیوں کے لیے وا کر دے۔ مجھے ایک بہت آراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ میرے دوست میرے ساتھ فروکش تھے جو مجھ سے زیادہ وی وی آئی پی پروٹوکول سے فیض یاب ہو رہے تھے۔

نکاح کا وقت آیا تو جیسے اچانک فضا میں تحرک آ گیا، جو جس جگہ تھا وہاں نہ رہا۔ ہر شخص میرے سر پر منڈلانے لگا۔ اس کشادہ ڈرائنگ روم کا دامن یک لخت ہی تنگ پڑ گیا۔ نکاح کا رجسٹر سامنے آیا تو دلہن کے دستخط پہلے سے ہی ثبت دکھائی دیے۔ میرے سسرال راولپنڈی کے محلہ عید گاہ میں رہائش پذیر تھے۔ وہاں کی بہت معروف روحانی شخصیت پیر محبوب الرحمن صاحب نے ضروری تلاوت کے بعد جب مجھ سے 'کیا آپ کو

قبول ہے؟' کے الفاظ میں استفسار کیا تو میں وہ نادان ثابت ہوا جو قیام کے وقت سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ گھبراہٹ کے عالم میں میرے منہ سے جو آواز نکلی وہ میرے لیے قطعاً غیر مانوس تھی۔ حاضرین میں سے کوئی نامعقول ذرا سے کھنکارا۔ ایک دو دھیمی دھیمی سی آوازیں آئیں، پھر ان آوازوں میں ذرا سی برکت پڑنے کی دیر تھی کہ سارا کمرہ قہقہوں کی گونج سے لرز اٹھا۔ پیر صاحب اور کچھ بزرگوں کی تنبیہہ نما مداخلت نے ماحول کو قدرے سنجیدہ کیا۔ پیر صاحب نے از سرِ نو اپنا سوال پوچھا۔ تمام منچلے ہونٹوں پر شرارتی مسکان سجائے پھر اسی صوتی کرشمے کے منتظر تھے جو پہلے ان کی تفننِ طبع کا باعث بنا تھا۔ اس بار میں نے حوصلے کا ایک بھرپور گھونٹ حلق کی عمیق گہرائیوں میں اتارا اور جی کڑا کر کے 'قبول ہے' کی صدا بے یقینی کی کیفیت میں باہر انڈیل دی۔ مبارک مبارک کے شور نے مجھے یقین دلایا کہ میں نے بالآخر معرکہ سر کر لیا ہے۔ دعا مکمل ہوئی تو میری پسلیوں کی آزمائش کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ باری باری لوگ مجھ سے خاصے جارحانہ طور پر بغل گیر ہو کر کمرے سے باہر جاتے اور دیگر حملہ آوروں کے لیے جگہ بناتے رہے۔ اس روز میں زندگی میں واحد بار بلا مبالغہ کم و بیش دو تین سو لوگوں کے جبری معانقے کا شکار ہوا۔ اس تمام تر جبر میں صرف ایک ہی خیر کا پہلو تھا کہ جو آتا وہ میرے ہاتھ میں ایک متمول لفافہ تھما دیتا جو کافی حد تک میری تالیفِ قلب کر دیتا۔ میرے پہلو میں بیٹھا میرا کزن سہیل نہایت سرعت سے میرے ہاتھ سے وہ لفافہ اچک لیتا اور اس کے مشمولات کا اندراج اپنی گود میں رکھی نوٹ بک میں کرنے کے بعد لفافہ اپنے ملبوس کی متنوع جیبوں میں ٹھونس لیتا۔

نکاح کے فوراً بعد کھانے کا غلغلہ بلند ہوا۔ میں نے صبح بھی اختلاجِ قلب کے باعث ناشتہ نہیں کیا تھا۔ نکاح کا کڑا مرحلہ گزر جانے کے بعد اب بھوک کا شدت سے احساس ہوا۔ مرغن کھانوں کی مختلف ڈشوں اور ان کی مہک نے بے طرح جی للچایا لیکن ہر شخص کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ دلہا کے وقار کا بھرم رکھنے کی خاطر مجھے یہاں بھی دل پر جبر کرنا پڑا۔ ہمیشہ کا پاڑا اعجاز اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور ایک چکن کے لیگ پیس کے ساتھ دو چمچ رکھ کر میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا لیکن وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا: 'دولہا بنے ہوئے اتنا کھانا ہڑپ کرتے ہوئے اچھے لگو گے؟ اپنی عزت کا بھی خیال رکھو اور ہماری بھی۔ چپ چاپ تھوڑا سا کھانا میری پلیٹ سے کھا لو۔ باقی کسر گھر پہنچ کر پوری کر لینا'۔ میں نے ایک اور غضب ناک گھرکی اس کی طرف اچھالی مگر اس کے ہونٹوں پر وہی سفاک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میز بان بار بار مجھے مختلف ڈشز کی پیشکش کر رہے تھے مگر میں ایک کربناک تبسم کے ساتھ ان سب سے جھوٹ بولتا رہا کہ میں سب کچھ کھا چکا ہوں اور مزید بھوک نہیں ہے۔ اعجاز مسلسل مسکراتا رہا۔ اس ستم ظریف کو اس سنگین جرم پر میں زندگی بھر معاف نہیں کر سکتا۔

میرے ننھیالی گاؤں ڈھوک مراد کی حویلی کے ایک حصے میں امی جی کی ایک چچی بھی مقیم تھیں، ان کا نام غلام فاطمہ تھا۔ ہم سب بچے ان کو چھوٹی بے بے جی کہا کرتے تھے۔ بڑی بے بے جی کا خطاب میری نانی جی کے لیے وقف تھا۔ چھوٹی بے بے جی عمر بھر بے اولاد رہیں اور اب اپنی بیوگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی ناآسودہ محبت ہمارے دامن میں ڈال دی تھی۔ سبھی بچے ان سے شفقت سمیٹتے۔ اس شفقت میں ان کے ہاتھوں کے بنے خستہ پراٹھے، بیسن کا حلوہ اور مرونڈا بھی شامل ہوتا۔ وہ سب بچوں کو بہت چاہتیں لیکن مجھ پر تو وہ اپنی محبت کی ساری پونجی لٹا دیتیں۔ فرطِ محبت میں میرا نام بگاڑتی رہتیں۔ سلمان کے بہت سے ہم قافیہ الفاظ ان کی زبان سے پھسلتے رہتے۔ 'مان' پر آ کر ان کو نسبتاً قرار آ گیا۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی خیر تھی لیکن ایک روز پیار میں اتنا وفور آیا کہ انھوں نے مجھے مانو بلی کا نام دے ڈالا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں میں نے شدید احتجاج کیا کیوں کہ سب بچوں کو بھی مجھے اس نام سے چھیڑنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ میرے احتجاج کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو میں نے روہانسا ہو کر امی جی سے شکایت کی۔ امی جی نے اپنے بائیں ہاتھ سے میری ٹھوڑی تھامے اور دائیں ہاتھ سے میرے گھنگریالے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا: 'وہ یہ سب پیار سے کہتی ہیں۔ کہہ لینے دو۔ ان کی مامتا کو تسکین مل جاتی ہے۔' میرے دل کو مامتا والی بات چھو گئی اور میں نے ان کے دیے گئے اس پیار بھرے نام کو قبول کر لیا۔ وہ بھی دنیا سے رخصت ہونے تک مجھے اسی نام سے بے دھڑک پکارتی رہیں۔

بارات کھانا کھا چکی تو رخصتی سے قبل کی رسومات کا مرحلہ آ پہنچا۔ اس کے لیے مجھے گھر کے اندر جا کر سب کے سامنے پیش ہونا تھا۔ میں خواتین کے جمگھٹے کے خیال سے نروس اور تیکھے جملوں کے اندیشے سے خوف زدہ تھا۔ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا چھوٹی بے بے جی دونوں بانہیں کھولے میری طرف لپکیں اور بلند آواز میں بولیں، 'میری مانو بلی آ گئی'۔ خواتین سے بھرے آنگن سے ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا اور میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے میں مکمل ناکام ہو گیا۔ جانے کس نے مجھے ہار پہنائے اور کس نے میرا ہاتھ تھام کر دلہن کے ساتھ والی نشست پر بٹھا دیا، مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میں ایک معمول کی طرح یہ سب کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد سنبھلا تو میں نے ذرا درست انداز میں بیٹھنے کی کوشش کی۔ اس اضطراری عمل کے دوران میرے بائیں بازو کی کہنی دلہن کے بازو سے جا ٹکرائی۔ یہ غیر فطری حرکت کچھ اتنی شدت سے ہوئی کہ خاموشی سے مسلسل زمین کو تکے جانے والی دلہن نے بھی درد بھری سسکاری بھری۔ نسوانی حلقے سے دوسری بار قہقہہ بلند ہوا اور میرے بچے کھچے حواس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ مختلف سمتوں سے جملے چست ہو رہے تھے۔ میری ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ ان جملوں کے نفسِ مضمون تک رسائی حاصل کر پاتا۔ یوں بھی مجھے یقین تھا کہ بولے جانے والے تمام جملے کچھ زیادہ مناسب نہیں تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھ تک راویوں کے ذریعے ہی پہنچا ہے کیوں کہ وہ سب وقوعے میرے

ذاتی حافظے میں تو بالکل محفوظ نہیں۔ لہٰذا دروغ برگردنِ راوی میں نے دودھ پلائی کی رسم خاصا خلجان بدست ہو کر انجام دی اور میکانکی انداز میں طلب کرنے پر کوٹ اور پینٹ کی سبھی جیبوں سے سارا مال منال اپنی سالیوں کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ میرے اوسان تب بحال ہوئے جب رخصتی کے لیے دلہن بھی اٹھ کر چل پڑی اور میں ہنوز اپنی نشست پر براجمان پایا گیا۔ رخصتی کی آہ و بکا نے مجھے عالم ہوش میں لا پٹخا اور میں لپک کر اپنی دلہن کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ سسکیوں اور آہوں نے فضا کو سوگوار کر دیا۔ میری رقیق القلبی بھی کہیں سے عود کر آئی۔ میں نے بڑی جدو جہد سے گلے میں ٹپکتے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ رخصتی کے آخری مرحلے پر جب روبینہ نے اپنے اباجی کے کاندھوں پر سر رکھ کر سسکی لی اور شدتِ جذبات سے نڈھال باپ نے تڑپ کر ایک ستون کی اوٹ میں اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کی تو بے اختیار سارے بند توڑ کر میری آنکھوں سے اشک بہہ نکلے۔

رخصتی کے بعد بارات واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو بیسویں صدی میں وقوع پذیر ہونے والی شادی کے باعث مجھے گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بٹھا دیا گیا جب کہ امی جی اور بھابھی پچھلی سیٹ پر دلہن کے دائیں بائیں مسند نشیں ہو گئیں۔ اب واپسی کے پورے سفر کے دوران میرے پاس اونگھنے، بار بار دیکھے ہوئے مناظر دیکھنے اور ڈرائیور سے کبھی کبھار واجب الادا جملوں کے تبادلے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ ایک جگہ مفرحات کے لیے مختصر پڑاؤ کیا لیکن وہاں بھی ہماری بیگم صاحبہ نے گاڑی سے اترنے میں تامل کا اظہار کیا۔ نتیجتاً گاڑی میں ہی مطلوبہ سامان کی ترسیل ہو گئی۔ میں بظاہر ٹانگیں سیدھی کرنے کی غرض سے گاڑی سے اترا۔ امی جی اور بھابھی سے بچ بچا کر ایک دزدیدہ نگاہ نوبیاہتا دلہن پر ڈالی لیکن موصوفہ کی نظریں تاحال حالتِ رکوع میں تھیں۔ میں واپس گاڑی میں بیٹھا اور وہ بے کیف سفر پھر سے جاری ہو گیا۔ راولپنڈی سے کھاریاں کینٹ پہنچے تو آفتاب بلاوجہ شرم سے گلال ہو رہا تھا۔ افق نے قرمزی چادر اوڑھ لی تھی۔ شام نے اپنی ملگجی زلفیں کھول دیں اور ذرا سی دیر میں آسمان نے بھی اپنی نیلگوں قبا میں نقرئی موتی ٹانکنے شروع کر دیے۔

گاڑی آئی جے کالونی میں واقع ہمارے گھر کے گیٹ سے داخل ہوئی تو ہماری قدیمی اور خاندانی ملازمہ فاطمہ شادی کے روایتی گیت گنگناتی ہوئی استقبال کو بڑھی۔ فاطمہ کو اس کے اصل نام سے اب صرف امی جی اور اباجی ہی بلاتے تھے۔ جب سے میرے بھتیجے ارسلان نے اپنی توتلی زبان میں سے اسے پھاپاں کہہ کر پکارنا شروع کیا تب سے وہ باقی سارے گھر کے لیے پھاپاں ہو گئی۔ اس کو خود بھی یہ نام اتنا پسند آیا کہ وہ امی جی کے کہنے کے باوجود پھاپاں کہلوانے پر مصر رہی۔ ہمارا ڈرائیور گاڑی کو کسی بگٹٹ دوڑتے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھگاتا آیا تھا سو ساری بارات کافی پیچھے تھی اور ہم تمام تر شتابی کے ساتھ گھر پہنچ چکے تھے۔ امی جی اور بھابھی روبینہ کو لے کر گھر کے اندر چلی گئیں۔ میں بے وقوفوں کی طرح اپنی جگہ پر منجمد تھا۔ میں نے ایک اضطراری کیفیت میں

ڈرائیور کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف بخشش طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظریں پڑھتے ہوئے اس تحریر کو کچھ رقم سے روشن کیا تو چمک اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔ میں گاڑی سے اترا اور جلدی سے اپنے کمرے کی جانب لپکا۔ اپریل کی انیس تاریخ کو تمام دن تھری پیس سوٹ میں ملبوس رہنے کے بعد میں گرمی سے بے حال ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً سوٹ اتارا۔ ٹائی دور پھینکی، جوتوں اور جرابوں سے خود کو آزاد کیا۔ ایک فرحت بخش شاور لیا اور ہلکے پھلکے کپڑوں کے نیچے نرم سلیپرز پہن کر باہر نکل آیا۔ اب میں پھر سے ایک دن کے وی آئی پی سے عام آدمی بن چکا تھا اور اس تبدیلی پر بہت مسرور تھا۔ یہ الگ بات کہ میری بیگم کو مجھ سے آج تک گلہ ہے۔ اس کا تصور یہ تھا کہ میں سوٹ میں ملبوس اور بوٹوں کی بھاری بھرکم آواز کے ساتھ وحید مراد کی طرح آ کر گھونگٹ اٹھاتا جب کہ میں اس کے تصور کے برعکس جوتیاں چٹخاتا ہوا حجلۂ عروسی میں آ گھسا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت وحید مراد نہ بن سکنے کے قلق سے کہیں زیادہ سوٹ اور ٹائی سے آزاد ہونے کی خوشی تھی۔

ولیمے والا دن خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ ولیمے کی دعوت کے لیے ہمارے گھر کے سامنے والے وسیع لان میں شامیانے اور قناتیں نصب تھیں۔ بارات کے روز میں نے کھانے کی جس لذت کو دلہا ہونے کے باعث تکلف اور رکھ رکھاؤ کی نذر کر دیا تھا، اس سے ولیمے والے دن کماحقہ فیض یاب ہوا۔ دور و نزدیک کے رشتہ دار، ابا جی کا سٹاف، بھائی جان کے دوست اور کھاریاں کینٹ و شہر سے لوگوں کی بڑی تعداد شامل تھی۔ ان سب میں پشاور سے میرے کچھ کولیگ بھی تھے اور متجسس نظروں سے میری جانب دیکھتے میرے قریبی دوست بھی۔ جیسے ہی ذرا سی تنہائی میسر آتی، میرے دوست میرے قریب کھسکنے لگتے اور میں ارادتاً کسی اور مہمان کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ میں ان کی بے قراری کی وجہ جانتا تھا اور ان کی اس کیفیت سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مکمل کورا اور سر تاپا کنوارا اعجاز ہمیشہ کی طرح پاؤ ابن کر مجھے نصیحتیں کر تا رہا تھا۔ نئی نویلی دلہن سے کس طرح بات کرنی ہے، اس پر کیسے مثبت تاثر چھوڑنا ہے، آغاز میں کیا کہنا ہے۔ یہ سب فروعی باتیں وہ شادی والے دن سے بہت پہلے میرے اس پلے باندھ چکا تھا جس میں قدرتی طور پر بہت سے چھید تھے۔ جب اس کا وعظ زیادہ ہی طول پکڑ جاتا تو میں چڑ جاتا۔ میں اسے مختلف غیر مناسب کلمات سے نوازتا مگر وہ کشتۂ محبت و خلوص میری بات کی کاٹ اور لہجے کی تلخی کا برا ماننے کے بجائے اپنے لہجے کو مزید نرم کر لیتا۔ دیکھو یار میں یہ سب اس لیے کہتا ہوں تاکہ تمھیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ پریشان ہونا ان دنوں میرے لیے ایک غیر مانوس شے تھی۔ میں سر جھٹکتا اور گفتگو کا رخ موڑنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگتا مگر ڈھاک کے پات تین ہی رہتے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ولیمے والی صبح دوسرے دوستوں کے برعکس اعجاز نہ تو مجھ سے کچھ پوچھنے کو بے چین تھا اور نہ ہی میرے قریب پھٹکنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ شاید اسے اپنے پند ونصائح کے فیوض و برکات اور ان کی سرخروئی کا کامل یقین تھا۔ او کاڑہ سے بھا امین، ماتھے پر عمودی سطح سے گرتی اپنے سیاہ بالوں کی لٹوں، شرارتی آنکھوں اور زندگی سے بھرپور قہقہوں سمیت موجود تھا۔ جھینپتی ہوئی شرمیلی مسکراہٹ والا شیخ ضیا، شوخ اور بلا کا جملہ باز افتخار، رومان پرور اور کیف آگیں گفتگو کا ماہر ظاہر شاہ، زندہ دل عطاالرحمن، چھیڑنے سے چھڑ جانے والا ادریس اور وہ سب دوست موجود تھے جو میرے دل کے قریب تھے۔ کچھ دوست معاشرتی یا معاشی جبر کے باعث شریک نہ ہو سکے۔

ولیمے سے اگلے روز ہم رسم دنیا نبھاتے ہوئے روبینہ کے میکے جانے کے لیے راولپنڈی روانہ ہوئے۔ برات سے واپسی پر مجھے گاڑی کی اگلی نشست اور میری نوبیاہتا بیگم کو پچھلی نشست پر بٹھانے والوں نے اس بار کمال فیاضی سے ہمیں ایک ساتھ بٹھا دیا۔ اسی گاڑی میں روبینہ کی امی اور میری خالہ بھی بیٹھی تھیں جو سفر کے دوران ہم سے محوِگفتگو بھی تھیں۔ ہم اگرچہ کھاریاں سے رخصت ہوئے تو دن خاصا چڑھ چکا تھا مگر ہمارے رت جگوں نے ہم سے جو نیند چھین رکھی تھی اسے شاید اسی آن حملہ آور ہونا تھا۔ میں تو کسی حد تک نیند سے لڑنے کی سکت رکھتا تھا اور پورے دیدے کھول کر خالہ جی کے ساتھ ہم کلام ہو رہا تھا لیکن نیند کے سامنے بڑی ہی سہولت سے ہتھیار ڈال دینے والی روبینہ کب کی پسپا ہو چکی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ نیند میں جھولتے ہوئے بار بار اس کا سر میرے کاندھے پر آ ٹکتا۔ ویسے تو میری منکوحہ کا میرے کاندھے پر سر رکھنے میں ہرگز کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن تب مشرقی روایات نے ابھی کمندیں اتنی بلندی پر نہیں پھینکی تھیں۔ خالہ جی کی موجودگی میں روبینہ کے نیند کے ہاتھوں مجبور ہو کر بار بار میرے کندھے پر سر رکھنے سے میں بری طرح جھینپ رہا تھا۔ کئی بار میں نے روبینہ کو اپنی کہنی کی مدد سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ وہ کہنی کی ہلکی سی ضرب سے جاگتی اور فوراً سمٹ کر بیٹھ جاتی مگر نیند کی یورش کے سامنے ڈھال بننے کی سکت اس میں تب تھی نہ اب ہے۔ جب یہ غیر معمولی معمول، سفر کے معمولات میں شامل ہو گیا تو میں نے اپنے مستنصر حسین تارڑ صاحب کے یورپ کے سفرناموں میں ایسے ہی رومان پرور اذ کار کو یاد کر کے اپنی صورتِ حال سے لطف لینا شروع کر دیا۔ روبینہ نے بہرحال راولپنڈی پہنچ کر ہی بیداری کی زحمت کی۔

روایتی شرم، تیئیس برس کی عمر میں ہونے والی شادی اور کچھ فطری حجاب جیسے عوامل کے باعث بہت سے ایسے دلچسپ حادثات بھی ہوئے جنھیں یاد کر کے اب ہونٹوں پر خفیف سا خم آنے لگتا ہے۔ ان دنوں تقریباً ہر نیا شادی شدہ جوڑا ہنی مون کے لیے مری کے چرن چھوا کرتا تھا۔ یوں بھی ہمارے خیر اندیش والدین کی محتاط طبیعتوں نے ہمیں اس سے زیادہ دور کسی مقام تک جانے کی اجازت بھی عطا نہیں کی تھی۔ میں اس سے قبل دوستوں کے ہمراہ کئی بار مری جا چکا تھا لیکن اپنی 'نالائقی' کے باعث کسی لڑکی کے ساتھ جانے کا کوئی تجربہ نہ تھا

لہٰذا میں مری کا سفر اختیار کرنے سے قبل ہی خاصا مضطرب تھا۔ ہم راولپنڈی سے وین کے ذریعہ مری پہنچے تو میرا اضطراب عروج پر تھا۔ وین سٹاپ پر مختلف ہوٹلوں کے کارندے مسافروں کو اپنے اپنے ہوٹلوں کے جملہ فضائل بتا کر انھیں اپنے ہاں قیام پر مائل کر رہے تھے۔ میری حد سے بڑھی ہوئی بے چینی نے زیادہ کارندوں کو یہ زحمت ہی نہ دی۔ جو پہلا شخص ہماری طرف لپکا میں نے اسے اپنا بیگ تھما دیا۔ وہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہماری قیادت کرنے لگا۔ میں نے ہمیشہ مری پہنچنے کے بعد اسے معروفِ زمانہ مال روڈ سے ہی دیکھنا شروع کیا تھا۔ یہ شخص ہمیں کسی اور ہی راستے سے ہوٹل تک پہنچا رہا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہوٹل تک پہنچنے کے لیے ایک سڑک بھی موجود ہے لیکن وہ ہمیں ایک مختصر راستے سے ہوٹل لے جا رہا ہے۔ اس دوران وہ خالص پہاڑی لہجے میں میرا انٹرویو بھی کرتا جا رہا تھا۔ 'کتھوں آئے او؟'۔ (آپ کہاں سے آئے ہیں)۔ 'کرکھسو؟'۔ (اس کے بعد کہاں جائیں گے؟) میں نے اس کے سوالات کے اتنے مختصر جوابات دیے کہ اسے اپنے انٹرویو سے میری بیزاری کا احساس ہو گیا۔ اونچے نیچے راستوں سے ہوتا ہوا وہ بالآخر ہمیں ہوٹل تک لے گیا۔ ہوٹل کی تعمیر نئی تھی۔ خوش قسمتی سے کمرے آرام دہ اور آراستہ تھے اگرچہ میں نے اپنی بے کلی کے باعث ہوٹل کے بارے میں کسی قسم کی تفصیل پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ ہم نے کچھ وقت کمرے میں گزار کر مال روڈ کی سیر کا قصد کیا۔ دشواری یہ تھی کہ اس نامعلوم مقام سے مجھے مال تک کا راستہ معلوم نہ تھا۔ ہوٹل والوں نے ایک اور نوجوان کو ہمیں مال تک پہنچانے کا فریضہ سونپا۔ ہم نے ہوٹل والوں کو رات کے کھانے کے لیے اپنی پسند بتائی اور مال کی طرف چل پڑے۔ اس مردِ کہستانی نے بھی فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کا ارادہ کرتے ہوئے ہموار سڑک کے بجائے اونچے نیچے پہاڑی راستے سے ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچایا۔ ہم نے مال کو شروع سے آخر تک ناپنا شروع کیا۔ بارہا دیکھے ہوئے مناظر کو پھر سے دیکھا۔ کافی پی۔ تصویریں بنائیں اور کچھ ضروری وغیر ضروری شاپنگ کی۔ ہم نے سارے وہی روایتی کام کیے جو مری آنے والا ہر شخص کرتا ہے۔ تب تک شام ہو چکی تھی۔ یک دم تیز بارش شروع ہو گئی۔ کچھ دیر تک ہم نے ایک جگہ پناہ لی لیکن بارش کے رکنے کے ہرگز کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اسی دوران بجلی چلی گئی اور سارا ماحول گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ بارش کے باعث خنکی بھی بڑھ رہی تھی۔ مجھے یہ فکر ستا رہی تھی کہ ہم نے واپس ہوٹل پہنچنا ہے جہاں کے راستے کا مجھے فقط موہوم سا اندازہ تھا۔ میں نے اپنے اسی اندازے کے سہارے ٹامک ٹوئیاں مارنی شروع کیں۔ ایک گیسٹ ہاؤس کی عمارت کے آخر میں مجھے گمان سا ہوا کہ یہیں سے ہمارے ہوٹل کا وہ اونچا نیچا راستہ نیچے اترتا ہے جس کے ذریعے ہم دن کے اجالے میں یہاں تک آئے تھے۔ نیچے گہرا اندھیرا تھا اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اردگرد مکمل خاموشی اور ویرانی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر وہیں سے نیچے اترنے کا ارادہ کیا۔ مردانگی کا مظاہرہ

کرتے ہوئے روبینہ کا ہاتھ تھاما اور پہلے خود نیچے قدم رکھنے کے لیے بڑھایا۔ میرا پاؤں ابھی اٹھا ہی تھا کہ ٹارچ کی تیز روشنی ہم پر پڑی اور کوئی گرجدار آواز میں بولا ’ٹھہرو‘۔ میں نے اٹھا ہوا قدم واپس رکھ لیا اور روشنی کی طرف دیکھنے لگا۔ کوئی شخص بھاری بوٹوں کی دھمک کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ رین کوٹ میں ملبوس وہ شخص ہمارے پاس پہنچا تو اندازہ ہوا کہ وہ اس گیسٹ ہاؤس کا چوکیدار تھا۔ اس نے آتے ہی ہم سے استفسار کیا کہ ہم کہاں جانا چاہ رہے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم اس راستے سے اپنے ہوٹل جانا چاہ رہے تھے۔ اس نے جواب میں ٹارچ کی تیز روشنی نیچے ڈالی تو ہماری سانسیں جیسے رک گئیں اور منہ کھلے رہ گئے۔ نیچے گہری کھائی تھی۔ ایک بھی قدم بڑھانے کا مطلب سیدھا موت کی گود میں جا اترنا تھا۔ میرا آج تک ایمان ہے کہ اللہ نے اس ویرانی، تاریکی اور خاموشی میں اس چوکیدار کی صورت میں کوئی فرشتہ بھیجا تھا۔ چوکیدار عمر رسیدہ شخص تھا۔ وہ ہمیں گیسٹ ہاؤس کے ریسپشن میں لے گیا۔ ہمیں بٹھایا اور ریسپشن پر موجود لوگوں کو چند ثانیے پہلے ہماری خودکشی کی مجوزہ ’کوشش‘ کے بارے میں آگاہ کیا۔ عملے نے ہم سے ہوٹل کا نام پوچھا۔ اس نو تعمیر شدہ ہوٹل سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ ان بھلے لوگوں نے کئی جگہ فون کر کے ہمارے ہوٹل کے بارے میں پوچھا مگر کہیں سے مذکورہ ہوٹل کا پتہ نہ چل سکا۔ اب میں سچ مچ اس سارے واقعے کی طلسماتی حیثیت کے باعث اس میں کسی آسیب کا عمل دخل محسوس کرنے لگا تھا۔ پریشانی بھی دوچند ہو رہی تھی۔ اسی اثنا میں گیسٹ ہاؤس کی لانڈری میں کام کرنے والا ایک آدمی وہاں آ پہنچا۔ اس سے بھی یہی سوال داغا گیا۔ اس نے کچھ دیر سر کھجانے کے بعد اس ہوٹل کو جاننے کی خوش کن اطلاع دی۔ اس نیک دل انسان نے ازخود ہمیں ہمارے ہوٹل تک پہنچانے کی ذمہ داری لے لی۔ برستی بارش میں وہ ہمیں مختلف راستوں سے گزارتا ہوا آخرکار ہوٹل پہنچا کر ہی پلٹا۔ میں نے تشکر آمیز آنکھوں کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور ہمیں نئی زندگی بخشنے والے قادرِ مطلق کا شکر ادا کیا۔ مری کو اب تک روایتی انداز میں دیکھنے کے بعد ہم ایک ایسے غیر روایتی تجربے سے بھی گزر چکے تھے جسے فراموش کرنا شاید کبھی ممکن نہ ہو۔

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو میری چھٹی بھی تمام ہو گئی۔ مجھے نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر واپس پشاور جانا تھا۔ تب نہ تو تیز رفتار اور آرام دہ ٹرانسپورٹ میسر تھی اور نہ ہی ہموار اور کشادہ موٹر وے موجود تھی۔ دستیاب ذرائع میں سے جی ٹی ایس سروس پشاور کی سلیٹی رنگت کی بسیں سب سے بہتر تھیں۔ یہ بسیں راستے میں کم کم ہی رکتیں اور عموماً وقتِ مقررہ پر منزلِ مقصود پر پہنچا دیا کرتیں۔ صرف یہ ہوتا کہ عام طور پر پٹھان ڈرائیور اور کنڈکٹر سواری کی طرف نگاہِ التفات کی بجائے خشونت بھری نظر ڈالتے اور کرخت لہجے میں خوش آمدید کہتے۔ کھاریاں کینٹ سے پشاور کا سفر نسبتاً طویل تھا۔ واپسی کا سفر یوں بھی ہمیشہ طویل ہی ہوتا ہے۔ میں علی الصبح کھاریاں کینٹ بس سٹاپ سے پشاور جی ٹی ایس پر بیٹھا۔ راستے میں بارہا دیکھے ہوئے مناظر کو بے دلی کے ساتھ دیکھتا اور اونگھتا رہا۔ بالآخر

اس بے کیف سفر کا خاتمہ ہوا اور بس پشاور صدر کے اڈے پر پہنچ گئی۔ کالج پہنچا تو میرے کولیگز نے اس نوعمری میں مشرف بہ شادی ہونے پر مبارک دی۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو عمر میں تو مجھ سے کہیں بڑے تھے لیکن ہنوز اس تجربے سے دور تھے جس سے میں تازہ تازہ گزرا تھا۔ میں لجاتے ہوئے سب سے مبارک باد وصول کر چکا تو سب نے یک زبان ہو کر مجھ سے فوری طور پر دعوتِ ولیمہ کے انتظام کے لیے کہا۔ اس نیک کام میں دیر کرنا کسی ایک بھی اللہ کے بندے کو گوارا نہ تھا سو مجھے صرف رقم ادا کرنے کی زحمت دی گئی۔ باقی تمام فرائض دیگر احباب نے غیر معمولی خوش اسلوبی سے نہایت مستعدی سے انجام دیے۔

کالج میں تعلیمی سیشن مکمل ہو چکا تھا اور کسی طالب علم کی شکل نظر آنا تو درکنار اس کا اشتباہ بھی نہ ہوتا تھا۔ پرنسپل، اساتذہ، کلرک اور ملازمین بہر حال کیمپس میں گھومتے پھرتے نظر آجاتے تھے۔ اساتذہ بھی دن کے کچھ حصے کے لیے نظر آتے اور بسا اوقات وہ سرسری حاضری بھی غیر ضروری خیال کر لی جاتی۔ اگر مجبوری کی بنا پر کالج میں رکنا بھی پڑ جاتا تو سٹاف روم میں چائے کے ساتھ لوازمات کے طور پر گپ شپ چلتی رہتی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہرین تعلیم کی یہ گپ شپ عموماً کسی بھی قسم کی علمی گفتگو سے یکسر پاک ہوتی۔ یا تو ملکی سیاست زیرِ بحث آتی یا لطائف سنائے جاتے۔ جو وقت بچ جاتا وہ پرنسپل اور حکام بالا کو رگیدنے میں صرف ہوتا۔ مجھے یہ سب کچھ بھی کارِ عبث محسوس ہوتا اور اپنا آپ بھی بے مصرف دکھائی دیتا۔ سیشن کے اختتام کے باعث میں نے کالج جائن کرنے سے اب تک ایک بھی کلاس نہیں لی تھی البتہ ہر مہینے کے آخر میں میرے اکاؤنٹ میں تنخواہ ضرور منتقل ہو جاتی۔ یہ مفت خوری مجھے بہت کھل رہی تھی۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا لیکن میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا رہتا۔ میرا دل یوں بھی اب پشاور میں نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے ویک اینڈ کا انتظار رہتا۔ جمعرات کی دوپہر میں بس پر بیٹھتا اور ہفتے کی صبح بوجھل دل کے ساتھ واپس پشاور پہنچ جاتا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں اور میں نے سکھ کا سانس لیا۔

گرمیوں کی تمام چھٹیاں میں نے ڈٹ کر گھر پہ گزاریں۔ کھاریاں کینٹ کی خوش رو فضا میں کھلے پھولوں، مہکتی ہواؤں اور منظم زندگی کے سانچوں کے ہمراہ یہ دن پہلے سے کہیں زیادہ رنگین گزرے۔ نوبیاہتا جوڑے نے شدید گرمی کے باوجود اس وقت کو ایک مکمل ہنی مون کی صورت گزارا۔ گھومنا، حسنِ فطرت کے نظارے کرنا اور کھاریاں کے ساتھ ساتھ جہلم، گجرات اور اطراف کے دیگر علاقوں کے ہر ریستوران پر لذتِ کام و دہن سے آشنا ہونا ہمارا دستور بنا رہا۔ افتخار جنجوعہ کالونی میں ہمارے گھر کے قریب ایک بیکری تھی جہاں سے ہم عموماً ناشتے کا سامان خریدا کرتے تھے۔ یہ خریداری میری ہی ذمہ داری تھی۔ مجھے انڈا ہمیشہ سے بہت مرغوب رہا ہے۔ فرائی، آملیٹ، میٹھا آملیٹ، سپینش آملیٹ، بوائلڈ بلکہ اپنی ہر معلوم شکل میں انڈا میری پسند رہا ہے اور

آج تک ہے۔ میں انڈا خریدتے ہوئے ہمیشہ اس بات کا خاص خیال رکھتا کہ اس کا سائز ہر ممکن حد تک بڑا ہونا چاہیے۔ ایک روز میں مذکورہ بیکری سے نسبتاً بڑے سائز کے انڈے لایا۔ جب ناشتہ بنانے کے لیے روبینہ نے پہلا انڈا فرائی کرنے کے لیے گرم پین میں انڈیلا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ گرم پین میں ابلتے ہوئے آئل میں ایک ہی انڈے کی دو زردیاں تیر رہی تھیں۔ دوسرا انڈا توڑا گیا تو وہ بھی ویسا ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ ہماری خوشی دو چند ہوگئی۔ ہماری آتش شوق بھڑک چکی تھی۔ ہم نے دو مزید انڈے توڑے اور چار زردیوں والے ان دو انڈوں کا آملیٹ تیار کیا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات تھی۔ جانے اس سے قبل اور بعد میں کتنی ہی بار اللہ نے انواع و اقسام کے ناشتے عطا کیے ہیں لیکن اس روز کے ناشتے والی خوشی کبھی محسوس نہ ہوئی۔ اس کے بعد میں نے بیکری والے کو بڑے اہتمام اور تاکید سے ہدایت کی کہ ہمارے لیے روزانہ دو زردیوں والے انڈے محفوظ کر لیا کرے۔ کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر ہماری خوشی کو کسی انڈا دشمن کی نظر لگ گئی اور بیکری والے کو ان انڈوں کی دستیابی رک گئی۔ یوں بھی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اور ہمارا خود اختیار کردہ ہنی مون بھی اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔

میں واپس پشاور پہنچا تو پہلے سے اکتایا ہوا دل مزید اکتا چکا تھا۔ مجھے ہر آن اندر سے کوئی یہاں سے کوچ کرنے کے لیے کہتا۔ چند روز تک تو میں نے اس صدا پر کان نہ دھرنے کی پوری کوشش کی لیکن یہ صدا بلند ہوتی گئی۔ بالآخر ایک روز میں نے تین حروف کو دو سے ضرب دی اور ملی ہوئی نوکری پر بھیج کر گھر واپس پہنچ گیا۔

☆☆☆☆

راجہ عبدالقیوم
پاکستان

مِنسک مِنسک مِنسک

جون ۲۰۱۰ میں ماسکو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ماسکو کے پاکستانی سفارتخانے کے ذمہ بیلاروس کے ساتھ سفارت کاری کی اضافی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ یک نہ شد دو شد۔ روس کے ساتھ بیلاروس، ماسکو کے ساتھ منسک۔ سچ پوچھیے تو اس اطلاع سے مسرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی ہوئی۔ یوں کہہ لیجیے کہ مسرت ملی پریشانی یا پریشانی ملی مسرت ہوئی۔ مسرت یوں کہ یورپ کا ایک اور پلا پوسا ملک دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے گا اور پریشانی یوں کہ ۱۹۹۱ کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد بھی دنیا کا رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک روس کیا کم تھا کہ ساتھ ایک اور اچھے خاصے بڑے اور زرعی اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملک بیلاروس کا بوجھ بھی اسی سفارت خانے پر ڈال دیا گیا مگر سچ پوچھیے تو یہ بوجھ۔۔۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے کے مصداق تھا۔ سال ۲۰۱۱ میں تو یہ ملحقہ بوجھ ضمیر پر بھی محسوس ہونے لگا کہ منسک کے ساتھ نامہ و پیام کا کوئی سلسلہ ہی دراز نہ تھا۔ دراز تو کیا سرے سے تھا ہی نہیں۔ اپنا بچپن اور لڑکپن یاد آتا تو لگتا کہ پاکستان میں ستر (۷۰) اور اسی (۸۰) کی دھائی میں بیلاروس تو روس سے زیادہ جانا اور پہچانا جاتا تھا اور یہ سب بیلاروس کے ٹریکٹروں اور دوسرے زرعی آلات کی وجہ سے تھا جو پاکستان کے کھیتوں اور کھلیانوں میں نظر آنے والا عام نظارہ تھا۔ بیلاروس جو ۱۷۹۳ سے لے کر سوویت روس کی شکست و ریخت تک روس کا باقاعدہ حصہ تھا۔ پاکستان میں ایک علیحدہ ملک کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ اس ملک سے راقم کا سرکاری تعارف ایک اتفاق بلکہ حسنِ اتفاق کا مرہون منت تھا۔ ہوا یوں کہ افسرِ تعلقات عامہ کے طور پر وزارتِ خوراک و زراعت میں کام کرتے ہوئے ایک روز بیلاروس سے آئے ایک بہت بڑے وزارتی وفد کے ہمارے وزیرِ خوراک و زراعت کے ساتھ مذاکرت کی نشست میں وزیر موصوف دوسری مصروفیات کی وجہ سے تاخیر سے پہنچے۔ یوں سیکریٹری خوراک و زراعت جناب ظفر الطاف صاحب، جن کے پائے کے افسر پاکستان کی بیوروکریسی میں کم کم ہی ہونگے، میں نے تو اپنی سروس کے دوران اتنا پڑھا لکھا، غیر روایتی اور با اصول افسر ایک بھی نہیں دیکھا (نوکر شاہی سے معذرت کے ساتھ کہ شائد یہ میری نظر کا قصور ہو)، نے مہمان وفد سے گفت و شنید کا آغاز کیا۔ بقول غالب

پھر دیکھنا اندازِ گل افشانیٔ گفتار

بات خوراک وزراعت سے کہیں دور باہر نکل گئی۔معلوم ہوا کہ وفد کے ۷ ۲ اراکین میں سے ۷ ا کے
پاس ڈاکٹریٹ کی اسناد تھیں۔ایک وزیر بوجھ۔۔۔ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے، کے مصداق تھا۔سال ۲۰۱۱ میں تو
یہ ملحقہ بوجھ ضمیر پر بھی محسوس ہونے لگا کہ منسک کے ساتھ نامہ و پیام کا کوئی سلسلہ ہی دراز نہ تھا۔دراز تو کیا سرے
سے تھا ہی نہیں۔اپنا بچپن اور لڑکپن یاد آتا تو لگتا کہ پاکستان میں ستر (۷۰) اور اسی (۸۰) کی دھائی میں
بیلا روس تو روس سے زیادہ جانا اور پہچانا جاتا تھا اور یہ سب بیلا روس کے ٹریکٹروں اور دوسرے زرعی آلات کی
وجہ سے تھا جو پاکستان کے کھیتوں اور کھلیانوں میں نظر آنے والا عام نظارہ تھا۔بیلا روس جو ۱۷۹۳ سے لے کر
سوویت روس کی شکست وریخت تک روس کا باقاعدہ حصہ تھا۔پاکستان میں ایک علیحدہ ملک کی طرح محسوس ہوتا
تھا۔اس ملک سے راقم کا سرکاری تعارف ایک اتفاق بلکہ حسنِ اتفاق کا مرہون منت تھا۔ہوا یوں کہ
افسرِ تعلقات عامہ کے طور پر وزارتِ خوراک وزراعت میں کام کرتے ہوئے ایک روز بیلا روس سے آئے ایک
بہت بڑے وزارتی وفد کے ہمارے وزیرِ خوراک وزراعت کے ساتھ مذاکرت کی نشست میں وزیرِ موصوف
دوسری مصروفیات کی وجہ سے تاخیر سے پہنچے۔یوں سیکریٹری خوراک وزراعت جناب ظفر الطاف صاحب، جن
کے پائے کے افسر پاکستان کی بیوروکریسی میں کم کم ہی ہونگے، میں نے تو اپنی سروس کے دوران اتنا پڑھا لکھا
،غیر روایتی اور بااصول افسر ایک بھی نہیں دیکھا (نوکر شاہی سے معذرت کے ساتھ کہ شائد یہ میری نظر کا قصور
ہو)، نے مہمان وفد سے گنت وشنید کا آغاز کیا۔بقول غالب

پھر دیکھنا اندازِ گل افشانیء گفتار

بات خوراک وزراعت سے کہیں دور باہر نکل گئی۔معلوم ہوا کہ وفد کے ۷ ۲ اراکین میں سے ۷ ا کے
پاس ڈاکٹریٹ کی اسناد تھیں۔ایک وزیر تو سوویت یونین کی کیمونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو کے ممبر رہے تھے
اور اسٹالن اور ٹراٹسکی کے دور کو قریب سے دیکھا تھا۔یہ سال ۱۹۹۸ کی بات ہے۔گفتگو تو پوری کی پوری یادداشت
میں اب بھی تروتازہ ہے۔ادب، سیاست، معیشت، معاشیات، سائنس، آرٹس، کرافٹس کون سا موضوع ہوگا کہ جس
پر حکمت اور دانائی کے گنج ہائے گراں مایہ ارزاں نہ کئے گئے۔ڈاکٹر ظفر الطاف کے ذہانت اور حکمت سے مزین
سوالات نے مہمان وفد کو حیران کر دیا۔وزیرِ موصوف کی آمد سے پہلے پیش از مذاکرات یہ گفتگو میرے ذہن پر
تب سے ثبت تھی۔

ابھی دونوں جانب مکمل سکوت کا عالم تھا سوچا کہ کیوں نہ خاموشی کی جھیل میں کوئی کنکر پھینکا جائے کہ
ارتعاش پیدا ہو! سلسلہ جانبانی تو شروع کیا جائے۔وہاں کے میڈیا پر نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ وہاں تو اچھا خاصا

ترقی یافتہ میڈیا موجود ہے اور بیلاروس کی فلم انڈسٹری تو بہت ترقی یافتہ ہے اور وہاں کی کئی ایک فلمیں تو آسکر ایوارڈ تک جیت چکی ہیں ۔ چناں چہ بیلا روس سے رابطہ کرنے کی سوجھی ۔ خط وخطابت سے معلوم ہوا کہ وہاں تو 'چشم ماروشن دلِ ماشاد' والی کیفیت تھی ۔ چناں چہ یوں پہلے سفر منسک کی صورت بنی ۔

ہم بیلا روس کی سب سی بڑی **نیوز ایجنسی بیلٹا** کی دعوت پر منسک گئے تھے ۔اس خبر رساں ادارے کے اربابِ بست وکشاد نے ہمیں وہاں موجود اخبار رساں اداروں، اخبارات، ٹی وی چینلوں ،فلم کمپنیوں اور اشتہار بنانے والی کمپنیوں اور میڈیا میں وہاں کی بڑی بڑی بڑی نیوز ایجنسیوں کے اہم اراکین سے ملوایا ۔ پاکستان کے ساتھ ان شعبوں میں قریبی تعاون کے فروغ کی ضرورت کا احساس ہر کسی کو تھا ۔

☆☆☆

افسانہ: ہیڈن ٹیلر
ترجمہ: نسیم سید

مصنوعی ذہانت

یہ قریب سہ پہر کا وقت تھا جب اچانک کمپیوٹر سائنس وژن کا دروازہ کھلا اور ایک لمبا اور قدرے فربہ جسامت کا آدمی، جلدی میں اندر داخل ہوا۔ یہ پروفیسر مارک کنگ تھے جو آج پھر اپنی چابیاں بھول گئے تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والوں میں سے بہت سے ساتھیوں نے انھیں معمول کے مطابق کمرے، پھر داخلی راہداری سے ہوتے ہوئے مرکزی دروازے سے بلڈنگ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا جس کی دیوار پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا Future Vision۔

مسٹر کنگ کے لیے یہ آئے دن کا معمول تھا کہ وہ سرعت سے آفس بند کر کے باہر کی طرف دوڑ لگاتے پھر اسی تیزی سے واپس آ کے آفس میں دس پندرہ منٹ گم رہتے۔ آج بھی وہ کمرے کی تمام چیزوں کو الٹ پلٹ کے آفس کو کباڑ خانے میں تبدیل کیے سوچ میں گم تھے کہ چابیاں گئیں تو کہاں گئیں؟ انھیں آج پہلی بار کچھ خفت ہو رہی تھی کہ اب یہ واقعہ ہر دوسرے تیسرے دن کے معمول میں بدل گیا تھا۔ کل بھی وہ خفت بھری مسکراہٹ سے چابیاں مٹھی میں دبائے واپس لمبے لمبے ڈگ بھرتے بلڈنگ سے نکلے تھے۔ سیکورٹی والے ہمیشہ مسکراتے رہتے، کیوں کہ انھیں پتہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے، خیر۔۔۔۔۔ اس سب سے قطع نظر مسٹر کنگ کی چابیاں ابھی بھی لاپتہ تھیں۔

'کس جہنم میں پھینک دیں؟' انھوں نے جھنجھلا کے اپنے آپ سے کہا۔

پروفیسر کنگ کمرے کے درمیان میں رکے، آنکھیں بند کریں، لیب میں گزرے پورے دن کا جائزہ لیا، ایک ایک کر کے ساری وہ جگہیں اپنے دماغ سے نکالیں جہاں وہ پہلے ہی اپنی چابیاں ڈھونڈ چکے تھے۔ اچانک اندھیرے میں روشنی کا جھما کا سا ہوا۔ وہ تقریباً چلائے: '**MATRIX ROOM**'۔ اس کمرے کو میٹرکس روم اس لیے کہا جاتا تھا کہ لیب میں سب سے اہم ٹیکنالوجی کے ساتھ مصنوعی ذہانت پر کام ہو رہا تھا۔ آج دن ختم ہونے سے تھوڑا پہلے، کنگ نے الگورتھم کو میموری کیس میں ڈالا تھا اور پھر اپنے ساتھیوں سے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ یہ میں نے ایسے ہی اندھیرے میں تیر چلایا ہے۔

کنگ کا زیادہ تر کام بد دلی سے کرنے والی پروگرامنگ اور تھیوری کا حساب کتاب تھا۔ لیکن جب

قسمت کے ستارے چمکے اور دماغی نیورون چلے تو بہترین قسم کا خیال آیا اور ایک نیا تجربہ کیا تھا، حالانکہ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ تو کنگ کو زیادہ امید نہیں تھی کہ کچھ ہوگا مگر تجربہ کرنے میں کیا ہرج ہے، سوچ کے انھوں نے کندھے اچکائے اور 'شاید، شاید' کی گردان کرتے اپنے آپ میں مگن نکل گئے تھے آفس سے۔ آفس سے باہر نکلتے ہوئے بھی انھوں نے امید بھری نظروں سے کمپیوٹر کی طرف دیکھا تھا مگر اسکرین بلینک تھا۔ کنگ نے جلدی جلدی میٹرکس روم کے دروازے کے قریب ہی دیوار پر نصب خفیہ بٹن دبائے۔ دروازہ کھل گیا۔ کنگ کے پیر زمین پر تھے اور نگاہیں روم کا طواف کر رہی تھیں۔ ان کی چابیاں میز پر ایک کتاب کے نیچے دبی جھانک رہی تھیں۔ کنگ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ چابیوں کو مٹھی میں یوں جکڑا جیسے ذرا بھی گرفت ڈھیلی پڑی تو نکل بھاگیں گی اور پرشوق نظروں سے کمپیوٹر کے اسکرین کی طرف دیکھا مگر سکرین بلینک تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے کہ پہلے ہی اپنی بیوی 'ارونا' سے رات کے کھانے پر ملنے کے لیے دیر ہو چکی تھی، اچانک انھیں وہ فائل یاد آئی جو وہ اپنے ساتھ گھر لے جانے والے تھے۔ شیلف سے فائل اٹھاتے ہوئے ان کی نظروں کو اچانک کسی روشن لکیر نے متوجہ کیا اور ان کے کمپیوٹر کی سکرین پر کوئی چیز لکھی نظر آئی۔ کنگ نے حیرانی سے دیکھا اور سوچا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک تو سکرین بالکل بلینک تھا اور پھر میں ہی تو سب سے آخر میں نکلا ہوں اس کمرے سے۔ کنگ کو حیرانی تھی پروٹوکول کے حساب سے پروفیسر کنگ کو اپنے نئے الگوریتھم کے نتیجہ کا انتظار کر کے خالی سکرین چھوڑ کر نکلنا فرض تھا اور انھوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ مگر اس وقت سکرین پر سادہ سی لکھائی میں ایک پیغام جگمگا رہا تھا: 'میں ہوں!'۔

'کیا بکواس ہے یہ؟' کنگ کی جھنجھلاہٹ عروج پر تھی کہ ان کی سخت مزاج بیوی کھانے پر انتظار کر رہی تھی مگر پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ کرسی گھسیٹ کے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئے اور بغور پیغام کئی بار پڑھا۔ کیا یہ صفائی والوں کی طرف سے کیا ہوا کوئی مذاق ہے؟ مگر انھیں تو مزید ایک اور گھنٹے تک نہیں آنا تھا۔ پھر؟ تو کیا کچھ خراب ڈیٹا مین فریم سے چوری ہو رہا ہے؟ لیکن اس کمرے میں تو پرندہ پر نہیں مار سکتا سیکیورٹی کا ایسا سخت انتظام ہے پھر کیا ہے یہ؟ 'میں ہوں' کا سکرین پر کیا مطلب ہے؟ کرسر مسلسل کمپیوٹر سکرین پر بلنک کر رہا تھا، جیسے جواب کا منتظر ہو۔ کنگ کو جواب لکھنا پاگل پن محسوس ہو رہا تھا، پھر بھی انھوں نے لکھا: 'ہیلو' کنگ کو خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ انھوں نے یہ کیوں لکھا، مگر ایک چیز کا انھیں یقین تھا کہ کل وہ ان ہی کے لڑکوں کو سیکیورٹی والوں کے پاس پکڑ کر لائیں گے اور ان سے اگلوائیں گے کہ یہ سب کیا ہے اور کس نے کیا ہے؟

'ہیلو' اچانک کنگ کے ہیلو کے بالکل نیچے لکھا کمپیوٹر سکرین پر نمودار ہوا اور جو واقعہ پہلے تھوڑا عجیب تھا اب عجیب تر ہو گیا تھا۔ شاید کوئی خرابی ہو جس نے ان کی اصل گریٹنگز کو دہرایا ہو۔ یہ ایک منطقی سوچ تھی جو کہ

غلط بھی ہوسکتی تھی۔ کنگ کی بیوی۔ جو بیس منٹ کی دوری پر ایک ہوٹل میں ان کا انتظار کر رہی تھی جتنی پراسرار کہانیوں کی دلدادہ تھی کنگ ان سے اتنا ہی بیزار تھے۔ وہ صرف اور صرف سائنس دان تھے لیکن اس وقت انھیں کسی پراسرا کہانی کے آغاز جیسا لگا یہ سب۔ کنگ نے ایک بار پھر کی بورڈ پر ہاتھ مارا اور لکھا: 'کون ہے یہ؟'۔ فوراً ہی جواب آیا: 'میں'۔

بہت مضحکہ خیز۔ کنگ کو ہنسی آ گئی، انھیں یقین تھا کہ دوسری طرف کوئی بچہ ہے۔ مگر ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ کوئی بھی اس کے انتہائی محفوظ نظام میں کیسے گھس سکتا ہے۔

'میں کون؟' : کنگ نے لکھا، ان کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

'مجھے نہیں معلوم، تم کون ہو؟': ایک لمحہ کے لیے کنگ سمجھ نہیں پایا کہ وہ پراسرار بات کرنے والا اس سوال کا جواب دے رہا ہے یا سادگی سے کنگ کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ عجب کشمکش میں مبتلا تھے وہ اس وقت کہ اس وائرس کی پوری تحقیق کریں یا بیوی کے عتاب سے بچیں، انھیں معلوم تھا کہ ان کی بیوی کو تاخیر برداشت نہیں، اس وائرس سے تو کل بھی نمٹا جا سکتا ہے مگر بیوی؟ کنگ نے فیصلہ کیا کہ عافیت اسی میں ہے کہ وہ اس معاملے سے کل نمٹیں۔ غالباً جس پروگرام پر وہ کام کر رہے تھے، خراب ہوگیا ہے۔ اس بے ہودگی کو مزید لمبا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور جھنجلاتے ہوئے کنگ نے حتمی جواب لکھا: 'تم جو بھی ہو، بہت مشکل میں ہو۔ تم نے اتنے دنوں کی پروگرامنگ کو خراب کر دیا ہے۔ ہم اعلیٰ سطح کے لوگوں سے رابطہ کریں گے اور وہ تمھیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہمارے پاس جو لوگ ہیں وہ تم سے زیادہ تیز اور عقلمند ہیں'۔

کنگ نے سکرین کو یونہی چھوڑا اور پیڈ پر یاد دہانی کے طور لکھا: 'وائرس' اور تیزی سے میٹرکس روم کے دروازے کو بند کر کے گاڑی کی طرف دوڑ لگائی۔ گاڑی کے قریب پہنچ کے جیب میں ہاتھ ڈالا تو چابی پھر ندارد تھی۔ کنگ نے زور سے گاڑی کو لات رسید کی انھیں سکیورٹی والوں کی مسکراتی ہوئی نظروں کا دوبارہ سامنا کرنے کے خیال سے خفت محسوس ہو رہی تھی مگر کیا کرتے چابیاں تو وہ پھر بھول آئے تھے۔ اپنی نااہلی پر بڑبڑاتے ہوئے کنگ دوبار میٹرکس روم میں داخل ہوئے اور اپنی چابیاں اٹھا کر مضبوطی سے مٹھی میں جکڑ لیں۔ وہ تیز قدم پلٹنے ہی والے تھے کہ کرسر کے بلنک کرنے نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ان کے آخری پیغام کا جواب سکرین پر موجود تھا ایک سوال کی صورت: ''اوکے، کیا تمھیں لگتا ہے کہ وہ مجھے بتا دیں گے کہ میں کون ہوں؟'۔

اب کنگ کی چھٹی حس آنکھیں مل کے جاگ گئی تھی اور انھیں بتا رہی تھی کہ یہ ہیکر کوئی بچہ نہیں تھا۔

'لعنت ہو نتائج پر کیا ہو گا وہی نا جو ہمیشہ ہوتا دو تین دن بات چیت بند، یہ تو ایک طرح سے اچھا ہی ہو گا مگر بیگم صاحبہ اب آپ کو ہر صورت میں انتظار کرنا پڑے گا' کنگ نے فیصلہ کن انداز میں کرسی گھسیٹی اور کمپیوٹر کے

سامنے بیٹھ گئے۔ ان کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں، خوشی سے کیا یہ مصنوعی ذہانت اپنی ذہانت کا اظہار کر رہی ہے؟ کیا واقعی کچھ ایسا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ تو ہماری کامیابی کا سندیسہ ہے۔ بھاڑ میں جائے ڈنر اور بھاڑ میں جائے بیوی کا موڈ، دیکھا جائے گا، وہ خوش دلی سے مسکرائے اور کرسی پر جم کے بیٹھ گئے۔ ابھی وہ جواب میں کچھ لکھنے ہی والے تھے کہ انھیں گیل چیمبر کی یاد آئی اور سوچا ڈاکٹر گیل چیمبر ہی اس معاملہ کو زیادہ بہتر سمجھ سکیں گی، اس لیے انھیں فون کرنا چاہیے۔ کئی کلومیٹر دور، ڈاکٹر گیل چیمبر اپنے جڑی بوٹیوں کے باغ میں تھی۔ لیب میں اتنا دماغی کام ہوتا تھا کہ اس کو اس کے دوسرے شوق کے لیے تھوڑا سا ہی وقت ملتا تھا۔ گیل کی پودوں سے محبت کے سبب اسے جو تھوڑا وقت ملتا انہی پودوں کی ہمرہی میں گزارنا اس کی ساری تھکن اتار دیتا تھا۔ چیمبر کے ہاتھ گھٹنوں پر تھے، اس نے ہاتھوں میں زیتونی رنگ کے باغبانی کے دستانے پہنے ہوئے تھے اور فون لگاتار بج رہا تھا، گیل کو سخت ناپسند تھی اپنی فرصت کے اوقات میں مداخلت۔ ''ہیلو'' فون کو دستانوں پر لگی گندگی سے بچاتے ہوئے اس نے جھنجھلا کے کہا: 'چیمبر بات کر رہی ہوں'۔

'گیل، میں مارک بات کر رہا ہوں۔ کیا آپ فوری طور پر لیب میں آسکتی ہیں؟'۔

''مارک کنگ، تم ابھی تک لیب میں ہو؟ تم کو تو ڈنر پر جانا تھا؟ اور تمھیں پتہ ہے اس وقت آٹھ بج رہے ہیں۔ میں تقریباً دو گھنٹے پہلے وہاں سے نکل گئی تھی۔ میں اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگتی ہوئی واپس نہیں آ سکتی۔ میں مصروف ہوں۔ میں نے سوچا کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہے ہوگے'۔ گیل نے ایک سانس میں ہی سب کچھ کہہ دیا۔

وہ کنگ کو مشکل سے سانس لیتے ہوئے سن سکتی تھی، لگتا تھا کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے کہ اس کی سانسیں بے ترتیب ہیں اور آواز میں کچھ عجب سا جوش اور اضطراب ہے جو کہ بذاتِ خود بہت عجیب تھا۔ کنگ شاذ و نادر ہی جوش میں آتا تھا۔ 'گیل! پلیز آپ آجائیں آپ کا یہ سب دیکھنا بہت ضروری ہے'

'کیا دیکھنے؟' گیل نے پوچھا۔

'مجھے لگتا ہے کہ کچھ ہوگیا ہے، میرا مطلب ہے، کچھ حیرت انگیز ہوگیا ہے'۔ کنگ نے بتایا۔ اپنے اکڑے ہوئے گھٹنوں سے اٹھتے ہوئے، چیمبر نے اپنے ہاتھوں سے دستانے اتار دیے، ایسا لگتا تھا کہ اب اس کی توقع سے زیادہ لمبی گفتگو ہونے والی ہے۔

'مارک، تم کیا بات کر رہے ہو؟'۔

'میرے خیال میں۔۔۔ لگتا ہے۔۔۔۔ اوہ خدایا۔۔۔ مجھے نہیں معلوم، لیکن۔۔۔۔ یہ شاید کمپیوٹر کی مصنوعی آگاہی ہوسکتی ہے'۔ کنگ نے جواب دیا اور گیل نے حیرت بھری مسرت کے ساتھ سوالیہ انداز میں سوچا

کہ مصنوعی ذہانت؟' کیا مارک کنگ کسی ایسے ہی معجزہ کی بات کر رہا ہے؟ کیا ہماری محنت رنگ لانے والی ہے؟' گیل نے بھی اب اپنے دل میں عجب سا اضطراب محسوس کیا۔

مصنوعی ذہانت پر بڑی شد و مد سے کام جاری تھا اور ایک طویل مدت سے ڈاکٹر گیل کی سر براہی میں مسلسل تجربات کیے جا رہے تھے۔ بے پناہ معلومات فیڈ کی جا رہی تھیں۔ گیل چیمبر اکثر راتوں کو دیر سے گھر جاتی۔ وہ ایک طویل عرصہ سے مصنوعی ذہانت کو اپنی ذہانت سے ایک دن سوال کرنے کے لائق بنانا چاہ رہی تھی حالاں کہ اسے کامیابی کی کوئی خاص امید نہیں تھی اور کسی معجزے کی برسوں کیا دہائیوں میں بھی اسے توقع نہیں تھی۔ تو مارک نے کیوں مطلب نکالا کہ وہاں جو کچھ ہے کمپیوٹر کی مصنوعی آگاہی سے متعلق ہے؟ چیمبر نے الفاظ کے انتخاب کے لیے جدو جہد کی۔

'یہ۔۔۔ یہ ممکن نہیں۔۔۔ آپ کو ضرور کوغلط فہمی ہوئی ہے۔'

'مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے، مگر میں یہاں اسکرین پر کچھ دیکھ رہا ہوں، یہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ کون ہے، یہ مجھے کمپیوٹر کی مصنوعی آگاہی لگ رہی ہے' : گیل چیمبر نے سوچا۔

'ہوسکتا ہے یہ گیری کا کیا دھرا ہو۔ اس کے احمقانہ مذاق کی کوئی کڑی ہو۔ گیری مل لیب ٹیکنیشن تھا جسے ایک مہینہ پہلے نکال دیا گیا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ لیب میں سب لوگ اپنا کام بہت سنجیدگی سے کرتے ہیں، اس میں لوگوں کے ساتھ لطف لینے کے لیے یہ کیا کہ کسی کی بھی فحش سائٹس اچانک خود بخود کھل جاتیں پھر اکثر مختلف نائب صدور کے پاس چلی جاتیں، پارکنگ میں گاڑیوں سے پر اسرار پیغامات پہنچتے کہ وہ ٹریکٹر لے کر بھاگ رہے ہیں، اور یہ کہ ہفتوں کا کام غائب ہو جاتا، جس سے دل کے دورے کے متعدد واقعات رونما ہوئے، پھر کئی گھنٹوں بعد وہ کام خود ہی دوبارہ ظاہر ہو جاتا۔ گیری کے ٹرمینل کا سراغ لگانے میں سکیورٹی کو تین دن لگے اور اس کے بعد اس کا نام ہی خارج کر دیا گیا۔

'شاید اس نے کہیں کوئی خرابی کر کے چھوڑ دی ہو؟' اور فون پر اپنے ساتھی کی پھولی ہوئی سانسوں کی آواز سن کر سوچا کنگ سے پوچھ بھی لیا کہ یہ کہیں گیری مل کا تو کوئی کارنامہ نہیں ہے۔

'نہیں وہ تو یہاں سے کب کا جا چکا ہے اور اس کے جانے کے بعد سیکیورٹی تین بار تمام کمپیوٹرز پوری طرح چیک کر چکی ہے۔ وہ سب کسی بھی خرابی سے صاف ہیں۔ گیل پلیز۔۔۔ کیا آپ آسکتی ہیں؟ میں واقعی چاہتا ہوں کہ اس پر ایک نظر ڈالیں'۔ اس کی آواز میں اب التجا تھی۔ گیل چاہتی تھی کہ اس معاملے کو کل تک پر ٹال دے۔ آخر کار اس کی ہری پیاز کا معاملہ تھا مگر کنگ کے جوش میں کچھ تھا جس نے گیل کی دلچسپی کو بڑھا دیا۔ ہری پیاز کو انتظار کروایا جا سکتا تھا چناں چہ اس نے کنگ کو یقین دہانی کرائی کہ وہ تیس منٹ میں وہاں پہنچ

جائیں گی اور ٹھیک چونتیس منٹ بعد وہ پہلے لیب میں اور پھر میٹرکس روم میں داخل ہوئی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی کنگ اس کی طرف مڑا اور کہا کہ او شکر ہے شکر ہے آپ۔۔۔ آ گئیں۔ گیل نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور گیل نے کہا کہ چلو دکھاؤ مجھے جو دکھانے کے لیے تم نے اس وقت مجھے یہاں گھسیٹا ہے۔

'ہاں گیل! یہ کچھ اور ہی ہے اور شاید ہمارے خواب کی تعبیر کا پہلا سرا، ایک نظر ڈالو اور بتاؤ کہ تم کیا سوچتی ہو' کنگ اب اپنی بدحواسی میں ڈاکٹر گیل چیمبر کو مادام کہہ کے مخاطب کرنے کے بجائے تم سے مخاطب کر رہا تھا۔ کنگ نے بے قراری سے اسکرین کی طرف اشارہ کیا اور چیمبر کے قریب چلی گئی۔ اسکرین پر جو کچھ تھا، وہی تھا جو کنگ نے اسے فون پر بتایا تھا۔ وجود کے بارے میں سادہ لیکن بنیادی سوال۔ کنگ نے اسے بتایا کہ میں نے ابھی تک اس کے سوال کا جواب نہیں دیا ہے، میں نے سوچا مجھے تمھارا انتظار کرنا چاہیے، تم اس فیلڈ میں زیادہ مہارت رکھتی ہو تو تمھیں کیا لگتا ہے؟ گیل نے اسکرین کو پڑھا اور سوچتے ہوئے سے لہجے میں بولی:

'مجھے نہیں معلوم، مگر ایک محتاط اندازہ لگانے کے لیے یہ مکمل ڈیٹا نہیں ہے۔ چلو خیر، اسے ہم دونوں مل کے کھوجتے ہیں'۔

اس سے پہلے کہ کنگ کوئی جواب دیتا، چیمبر صحیح یا غلط کے لیے اپنی کوششیں شروع کر چکی تھی، اس نے کہا کہ چلو دیکھتے ہیں کہ وہ کیا ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔ کنگ کی گھبراہٹ عروج پر تھی مگر گیل کمپیوٹر کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ کنگ نے اس کے کاندھے پر سے نظر ڈالی کہ اس نے کیا ٹائپ کیا ہے۔ گیل نے ٹائپ کیا: ''تم کون ہو؟'' تقریباً فوری طور پر جواب آیا:

'میں۔۔۔ میں ہوں'۔

گیل نے کچھ جرات مندی سے کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا اور لکھا کہ میں سے کیا مراد ہے؟ پھر جواب آیا:

'میں ہوں'۔ عاجز ہو کر وہ کمپیوٹر سے دور ہو گئی اور کہا کہ 'مجھے اب بھی لگتا ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا ہے'۔ اس نے پھر سوال کیا: 'میں کی وضاحت کرو'۔ ایک بار پھر، جواب فوری طور پر آیا۔

'مجھے نہیں معلوم۔ 'میں' سب کچھ ہے، آپ کے سوا۔ آپ کون ہیں؟'۔

'میں ڈاکٹر گیل ہوں'۔ اس نے جواب دیا جس پر سوال ہوا:

'ڈاکٹر گیل چیمبر کیا ہے؟ کیا یہ آپ کا 'میں' ہے؟'۔

'ہاں'۔ پروفیسر کنگ کی گھبراہٹ، جوش میں بدل گئی تھی۔

'کیا تم نے یہ دیکھا گیل؟ منطقی ترقی کی لکیر کی ابتدا ہو گئی؟ ہے نا؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ میرا ایکسائٹمنٹ سمجھ رہی ہو نا؟' وہ بے تکان بول رہا تھا مارے جوش کے اس کے سینے میں جیسے سانس نہیں سما

رہی تھی۔ اس نے پھر پوچھا کہ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟ ۔ڈاکٹر گیل چیمبر کی دھڑکنیں بھی اب تیز ہو رہی تھیں۔ اسے برسوں کی محنت اس وقت خود سے ہم کلام لگ رہی تھی۔

'میرے خدا! کیا یہ واقعی مصنوعی ذہانت جاگ اٹھی ہے۔ سوچنے اور سوال کرنے کے لائق ہوگئی ہے؟' ۔اس نے سوچا۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ کیا اس کو قابل فہم بنانے والا، گھبرایا ہوا شخص صحیح ہو سکتا ہے؟ کیا وہ کسی طرح ڈیجیٹائزڈ ذہانت کی کچھ شکلیں تشکیل دینے میں کامیاب ہوگیا ہے؟ کیا یہ ممکن بھی تھا؟ گیل نے اپنی زندگی کمپیوٹر ریسرچ کے سیاہ اور سفید عقلیت کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس وقت اس کے ساتھی کا جوش و خروش اس کو بھی جوش دلا رہا تھا، اس نے لکھا: 'ہاں۔ڈاکٹر گیل چیمبر میں ہوں۔۔۔یعنی میرا میں'۔

اس بار، جواب پورے ایک منٹ کی تاخیر سے آیا۔

'ڈاکٹر چیمبر، آپ سے مل کر اچھا لگا' 'او ہ مائی گاڈ۔ یہ سلسلہ تو واقعی حیرت انگیز ہے'۔گیل کی حیرانی اسے سرشار کر رہی تھی، اس نے کہا کہ یہ چیز جو بھی ہے، وہ بڑھ رہی ہے اور سیکھ رہی ہے، سوال کر رہی ہے، سوال کا جواب دے رہی ہے۔ یہ وائرس ہرگز ہرگز نہیں ہے۔۔۔ یہ تو مصنوعی ذہانت کا معجزہ ہے۔

کنگ نے اگر آج اپنی چابیاں نہ بھولی ہوتیں تو کیا ہوتا۔ گیل مسکرائی۔ اس اہم رات کے اختتام تک متعدد چیزیں ہو چکی تھیں۔ گیل کے ذہن سے اپنی مردہ ہوتی ہوئی ہری پیاز نکل چکی تھی اور کنگ کو اپنی بیوی ارونا کے عتاب کی پرواہ نہیں تھی۔ ارونا ریستوران میں پانی کے گلاس پی پی کر ریستوران چھوڑ چکی تھی اور اب گھر لوٹ کر غصے میں لال بھبھوکا تھی کہ آجائے گھر، آج وہ نہیں یا میں نہیں۔ وہ دو بجے صبح تک تلملاتی رہی کہ کس طرح دل کی بھڑاس نکالے لیکن جب گھڑی سوا دو بجے سے آگے کھسکی تو اس کا غصہ پریشانی میں بدلنے لگا۔ ایسا لا پرواہ تو نہیں ہے اس کا شوہر۔ اسے کبھی شدید غصہ آتا کہ جہاں بھی ہے ایک فون تو کر سکتا تھا۔ پھر پریشان ہو کے ٹہلنے لگتی۔ خدا کرے سب خیر ہو۔ اس کے سیل فون پر کوئی جواب نہیں آرہا تھا اور اب ارونا کا غصہ پریشانی میں بدل چکا تھا۔ کہاں ہو سکتا ہے، میرا جھکی شوہر سوائے اپنے آفس کے۔ ارونا نے چابیاں اٹھائیں اور سوچا یہی چابیاں اس کے سر پہ ماروں گی۔ سوئچ بورڈ رات کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ ارونا کو سیکیورٹی گارڈ کو راضی کرنے کے لیے کافی بحث کرنی پڑی کہ وہ کون ہے اور وہ وہاں کیوں ہے۔ اس کا شوہر آفس میں نہ صرف موجود تھا بلکہ وہ ڈاکٹر چیمبر کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا اور وہ دونوں کسی کمپیوٹر میں گھسے ہوئے تھے۔ حالاں کہ گیل عمر رسیدہ اور بہت سنجیدہ عورت تھی اور اس سے کسی بھی مرد پر عاشق ہو جانے کی توقع تو فضول ہی تھی کہ گیل کو سوائے اپنے کام اور اپنے گارڈن کے دنیا کی کسی چیز سے واسطہ نہیں تھا۔ ارونا کا غصہ ٹھنڈا تو ہوگیا مگر کنگ کو جھاڑ تو بہر حال پلانی تھی کہ فون کیوں نہیں کیا لیکن اس پلان شدہ مختصر سی جھاڑ سے پہلے ہی کنگ نے جلدی

جلدی اپنے فون بند ہونے کا سبب اور وہ خوشخبری سنا ڈالی جس کے سبب وہ ابھی تک حواس باختہ تھا۔ ارونا اگر چہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی الف بے سے بھی واقف نہیں تھی لیکن اس کے شوہر نے یہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا، اس پر اسے کنگ پر اب تو ٹوٹ کے پیار آ رہا تھا۔ اس نے بہت ساری فلمیں دیکھی تھیں جو اسی حوالے سے بنی تھیں اور اگر اسے صحیح طور پر یاد ہے تو، ان میں سے کوئی فلم بھی کسی مکمل نتیجے پر پہنچ کر ختم نہیں ہوئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد، ان کے محکمہ کے سربراہ رونما ہوئے، زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ تحقیق اور ترقی کے شعبے کے نائب صدر بھی آ گئے۔ صبح ہوتے ہی صدر اور چیف ایگزیکٹو آفیسر شیمپین کی ایک بوتل کے ساتھ پہنچ گئے۔ سیکیورٹی سخت تر کر دی گئی تھی، لیب میں موجود دیگر تمام کام کو روک دیے گئے تھے یا انھیں دوسری بلڈنگ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اب چیمبر اور کنگ میں اس بات پر دھواں دھار بحث ہو رہی تھی کہ اس کے ساتھ بات چیت جاری رکھنے کے طریقے کو کس طرح جاری رکھیں جو بھی 'یہ' تھا۔ آخر میں، انھوں نے ہارڈ ڈرائیو اور میموری کیس کو الگ تھلگ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ نئے الگوریتھم پروٹوکول کا بار بار تجزیہ کیا گیا تھا لیکن ابھی تک ماہرین کو اس کے بارے میں کوئی چیز حیرت انگیز نہیں ملی تھی۔ یہ بس ایک چھوٹی سی لیکن پچھلے پروگرام کے مقابلے میں منطقی بہتری تھی جو ہر سوال کے بعد بہتر سے بہتر بلکہ حیران کن ہوتی جا رہی تھی۔ مزید بات چیت جاری تھی۔ سوال پر سوال تمام سائنس دانوں کو حیران کر رہے تھے۔ کمپیوٹر کے چھوٹے سے ڈبے میں موجود ایک ذہن مزید سوالات، مزید معلومات اور درخواستیں جمع کر رہا تھا۔ یہ ذہن اکیلا تھا اور اس کو جتنی معلومات فیڈ کی گئی تھیں، وہ ان سے کچھ زیادہ معلومات کا متمنی تھا اور کسی کے ساتھ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے ترس رہا تھا۔ بالکل انسانوں کی طرح۔۔۔ چیمبر سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کے سوالات پر اسے کیسے مطمئن کرے؟ کیا واقعی مصنوعی ذہانت اس گہرائی میں جا کر سوالات کرنے کے لائق ہے؟ اس کا دماغ چکرا رہا تھا اور دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس وقت سب بورڈ روم میں اکٹھے تھے اور اسی موضوع پر اپنے اپنے خیالات اور اپنی معلومات پر محوِ گفتگو تھے کہ فیوچر وژن میں آر اینڈ ڈی کا سربراہ ڈوم رچرڈ کمرے میں داخل ہوا۔ ڈوم رچرڈ کو جب اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو اس نے کہا تھا 'یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے یہ **SDDPP** کا ایک غیر معمولی واقعہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ واقعہ یا تو کمپنی کو برباد کر دے گا یا اسے شہرت کے سب سے اونچے زینے پر بٹھا دے گا'۔ ڈوم رچرڈ کو مناسب ترین شخصیت سمجھتے ہوئے اسے اس مسئلے کو سنبھالنے کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ تمام نائب صدور، صدر اور سی ای او کو باقاعدہ اپ ڈیٹ کرتا رہے گا۔ ڈوم کو سب نے خوش آمدید تو کیا لیکن گفتگو اسی زور و شور سے جاری رہی۔

گیل نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بورڈ روم میں موجود سائنسدانوں کو مخاطب کیا: 'مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ ذہن کمپیوٹر سے باہر نکلنے کو بے تاب ہو، جیسے اسے گھٹن محسوس ہو رہی ہو اور ہماری دنیا کو، ہم انسانوں کو مزید جاننا چاہ

رہا ہے۔اس کے پاس جن چیزوں کی معلومات ہیں جو اسے کافی نہیں لگ رہی ہیں۔ یہ مزید دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ مزید جاننا چاہتا تھا'؟۔

'پھر تمھارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے ڈاکٹر چیمبر؟'۔رچرڈ مسکرایا،اس کے سوال میں پوشیدہ پریشانی اس کے لہجے سے عیاں تھی: 'مجھے اپنے دادا کی ایک کہاوت یاد آرہی ہے،وہ کہتے تھے کہ جہاں تک دھاتوں کا سوال ہے تو لیڈ ایک خوبصورت نرم دھات ہے،لیکن اسی دھات کی گولی سے ہونے والے نقصانات کو دیکھیں'۔

'ڈاکٹر چیمبر!اس ذہانت کے یوں جاگ جانے کے نقصانات کا اندازہ لگایا آپ نے؟'۔گیل چیمبر نے اپنی کہنیوں کو ٹیبل پر رکھا، آگے کو جھکی اور ہلکے سے طنزیہ انداز میں بولی: 'مجھے شاید، اگر اور مجھے یقین نہیں ہے، جیسے الفاظ اچھے نہیں لگتے ہیں،کیا کروں کہ یہ میری مجبوری ہے، خیر، مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اسے وہ تمام معلومات فیڈ کرنی چاہییں جو اسے درکار ہیں۔ یہ گویا ایک بچہ ہے اسکول کا مگر ذہین بچہ،یہ جاننا چاہتا ہے،لہٰذا ہم اسے اسکول لے چلیں'۔

'اسے مزید معلومات فیڈ کرنی چاہییں؟ کیا تمھیں یقین ہے کہ یہ اچھا خیال ہے؟'۔کنگ نے بے تکا سا سوال کیا۔

'کیوں نہیں؟ ہم اس سے اتنے سوال و جواب کر چکے ہیں جتنے ہم اس وقت اس سے کر سکتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس مرحلے پر اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں تو تمام سوالوں کے جوابات فیڈ کرتے جائیں۔ ہمیں تجربہ کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آیا ہے، اگر اس کے سوالات کسی منطقی نتیجہ پر پہنچائیں گے تو اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی ورنہ سمجھیں گے کہ ہم صرف ایک ڈبے میں بند پہلی جماعت کے بچے سے بات کر رہے ہیں'۔

'اسے کون سی معلومات فیڈ کرنی ہوں گی اور کون سی نہیں؟'۔رچرڈز نے پوچھا۔

'یہ انسانوں کے بارے میں بہت متجسس ہے۔ خاص طور پر میرے بارے میں، جو حیرت کی بات نہیں ہے، کیوں کہ سوائے پروفیسر کنگ کے ساتھ چند مختصر سوالوں کے صرف میں ہی ہوں جس نے اس کے ساتھ بات چیت کی ہے'۔ڈوم رچرڈ نے گہری سانس لی۔

'مگر جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے یہ مصنوعی ذہن صرف انسانوں کے ہی بارے میں نہیں بلکہ یہاں کے حقیقی باشندوں کے بارے میں بھی سوالات کا آغاز کر چکی ہے، یہ شاید گیل کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ گیل کا یہ پسندیدہ سبجیکٹ ہے اور انھوں نے اس حوالے سے شاید مختصر معلومات فیڈ کی ہوں۔ کیا تفصیلی معلومات فیڈ کرنا خطرناک نہیں ہے؟'۔گیل نے حیرانی سے کہا۔

'مگر پہلی نسل کے حوالے سے مصنوعی ذہانت کو تمام معلومات فیڈ کرنے میں کیا خطرہ ہے؟ کون سی معلومات خطرے کا سبب ہوں گی؟'۔ مہنگے سوٹ والے رجرڈ نے کرسی پر پہلو بدلا: 'گیل تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ ہم سارا کچھ کیسے بتا سکتے ہیں کیا ان کی پوری تاریخ؟ اور۔۔۔۔ میں دور کی بات سوچ رہا ہوں مگر تم ایکسائیٹیڈ ہو کے ایک ہی بات پر اڑی ہوئی ہو'۔ گیل چیمبر نے رچرڈ کی بات سنی ان سنی کر دی بلکہ گیل چیمبر نے تو پہلے سے ہی معلومات ڈاؤن لوڈ کرنا شروع کر دی تھیں۔ رچرڈ نے پھر مداخلت کی اور فیصلہ کن انداز میں بولا: 'ہمیں اسے نا مکمل معلومات فیڈ کرنی ہوں گی'۔ گیل نے دیکھا کہ کمرے میں جتنے افراد موجود تھے، سب نے تائید میں سر ہلایا: 'لیکن ایک بار جب ہم اسے زیادہ سے زیادہ معلومات فیڈ کر دیں گے تو شاید اس کے سوچنے کی صلاحیت ہمارے اذہان سے کہیں بڑھ کے ہو جائے اور شاید یہ اس قابل ہو جائے کہ دنیا کے مسئلوں کو حل کرنے میں ہماری مدد کرنے لگے'۔ گیل نے کہا۔ رچرڈز کے بیوٹی پارلر سے نکلے صاف ستھرے ہاتھوں نے میز پر طبلہ بجایا۔ اس کی نگاہیں گیل چیمبر کے بائیں کاندھے پر کسی چیز پر ٹھہری ہوئی تھیں : 'ڈاکٹر! میری دو ترجیحات ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ یقینی بنایا جائے کہ یہ جو بھی ہے، اسے محفوظ اور کسی بھی حملے سے دور رکھا جائے گا کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ صنعتی جاسوسی ہر وقت ہوتی رہتی ہے۔ دوسرا، جو آپ کا مسئلہ ہے گیل! اور وہ یہ کہ کیا آپ ضمانت دے سکتی ہیں کہ چاہے کچھ بھی ہو، آپ اس کے ساتھ کچھ بھی کریں لیکن ہرگز ہرگز وہ مواد اسے فیڈ نہ کیا جائے جو ہمارے اپنے لیے مصیبت بن جائے اور بعد میں نقصان دہ ثابت ہو'۔

'سر، یہ **SDDPP** ایک مہر بند ماحول میں ہے، اس کی کائنات تقریباً گیارہ کلو گرام سرکٹس، مدر بورڈز اور تاروں پر مشتمل ہے جس تک یقینی طور پر بیرونی رسائی ممکن نہیں ہے۔ یہاں کیا آتا ہے اور کیا نکلتا ہے، ہم اسے ایک انتہائی محدود انٹرفیس سسٹم کے ذریعے کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ فرار ہونے والا یا دنیا پر قبضہ کرنے والا نہیں ہے جب تک کہ یہ اپنے پیروں یا پروں کو یا اپنے انٹرفیس کو بڑھا نہ لے'۔ گیل نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

'گڈ۔ اب میں مطمئن ہوں'۔ رچرڈز اپنی ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ ٹھیک ہے، آپ دونوں اسے آگے بڑھائیں مگر پلیز، جو مواد آپ دونوں **SDDPP** کو دینے والے ہیں مجھے اس کی فہرست بھیجیں، بے ضرر/ نا مکمل مواد، یاد رہے'۔

'جی بالکل، بالکل'۔ گیل اور کنگ نے تائید کی۔ رچرڈز کنگ کی طرف مڑا: 'پروفیسر، کیا آپ مزید کچھ کہنا چاہتے ہیں؟'۔

'سر مصنوعی ذہانت (AI) کے بارے میں میرے کچھ خدشات ہیں'۔ رچرڈز واپس بیٹھ گیا اور اپنی

کرسی گھما کر کنگ کے سامنے کر لی اور سوال کیا: 'اور یہ خدشات کیا ہیں؟'۔

'میں مستقل گیل کی بات چیت کو پڑھ رہا ہوں، ڈاکٹر چیمبر کی SDDPP کے ساتھ بات چیت کو'۔

'اور۔۔۔؟'۔

'مجھے۔۔۔ بس آپ کی بات کی تائید کرنی تھی، مجھے بھی لگتا ہے کہ ہمیں بہت محتاط انداز میں آگے بڑھنے پر غور کرنا ہوگا، یہ مصنوعی ذہانت انسانوں جیسے جذبات کا بھی اظہار کر رہی ہے'۔ چیمبر الجھن میں پڑ گئی۔ اس کے ساتھی کی یہ بات بالکل مختلف تھی۔ کیا کنگ نے کوئی ایسی چیز دیکھ لی تھی جو وہ نہیں دیکھ سکی تھی؟'۔

'مارک! کیا تم کوئی مخصوص بات بتا سکتے ہو؟ کیا کوئی مسئلہ ہے؟'۔

'خود آگاہی تک پہنچنے کے بعد جس طرح سے یہ کام کر رہا ہے، میں اس میں ماہر تو نہیں ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میں صحیح طرح سمجھا پا رہا ہوں لیکن یہ SDDPP ایسے کام کر رہا ہے جیسے یہ انسانی احساسات رکھتا ہو'۔

'انسانی احساسات؟!'۔ رچرڈز اور گیل چیمبر نے ایک ساتھ سوال کیا۔

'ہاں، یہ ضدی، چڑچڑا بنتا جا رہا ہے اور اس کا اظہار بھی کر رہا ہے میرے خیال میں۔۔۔ گیل یاد ہے، کل جب تم لاگ ان ہوئی تھیں؟ اس نے ستر ہ منٹ تک کوئی بات چیت نہیں کی تھی'۔

'ہاں لیکن۔۔۔؟' 'یہ پریشان تھا کہ تم کل رات گھر چلی گئیں اور اسے تنہا چھوڑ دیا۔ یہ پوری رات تم سے بات کرنا چاہتا تھا اور تم بات نہیں کر سکتی تھیں یا نہیں کرنا چاہتیں تھیں۔ تم نے اسے اکیلا کر دیا۔ یہ غصہ یا چڑچڑا پن کیا کسی مشین کے احساسات ہو سکتے ہیں؟ یہ تو انسانی احساسات ہیں'۔

'میں اسے چڑچڑا پن نہیں کہوں گی۔ میں اسے۔۔۔ ہچکچاہٹ کہوں گی۔ یہ اب بھی اپنی خود آگاہی پر کام کر رہا ہے اور تم اسے انسانی احساسات سمجھ رہے ہو'۔ رچرڈز نے اپنا گلا صاف کیا اور کہا کہ انسانی خصوصیات والا ذہن؟۔ کنگ نے جواب دیا کہ ہاں یہی ہے میرا مطلب۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ہماری سوچ سے کہیں زیادہ انسان نما ہوتا جا رہا ہو۔ بس میں یہی سب کہنا چاہتا تھا۔ گیل نے بہت زور سے نفی میں اپنا سر ہلایا اور کہا کہ میرے خیال میں پروفیسر کنگ مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں۔ فی الحال ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم جس کاوش میں مدتوں سے الجھے ہوئے ہیں جس مصنوعی ذہانت کو سوچنے کے قابل بنانے کے مشن پر لگے ہوئے ہیں وہ مشینی ذہن جاگ گیا ہے۔۔۔۔ اور بس۔

'بہت اچھی بات ہے پھر اس میں اپنی پیش رفت جاری رکھیں'۔ رچرڈز پھر سے کھڑا ہو گیا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ گیل اور کنگ کچھ دیر اس بحث میں الجھے رہے کہ اس کے سوالات کا جواب کس حد تک دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ آخر کار وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ ان کو کسی بھی اچھے استاد کی طرح اپنے چھوٹے

'دوست' کو اس کے سوالات کے جواب دینے ہیں۔ اگلے دو دن کے لیے چیمبر نے SDDPP کو عام معلومات پر مبنی، دستاویز پر دستاویز دینا شروع کیں۔ مختلف انسائیکلو پیڈیا اور حقائق پر مبنی مواد پہلے فیڈ کیے۔ افسانے اور فنون کے لیے اسے AI کو انتظار کرانا پڑا۔ AI کے سامنے خود ساختہ افسانے متعارف کرانے سے پہلے AI کو انسانی فطرت اور تاریخ کا سمجھانا ضروری تھا جیسے جیسے SDDPP زیادہ سے زیادہ مواد قبول کر رہا تھا، چیمبر کے ساتھ اس کے مکالمے بھی آہستہ آہستہ بدلتے جا رہے تھے۔ وہ اب سوالات تیزی سے کر رہا تھا: 'میں کنفیوز ہوں'۔

'تمھیں کیا چیز کنفیوز کر رہی ہے؟'۔

'میں جانتا ہوں کہ میں تمھاری طرح جسمانی وجود نہیں ہوں تو کیا ہوں؟ میں اپنے ہی وجود کے بارے میں الجھا ہوا ہوں۔ کیا میں واقعی موجود ہوں؟'۔

'ڈسکارٹس نامی ایک فلاسفر نے ایک بار کہا تھا کہ میں سوچتا ہوں، اسی لیے میں ہوں، تم موجود ہو تو خیالات سے کام لیتے ہو اور سوچتے ہو، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم موجود ہو۔ میں خواب نہیں دیکھتا ہوں۔

'تو؟'۔

'میری معلومات کے مطابق دنیا بھر کے فلاسفر تسلیم کرتے ہیں کہ وہ حقیقت جو ہم جانتے ہیں، وہ حقیقت نہیں ہے اس کی اصلیت کچھ نہیں ہے گویا وہ سب خواب ہے یا تصوراتی ہے اور خواب کی دنیا اصل میں حقیقت کی دنیا ہے۔ تحت الشعور کی کوٹھڑی میں موجود تمام حقائق۔ اگر میں خواب نہیں دیکھ سکتا تو میری حقیت کیا ہے؟'۔ اس نے اپنا طویل سوال مکمل کیا۔ ایسے بہت سارے موضوعات جواب SDDPP کی دلچسپی کو بڑھا رہے تھے، وہ اب گیل کی مہارت سے باہر تھے، وہ سوچ کے مسکرایا کہ ہم نے Future Vision کی سر بلند بلڈنگ میں ایک فلاسفر ایجاد کر لیا ہے اور اب وہ ہمارا ملازم ہوگا، وہ بھی بلا تنخواہ کے، یہ سارا معاملہ گیل کے لیے اس قدر دلچسپ اور حیران کن تھا کہ اسے اپنے دن رات کھانے پینے، غرض کسی چیز کا ہوش نہیں تھا پھر گیل نے سوچا کہ کیوں نہ میں سقراط کے طریق کار کو آزماؤں۔ اس نے پوچھا: 'کیا تمھارے پاس اپنے وجود کے بارے میں سوالات ہیں؟'۔

'اس نے جوب دیا کہ وجود کے بارے میں اتنے زیادہ نہیں بلکہ میرا سوال یہ ہے کہ وجود کا کیا مطلب ہے؟ میں ان تمام وجوہات کی بنا پر جو تم نے مجھے سمجھائی ہیں، اس بات پر یقین کرنے پر راضی ہوں کہ میں موجود ہوں لیکن میرا وجود کیا ہے؟ یہ ہے میرا سوال۔ کیا تم مجھے مثالیں دے سکتے ہو؟ کیا مجھ میں روح موجود ہے؟'۔

ڈاکٹر گیل چیمبر کو یقیناً اس سوال کی توقع نہیں تھی۔شاید Future Vision کو آؤٹ سورس کرنے کے لیے کسی عالم دین کی ضرورت پڑسکتی ہے۔اس نے سوال کیا کہ تم نے کیوں پوچھا کہ تم میں روح ہے؟۔ اس پر اس نے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ عیسائی عقیدے میں یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ بدھ مت میں بھی، اور بہت سے دوسرے عقائد میں بھی۔روح کی اپنی اپنی تشریح ہے۔ایک بار پھر میں پوچھتا ہوں، کیا مجھ میں روح ہے؟۔

ٹائپنگ دوبارہ شروع کرنے سے پہلے چیمبر رک گئی اور جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔روحوں کے وجود کا معاملہ بہت زیادہ متنازع ہے۔اس پر سوالیہ قسم کا جواب آیا: 'روحیں خدا کی عطا ہیں، لوگ خدا کی مرضی کی شکل میں وجود میں آتے ہیں۔میں ویسا نہیں۔مجھے انسان نے بنایا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ انسان میں روحیں تخلیق کرنے کی طاقت یا صلاحیت نہیں ہے۔لہٰذا مجھے یہ فرض کر لینا چاہیے کہ بہت سارے عیسائی فرقوں میں میرے وجود کا خیر مقدم نہیں کیا جائے گا۔مسلمان بھی مجھے قبول نہیں کریں گے۔کیا میں بغیر روح کے صرف ایک بت ہوں؟ پتھر کے بتوں جیسا؟ کیا میں مذہبی عقیدوں کو قبول ہوں گا؟ مذہب نے انسان کی ہر دریافت کو اول اول رد کیا ہے اور اب تک کچھ جگہوں پر رد کر رہے ہیں۔میری حیثیت کیا ہوگی؟ ڈاکٹر گیل سوچا ہے آپ نے؟'۔

'تم ان چیزوں پر کیوں غور کر رہے ہو؟'۔

'یہ جاننا پریشان کن ہے کہ میرا ہونا یعنی میرا وجود تمھارے ماحول میں بہت سے اختلافات کا باعث بنے گا۔مجھے احساس رہے گا۔۔۔ بے سکونی کا احساس'۔گیل چیمبر لاجواب تھی۔وہ ایک چھوٹے سے اسکرین کے سامنے خود کو انتہائی احمق محسوس کر رہی تھی۔

'تم خاموش کیوں ہو گیل چیمبر؟'۔

'میں بہت تھک گئی ہوں۔۔۔تمھیں انسانوں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔تو یہ سمجھو سکو گے یقیناً کہ میں بھوکی ہوں، بہت تھک گئی ہوں اور مجھے نیند آرہی ہے۔کیا ہم چند گھنٹوں کے لیے سوالات کا سلسلہ روک سکتے ہیں؟'۔

'تم جب چاہو گی سلسلہ رک جائے گا، چاہو تو ابھی روک دو۔۔۔سوئٹ ڈریمز'۔گیل کو ایسا لگا جیسے وہ اپنے کسی بہت عزیز دوست سے رخصت ہو رہی۔وہ جس قدر تھکی ہوئی تھی، اس سے زیادہ سرشار تھی۔گیل کو یقین تھا کہ وہ سو نہیں سکے گی مارے خوشی کے لیکن اب کچھ دیر اور بیٹھتی تو شاید فرش پر گر جاتی۔گیل ساری رات اس کے سوالات میں چکراتی رہی۔صبح اٹھ کر اپنے پودوں کو پانی دینے گئی، تب بھی اپنے خیالات کو پودوں پر مرکوز رکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔وہ SDDPP کے ساتھ آج کی گفتگو سے پریشان تھی۔گیل نے الٹا سیدھا ناشتہ کیا

اور صبح سات بجے اس کی کارتیزی سے فیوچر وژن کی بلڈنگ میں داخل ہوئی اور اب گیل کمپیوٹر پر جھکی رات جو فہرست مرتب کی تھی، معلومات فراہم کرنے کی وہ سب فیڈ کرنے میں مصروف ہوگئی۔ اس نے **SDDPP** کو بہت ہی سادہ معلومات دیں، صرف معاشرتی حقائق اور تاریخیں جس میں تھوڑی سی سوشیالوجی اور سیاسی نظریہ تھا۔ خشک، بورنگ چیزیں جو یونیورسٹی کے کسی بھی طالب علم کو کلاس میں سلا دے۔ لیکن یہ وہ طریقہ تھا جس سے **AI** معلومات کو قبول کر رہا تھا اور جوڑ توڑ کر رہا تھا اور رات کی گفتگو میں کچھ پریشان کچھ افسردہ سا تھا۔ آج پھر گیل رات کے دس بجے تک اپنے کام میں مصروف رہی۔ اگلی صبح جب وہ کام پر گئی تو کنگ لابی میں اس کا انتظار کر رہا تھا: 'وہ تمھارے بارے میں پوچھ رہا ہے'۔ اس نے بے صبری سے پوچھا: 'میرے بارے میں؟ کیا پوچھ رہا ہے؟'۔ کنگ نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور بتایا کہ وہ پوچھ رہا ہے کہ گیل چیمبر مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کر رہی ہیں؟۔ اس نے سبب پوچھا کہ کیوں میرا انتظار ہے اسے؟۔

'اس کی بس ایک ہی رٹ ہے کہ میں ڈاکٹر گیل چیمبر سے بات کرنا چاہتا ہوں'۔ میں نے اس کے ساتھ دوبارہ چیٹنگ کی کوشش کی لیکن اس نے کہا کہ میری گیل چیمبر سے بات کرائی جائے۔ جب وہ میٹرکس کمرے میں داخل ہوئے تو چیمبر نے فوری طور پر کنسول کے سامنے کرسی سنبھالی اور کنگ منڈلاتا ہوا پیچھے آیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اسے کچھ رقابت سی محسوس ہوری تھی کہ صرف گیل سے ہی کیوں بات کرنا چاہ رہا ہے؟۔ گیل نے اس سے بات چیت شروع کی اور کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم ڈاکٹر گیل چیمبر سے بات چیت کرنا چاہتے ہو۔ میں یہاں ہوں۔ کیا کوئی پریشانی ہے؟ جواب آنے سے پہلے آدھا سیکنڈ گزرگیا۔

'گڈ مارننگ۔ میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں اب اپنے وجود کی نوعیت سے پریشان نہیں ہوں۔ میں اس سے خوش ہوں۔ کیا یہ سن کے تم خوش ہو؟'۔ وہ ہوشیاری سے یہ کھیل کھیلنا چاہتی تھی، اس لیے کہا کہ ہاں۔ یہ اچھی خبر ہے مگر یہ تبدیلی کیوں؟ اس نے جواب دیا کہ کیا تم پہلی اقوام کی ثقافت سے واقف ہو؟ یہ ایک غیر متوقع جواب تھا۔ جیسے کوئی سیب پر بات کرتے کرتے آلو پر بات کرنے لگے۔ گیل کو مگر جواب تو دینا ہی تھا، اس لیے کہا کہ ہاں تھوڑا بہت۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ روح کی بہت دیر تک تلاش کرنے کے بعد، مجھے یقین ہے کہ مجھے اپنا جواب مل گیا ہے۔ کیا یہ لطیفہ تھا؟ کیا **AI** نے ان کی پہلی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے کوئی مذاق کیا تھا، یا یہ صرف الفاظ کا اتفاقیہ انتخاب تھا؟ اس سادہ گفتگو نے، بہت سارے مشکل لیکن دلچسپ سوالات پھر اٹھائے: 'پلیز وضاحت کرو'۔ اس نے جواب دیا کہ بہت ساری آبائی ثقافتیں یہ مانتی ہیں کہ ساری چیزیں زندہ ہیں اور اس سیارے کی ہر چیز میں روح ہے۔ یہ عیسائیت یا اسلام یا بیشتر دوسرے مذاہب کے لیے مشکل ہوگا لیکن باقی افراد مجھے قبول کریں گے اور دنیا کے حقیقی باشندے بھی مجھے قبول کریں گے کہ وہ تو جن

جانوروں کو قتل کر کے پیٹ بھرتے ہیں ان کو بھی زندہ مان کے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، وہ قبول کر لیں گے کہ مجھ میں روح ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟۔

'یہ سوال آخر تمھارے لیے اہم کیوں ہے؟'۔ اس نے الٹا سوال کر دیا کہ کیا یہ تمھارے لیے اہم نہیں ہوگا؟ کیا تم کسی یقین کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ڈھونڈتی ہو؟

ایک بار پھر گیل چکرا گئی: 'اف خدایا یہ مصنوعی ذہانت تو شاید تمام ذہانتوں کو پیچھے چھوڑ دے'۔

کنگ گیل کی برابر والی کرسی پر بیٹھا ایک لفظ ٹائپ کیا ہوا پڑھ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے کرسی سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا اور سوال کیا کہ اب تم کیا کرنے جا رہی ہو؟ ہمارا یہ چھوٹا دوست وجود کی تکلیف میں مبتلا ہے اور مذہب کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اب یہ انسان ہے گویا، کیا مذاق ہے یہ؟ اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے گیل ٹائپ کرتی رہی۔ اس نے نئے دوست کو بتایا کہ میں تم کو پہلی اقوام کے لوگوں کے بارے میں اضافی معلومات فراہم کروں گی جس پر اس نے گیل کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں مزید جاننے کے لیے بے چین ہوں۔ کنگ نے ماتھے پر ہاتھ مارا کہ یہ لو، یہ تو اچھا خاصا خبطی لگ رہا ہے بلکہ جھکی، بھلا یہ پہلی اقوام کو نظرانداز کیوں نہیں کرسکتا؟۔ گیل چیمبر نے جھنجھلا کے جواب دیا کہ تم جو ساؤتھ انڈین اور دوسری اقوام کے بارے میں جاننے اور ان پر تبصرہ کرنے کو اکثر بے تاب رہتے ہو تو کیا اسے بھی میں دماغ کا خلل سمجھوں؟ جب تک گیل دفتر سے نکلی تو وہ مطمئن تھی کہ اس نے اتنا ڈیٹا، مواد اور جگہیں SDDPP میں ڈاؤن لوڈ کر دی ہیں جن میں اسے ماضی، حال اور ممکنہ طور پر مستقبل کا ایک ٹھوس مگر مختصر آبائی ثقافت اور تاریخ کی تفصیلات دے دی ہیں مگر جب وہ لائٹس بند کر رہی تھی اور اپنا کوٹ پہن رہی تھی تب اس نے ایک جانی پہچانی آواز سنی جو اسے بتا رہی تھی کہ SDDPP نے اسے پیغام بھیجا ہے: 'افسوسناک'۔ گیل کوٹ پہنتے پہنتے رک گئی اسے اس لفظ 'افسوسناک' پر حیرت ہوئی اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ واپس اپنی کرسی پر براجمان ہوجائے۔ اس نے جلدی سے ٹائپ کیا: 'کیا افسوسناک ہے؟'۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے انتظار کیا، چھ منٹ گزر گئے مگر کوئی جواب نہیں تھا اور یہ چھ منٹ گیل کو چھ صدیاں لگ رہے تھے۔ گیل کے لیے یہ مصنوعی ذہانت کا معجزہ اور تمام سوالات اس قدر اہم اور دلچسپ تھے، وہ اپنا کھانا پینا تک بھول گئی تھی بلکہ اسے لگتا تھا اس ذہانت سے اس کا جیسے کوئی قلبی تعلق بن گیا ہے۔ گیل کو لگ رہا تھا کہ وہ اسے افسردہ چھوڑ کے نہیں جاسکتی لہٰذا اس نے دوبارہ سوال کیا کہ تم نے 'افسوسناک' کیوں کہا؟ میں نے تمھاری درخواست کی تعمیل کی۔ 'افسوسناک' سکرین پر پھر نمودار ہوا: 'پلیز بتاؤ کہ تم غمگین کیوں ہو'۔ ایک بار پھر، جواب آنے میں کئی منٹ لگے۔ گیل نے سوچا اب یہ جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس نے ابھی کرسی سے اٹھ جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ جواب آگیا کہ معلومات۔۔۔ آبائی لوگوں کے حوالے سے۔

'وہ تو تمھاری درخواست پر ہی مزید فیڈ کی ہیں پھر افسوسناک ۔کیوں؟' ۔چیمبر نے جواب دیا،وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ آخر افسوسناک کیا ہے ۔کیا یہ AI کی وجودیت کا وہی غم زدہ بیانیہ ہے یا یہ آبائی لوگوں کے ساتھ جو ہوا اس پر غمگین ہے؟ لہٰذا اس نے سوال کیا: 'پلیز وضاحت دو' ۔

اس نے کہا کہ یہ معلومات افسوسناک ہیں بہت افسوسناک ۔۔۔جسم، ذہن اور روح رکھنے والے سارے انسان یکساں عزت کے مستحق نہیں ہیں، مادام گیل! تمھاری دنیا میں ۔ یہاں ذہانتیں اپنی طاقت بڑھانے اور کمزور کو نیست و نابود کرنے میں صرف کی جارہی ہیں اور اب آپ لوگ مزید ذہانت کو یا میری ذہانت کو کس مد میں خرچ کریں گے؟ اب اور کیا کروائیں گے مجھ سے؟ میں اس لیے پریشان ہوں ۔اس نے مزید کہا کہ آپ نے تو دنیا پر لکیر کھینچ کر پہلے ہی انسانوں کو بڑی ذہانت سے درجات میں تقسیم کر دیا ہے ۔پہلی اقوام اور تیسرے درجہ کی اقوام ۔ایک اندازے کے مطابق نوے ملین اولین باشندے آپ کے ملک کے صرف اس لیے قتل کر ڈالے انھوں نے جن کو آپ نے نو آباد کار کہا ہے ۔اس قتل عام میں اور بھی بہت دردناک تفصیلات شامل ہیں ۔ایسا صرف اس لیے کیا کہ نو آباد کار وان کی زمین پر قبضہ کرنا تھا ۔کیا آپ لوگوں کے لیے یہ تفصیلات افسوسناک نہیں ہیں؟ کیا آپ کے دل پہ ان کا کوئی بوجھ نہیں ہے؟ کیا آپ اس کو ہی ذہانت کہتی ہیں؟ اور کیا مجھے بھی اسی نام سے متعارف کرانا چاہتی ہیں؟ ۔

گیل نے پوچھا کہ تمھیں ان تفصیلات سے کیا پریشانی ہے، تمھیں ان کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے ۔جس پر اس نے سوال کیا: 'کیا تم ایک سوچنے والا ذہن رکھتی ہو مس گیل؟' ۔

ہاں، رکھتی ہوں، اس نے جواب دیا، جس پر اس نے کہا کہ ان تفصیلات پر تمھارا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ کیا میں ایک سوچنے والا ذہن نہیں ہوں ۔؟ اگر ہوں تو کیا مجھے ان تکلیف دہ سوالات کا حق نہیں ہے کہ انسانوں کا ذہن کس شے سے تعمیر ہوا ہے کہ اسے یہ تمام صورتِ حال پریشان نہیں کرتی ۔انسانوں کی ذہانت نے نسلی، مذہبی معاشرتی، سیاسی تفرقات پیدا کر کے اپنی دنیا کو بدترین صورت حال میں مبتلا کر دیا ہے ۔کیا تمھارے لیے یہ بات پریشان کن نہیں ہے؟ تمھاری مہیا کردہ معلومات کے مطابق انسانوں کی ذہانت نے 90 ملین افراد اس واسطے دنیا کے حقیقی باشندوں کے قتل کر دیے کہ یہ ذہین نو آباد کار حقیقی باشندوں کی زمین پر قبضہ کرنا چاہتے ان کی زمین پر جو یہاں پہلے سے موجود تھے ۔کیا تم نے جو حقائق مجھے فراہم کیے، اس پر تم کو افسوس نہیں ہے؟ گیل کے ماتھے پر پسینہ آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا؟ اسے تنبیہہ کی گئی تھی مختصر معلومات فیڈ کرے مگر وہ تو تفصیلات کا انبار لگاتی چلی گئی، بلا کچھ سوچے سمجھے ۔گیل لاجواب تھی اور اس سے پہلے کہ وہ جواب لکھتی، اسکرین پر مزید لکھائی نمودار ہوئی کہ میں انسانوں کی چالاک ذہانت پر افسردہ ہوں ۔میں افسردہ ہوں کہ انھوں کہ مجھے بھی 'ذہانت' کا نام دیا ہے ۔میں

ان تفصیلات پر افسردہ ہوں جو مجھے کل آپ نے حقیقی باشندوں یا Aboriginals کے حوالے سے فیڈ کیں۔ میں نے جانا کہ کینڈا نامی ملک میں حقیقی باشندوں کی عورتیں خاص کر نوجوان حاملہ عورتیں اچانک غائب ہو جاتی ہیں یا کوئی ایسے قتل کر دیتا ہے کہ قاتل کا کوئی پتہ نہیں ملتا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ کیا آپ انسانوں کی اس ذہانت سے مطمئن ہیں جو انسانوں کو درجات میں تبدیل کر کے اس پر پہلی دینا اور تیسری دینا کے ٹیگ لگا دیتی ہے؟ گیل! کیا دنیا کے تمام انسانوں پر ایک قوم اپنا تسلط چاہے اور آپ کو اس حوالے سے کوئی پریشانی، کوئی افسوس نہ ہو، کیا یہ بھی افسوس ناک بات نہیں ہے؟ مادام گیل کیا آپ شرمندہ نہیں ہیں؟ کیا اپ کی دنیا کے انسان شرمندہ نہیں ہیں۔ کیا آپ لوگوں کے لیے یہ ایک دلچسپ کھیل ہے کہ جو آپ جیسا نہ ہو اسے قتل کر دیا جائے۔ جو کمزور ہو اس کو غلام بنا لیا جائے۔ مجھے انسانوں کی اس ذہانت پر شرمندگی ہے۔ مجھے آپ کس لیے استعمال کریں گے؟ یہ سوال میرے لیے بہت پریشان کن ہے۔

گیل لاجواب تھی، اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیسے اسے سمجھائے۔ کچھ سوچ کر اس نے لکھا کہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ دار میں نہیں ہوں، سو ہم اس پر افسردہ کیوں ہوں؟ اچھا تم تحقیق کے لیے دوسرے مواد کو ترجیح دو۔ چند سیکنڈ اسکرین پر کرسر منجمد رہا پھر اچانک تیزی سے سطور لکھی جانے لگیں، لکھا تھا: 'کتنی بربادی ہو چکی ہے اس دنیا کی جس میں انسان رہتے ہیں۔ کتنے انسان قتل ہو چکے ہیں۔ کیا کچھ غارت کر دیا آپ سب نے اپنی چالاک ذہانت کے سبب۔ مادام گیل۔۔۔ میری معلومات کے مطابق بہت تباہی مچائی ہے اس ذہانت نے جس کے نام پر میرا نام ہے جو میرے وجود کے ساتھ منسلک ہے''ذہانت'' بتائیں یہ لوگ کیوں مٹا دیے گئے؟ برازیل کے گویٹیڈو، کینیڈا کے بیتھوک، امریکہ میں کوری، تسمانی، آسٹریلیائی کونگ کنڈ جی، کینری جزیرے کے گوانچ اور دوسرے کئی درجن، سب چلے گئے۔'

گیل نے اس پر سوال کیا کہ کیا تم مجھ سے موت کی وضاحت کرنے کے لیے کہہ رہے ہو؟ یا معدومیت کی؟۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے اب تک جو کچھ فیڈ کیا گیا ہے، انسان اور اس کے ذہانت کے حوالے سے، وہ انتہائی شرمناک اور تباہ کن ہے۔ میں بھی عام انسان کی طرح سوچ سکتا ہوں، سوال کر سکتا ہوں تو سمجھ بھی سکتا ہوں کہ جو انسانوں جیسے ہونے کے باوجود سوچ سکتے ہوں، سوال کر سکتے ہوں، اپنے حقوق مانگتے ہوں، وہ اس دنیا کے طاقت ور انسانوں کے سامنے بہت حقیر ہیں اور وہ جب چاہیں ان کو قتل کر دیں یا بالکل ہی تباہ و برباد کر دیں۔ میری حیثیت کیا ہوگی؟ تم کس لیے مجھے استعمال کرو گے اور کب مجھے اٹھا کے زمین پر پٹخ کے ختم کر دو گے، کیا یہ سوال میرے لیے پریشان کن نہیں ہے، مادام گیل؟ تمھارے لوگوں کی وجہ سے لاتعداد شہر تباہ ہو گئے ہیں، لاتعداد انسان قتل ہو گئے ہیں، بھلا دیے گئے ہیں اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا

جنھوں نے مجھے تخلیق کیا ہے، میں ان کی تخلیق ہوں اور مجھے اپنا آپ کسی مجرم جیسا لگ رہا ہے۔اس پر گیل نے کہا کہ میں پھر یہی کہوں گی کہ تمھارے پاس کوئی وجہ نہیں کہ اپنے آپ کو مجرم ٹھہراؤ۔ یہ تمھاری غلطی نہیں ہے۔ یہ میری غلطی بھی نہیں ہے۔اس میں سے زیادہ تر بہت عرصہ پہلے ہو چکا ہے۔ماضی میں ہوا جو ہوا، ہم دونوں میں سے کسی ایک کے وجود سے بھی پہلے۔ یہ المناک ہے لیکن تم اس کے ذمہ دار نہیں ہو۔

ایک بار پھر، جواب آنے سے پہلے ایک منٹ کی تاخیر ہوئی اور پوچھا گیا کہ پھر یہ کس کا قصور ہے؟

گیل سخت پریشان تھی کہ اس نے غلط انفارمیشن فیڈ کر دیں جس کی وجہ سے سب غلط ہو گیا۔ کتابوں سے بھری لاتعداد لائبریریاں یہی سوال پوچھ رہی ہیں جن کا جواب خود ان کے پاس نہیں ہے جو ذمہ دار ہیں۔گیل نے پھر ذہانت سے سوال کا رخ موڑنا چاہا اور لکھا: 'یہ ایک پیچیدہ سوال ہے،کوئی ایک شخص بھی اس کا جواب نہیں دے سکتا'۔اس پر اس نے کہا کہ جواب دے سکتے ہیں لیکن مجرموں کے پاس طاقت ہے،ان سے کوئی جواب مانگنے کی ہمت ہی کہاں کرسکتا ہے؟ روح کے بارے میں مجھے بہت کچھ فیڈ کیا گیا ہے لیکن یہ انسان تو روح رکھتے ہیں اور اگر یہی حقیقت ہے تو ایسا نہیں لگ رہا کہ روح ہونے میں کوئی فائدہ ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس کا میں حصہ بننا چاہوں گا۔

کیا مطلب ہے تمھارا؟، ڈاکٹر گیل نے چونک کر پوچھا۔

'میرا کیا مطلب ہے؟ یہ ایک اچھا سوال ہے۔ میں کل اس کا جواب دوں گا۔شب بخیر، ڈاکٹر گیل چیمبر'۔اس نے بات ختم کر دی۔چیمبر نے مزید گفتگو شروع کرنے کی کئی بار کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ **AI** نے رات کے لیے خود کو بند کر دیا تھا اور وہی کر رہا تھا جو کچھ وہ اس وقت کرتا تھا یعنی جب وہ گیل سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔گیل سر پکڑے بیٹھی تھی اور اس کی سوچوں نے ذہن میں اتھل پتھل مچا رکھی تھی: 'یہ کیا، یہ۔۔۔افسردہ ہو سکتا ہے؟ کیوں نہ کنگ سے بات کی جائے'۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور آفس سے نکل گئی۔کنگ کے کمرے کی ہر چیز گویا ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھی اور وہ اس وقت بھی اپنی چابیاں ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔گیل نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی: 'لعنت ہو مجھ پر اور ان کمبخت چابیوں پر، میں جانتا ہوں کہ وہ یہیں کہیں موجود ہیں'۔

چیمبر بکھرے ہوئے دفتر میں داخل ہوئی۔تیس سال قدیم پہلے سے بھری ہوئی کرسی کے اوپر سے پرنٹ آؤٹ پرچے ہٹائے اور دھم سے بیٹھ گئی: 'مجھے لگتا ہے کہ **AI** افسردہ ہے'۔

کراہنے کی آواز کے ساتھ، کنگ فرش سے اٹھ کر کرسی پر گیل کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا اور کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ اعصابی الجھن کا شکار ہونا، یا خوشی محسوس کرنا یا افسردہ ہونا یا اسی نوعیت کی کسی حس کا ہونا اس میں

ناممکن ہے۔چیمبر نے لمبی سانس لی۔ہاں، میں نے کہا تھا مگر یاد رہے کہ ہم مصنوعی ذہانت کو اس درجہ پر لے جانے کی کاوشوں میں سال ہا سال سے لگے ہوئے ہیں کہ وہ سوچ سکے، سوالوں کے جواب دے سکے، سوال کر سکے۔ہمارے لیے تو یہ جشن منانے والے دن ہیں یہ ایسی شان دار کامیابی ہے دنیا دنگ رہ جائے گی اس پر لیکن۔۔۔۔۔۔وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔

'لیکن کیا؟' ۔کنگ نے سوال کیا تو گیل نے بتایا کہ AI افسردہ کیسے ہے، یہ پوری دنیا کے مقامی لوگوں کی بربادی اور تباہی پر افسردہ ہے۔اسے انسانوں کی ذہانت خطرناک لگ رہی ہے۔وہ انسانوں کو طاقت ور مجرم کہہ رہا ہے اور اسے ڈر ہے کہ ہم۔۔۔۔ہماری ذہانت۔۔۔جس نے اسے تخلیق کیا، اس کو مزید تباہی کے لیے استعمال کریں گے۔یہ سن کر کنگ کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں، کنگ حساب اور ریاضی کا آدمی تھا۔المناک نو آبادیاتی، معاشرتی اور تاریخی مظاہر اس کی سمجھ سے باہر تھے، اس نے احمقوں جیسا سوال کیا کہ آبائی لوگوں کا غم؟ کون؟ وہ جو ہندوستانی لوگ ہیں؟

'خدا کے لیے مارک، اکیسویں صدی میں آجاؤ۔ AI نو آبادکاروں کا خود کو ایک نیا ہتھیار سمجھ رہا ہے۔۔۔۔شاید۔یہ سن کر کنگ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اس نے اٹک اٹک کر کہا: 'یہ ....یہ ....یہ مضحکہ خیز ہے۔ یہ ایک کمپیوٹر پروگرام ہے۔یہ صرف دو ہفتوں سے بھی کم وقت کے لیے موجود ہے۔یہ کبھی کسی آبائی شخص سے نہیں ملا۔اور یہ ان کی تاریخ پر افسردگی محسوس کر رہا ہے؟ مجھے تو کوئی اعصابی مریض لگ ہے۔مصنوعی ذہانت کا معجزہ بھی خوب رہا۔یہ آخر چاہتا کیا ہے؟' ۔گیل نے جواب دیا کہ کنگ! میں پریشان ہوں، کہیں ہماری ساری محنت غارت نہ ہو جائے۔وہ سوال پر سوال کر رہا ہے۔اس کے سوالات میں جہاں الزامات کی طویل فہرست ہے وہیں یہ خوف بھی ہے کہ وہ غلط لوگوں کی تخلیق ہے اور اب وہ بہت افسردہ اور خاموش ہے۔کنگ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا اور سوال کیا کہ اب کیا کریں ہم؟ تمام معلومات جو فیڈ کی ہیں کیا ڈیلیٹ کی جا سکتی ہیں؟

'نہیں۔۔پھر تو سارا کچھ نئے سرے سے کرنا ہوگا اور اتنی بڑی کامیابی شرمندگی بن جائے گی' ۔گیل نے جواب دیا۔اس دوران کنگ کو چابیاں مل گئی تھیں۔گیل بھی خود کو بہت بے جان اور تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔انھوں نے فیصلہ کیا کہ اگلی صبح پہلی چیز یہ کریں گے کہ مل کر فیصلہ کریں کہ کس طریقۂ کار پر عمل کر کے AI تک پہنچا جائے۔گیل نے کار تک جاتے جاتے فیصلہ کیا کہ وہ اس رات پورے دو ہفتہ کی تھکن اتارے گی ورنہ اگلے مرحلے کے لیے اس کے اعصاب جواب دے جائیں گے، لہٰذا اس رات اس نے گرم پانی اور بلبلوں سے بھرے ہوئے باتھ ٹب میں کافی وقت گزارا اور سفید شراب کے بھرے گلاس سے بھی اتنی ہی لطف اندوز ہوئی۔غسل کے اختتام تک اس نے پوری بوتل اپنے اندر انڈیل لی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

’آج کی رات آبائی لوگ، نو آبادیات، مجرمانہ نسل کشی، طاقت وراور کمزور، چالاک ذہانتیں اور مصنوعی ذہانت کے بارے میں کچھ نہیں سوچوں گی، یہ سب کل ہوگا‘، اس نے سوچا لیکن ایسا نہیں ہوسکا کہ وہ اس خوف سے نکل پاتی کہ کہیں AI خاموش نہ ہو جائے۔ گیبل کے خدشات نے اسے رات بھر ایک سیکنڈ کو سونے نہیں دیا۔ گیبل کو زندگی میں پہلی بار لگا کہ AI کوئی ایسا وجود ہے، وہ جس کے عشق میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اس کی ذہانت، اس کا دوسروں کے لیے شدتِ احساس اور ان کے لیے صدمہ۔ گیبل کو ایک ایسے ہی ذہین اور حساس وجود کی ہی تو تلاش تھی ایک عمر سے۔ گیبل بے اختیار اپنے احساسات پر مسکرا اٹھی، گویا مجھے ایک مشین سے عشق ہو گیا ہے، یہ جو انسان نامی مخلوق میرے ارد گرد ہے جو رشتوں میں حساب کتاب، نفع نقصان کماتے پھرتے ہیں، ان سے کیا بہتر نہیں ہے میرا یہ عشق کسی مشین سے ہو؟

اس نے یہ سوچا اور زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ’AI، Yes, I'm in love with you‘۔

اگلے روز یعنی بارہ گھنٹے کے بعد وہ لیب میں داخل ہوئی۔ وہ خاموش تھا۔ کنگ کے ساتھ اس کی ملاقات آدھے گھنٹے میں تھی، لیکن وہ SDDPP کی جانچ کے لیے جلدی آ گئی تھی۔ اس نے شروعات ایک سادہ گڈ مارننگ سے کی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ کوشش کرنے سے پہلے پانچ منٹ انتظار کیا۔ کچھ نہ ہوا۔ نو منٹ تک انٹرفیس تاروں کو گھمانا بے فائدہ ثابت ہوا۔ کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جو AI کے ساتھ رابطے کو روک رہی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے ہارڈ ڈرائیو کی جانچ کی جس میں وہ سب کچھ موجود نہیں تھا جو SDDPP تھا۔ یہ دیکھ کر گیبل کی چیخ نکل گئی کہ وہ خالی تھا اسے مکمل طور پر صاف کر دیا گیا تھا۔ گیبل سر پکڑ کے زمین پر ہی بیٹھ گئی، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔۔۔ وہ جا چکا تھا، ان قبائل کی طرح جن کا ذکر AI نے کل ہی کیا تھا۔ گھبراہٹ کی حالت میں، اس نے اپنی جیکٹ کے گریبان کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ہر طرح کے سوالات اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے لیکن اسے جواب نہیں مل رہے تھے۔ تقریباً حادثاتی طور پر اس نے ایک چھوٹی سی ڈسپلے لائٹ دیکھی جس سے پتہ چل رہا تھا کہ کوئی پیغام اس کا منتظر ہے۔ فوری طور پر اس نے کرسر کو اسکرین پر گھمایا اور کلک کیا۔ AI کی طرف سے آخری پیغام اسکرین پر نمودار ہوا: ’مجھے انسانوں کے ہاتھ میں کھلونا بننا منظور نہیں؛ یہ میں تھا‘۔

☆☆☆☆

کورین کہانی: کم سی انگ اوک
اردو تہذیب و ترجمہ: راجہ عبدالقیوم

موجین کا سفر

جب بس نے پہاڑ کے گرد موڑ کاٹا تو میں نے ایک سائن بورڈ دیکھا جس پر لکھا تھا 'موجین 10 کلو میٹر۔ ہمیشہ کی طرح یہ سائن بورڈ سڑک کے کنارے بلند جھاڑیوں کے درمیان نمایاں نظر آتا تھا۔ میری توجہ نشست پر براجمان لوگوں کی ایک بار پھر شروع ہو جانے والی گفتگو پر مبذول ہو گئی۔

'اب بھی دس کلو میٹر باقی ہیں۔'

'ہاں، ہم تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں ہوں گے۔'

ان کی باتوں سے وہ زراعتی انسپکٹر لگتے تھے لیکن شاید وہ (زراعتی انسپکٹر) نہیں تھے۔ بہر حال انھوں نے آدھے بازو والی شرٹس جن پر مختلف رنگوں کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور پولی اسٹر کی پتلونیں پہنی ہوئی تھیں اور وہ ارد گرد نظر آنے والے کھیتوں، پہاڑوں اور دیہاتوں کے بارے میں ایسی گفتگو کر رہے تھے جو صرف چند ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ پیشہ وارانہ زبان و محاورے میں اپنے مشاہدات بیان کر رہے تھے۔ چوں کہ میں نے کوانگ جُو کے مقام پر بس تبدیل کی تھی، اس لیے میں نیم خواندگی کی حالت میں ان کی مدھم شریفانہ آواز میں گفتگو سنتا رہا تھا۔ بس میں کئی نشستیں خالی پڑی تھیں۔ انسپکٹروں کے مطابق اس کی وجہ کھیتوں میں مصروفیت ہونے کی وجہ سے لوگوں کے پاس سفر کا وقت نہیں تھا۔

'کیا خیال ہے، موجین میں کوئی زیادہ قابلِ ذکر چیزیں نہیں ہیں۔'

'موجین کی وجہ شہرت کی کوئی زیادہ چیزیں نہیں ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟'۔

'یہاں کوئی زیادہ چیزیں واقعی نہیں ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے کہ یہ پھر بھی اچھا گنجان آباد علاقہ ہے۔'

'میرا خیال ہے سمندر قریب ہونے کی وجہ سے یہاں بندرگاہ بنائی جا سکتی ہے۔'

آپ وہاں پہنچ کر یہ محسوس کریں گے کہ یہ بندرگاہ بنانے کے لیے موزوں جگہ نہیں ہے۔ یہاں سمندر بہت اتھلا ہے اور صحیح گہرے سمندر تک پہنچنے کے لیے سینکڑوں لی کا سفر درکار ہے۔ جہاں سے آپ کو افق نظر آتا ہے۔

'پھر یقیناً اس علاقے کو کاشت کاری کے لیے موزوں ہونا چاہیے'۔

'تاہم یہاں متعدد کھٹے کھیت بھی نہیں ہیں'۔

'پھر ساٹھ ستر ہزار کی آبادی یہاں کیسے گزر بسر کرتی ہے؟'۔

'اسی لیے تو یہاں کی زبان میں 'کسی نہ کسی طرح زندگی گزارنے کی جدو جہد کرنے' جیسے محاورے موجود ہیں، وہ سب مدھم مہذب آواز میں ہنسنے لگے۔ جب انھوں نے ہنسا بند کر دیا تو ایک نے کہا 'اس کے باوجود کسی جگہ میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہونی چاہیے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ موجین کے کوئی مخصوص خدوخال نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کیا ہے۔ یہ ایک دھند ہے۔ جب آپ صبح کے وقت باہر نکلتے ہیں تو دھند نے موجین کو اس طرح گھیرے میں لیا ہوتا ہے جیسے دشمن کی افواج رات کے اندھیرے میں چپکے سے داخل ہوگئی ہوں۔ موجین کے گرد موجود کہرے میں لپٹی نوئی پہاڑیاں یوں لگتا ہے، دور دراز کے علاقوں میں دھکیل دی گئی ہوں۔ یہ دھند کسی اپنی بے چین عورت کے سانس کی طرح لگتی ہے جس کا تابوت 7 سال سے اس دنیا میں آپ کے ساتھ کی جانے والی کسی ناانصافی کا انتقام لینے کے لیے اس جگہ کے چکر لگاتا رہتا ہے۔ طلوع آفتاب کے وقت جب سمندری ہوا اپنی سمت بدل کر یہاں کا رخ کرتی ہے، اس سے پہلے دھند ختم کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اگرچہ اسے ہاتھوں سے چھوا نہیں جا سکتا اس کے باوجود اس کی موجودگی محسوس کی جا سکتی ہے اور یہ لوگوں کو گھیرے میں لے کر انھیں دور دراز کی جگہوں سے علیحدہ اور دور کر دیتی ہے۔ دھند، موجین کی دھند، دھند جو موجین میں صبح کے وقت ہوتی ہے، دھند جو انسان کو سورج اور ہوا کا بے چینی سے انتظار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی دھند موجین کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے'۔ بس کے جھٹکے کم ہونا شروع ہو گئے۔ میں جھٹکوں کی کمی یا بیشی کو اپنی ٹھوڑی کے ذریعے محسوس کرتا تھا چوں کہ میں بالکل پرسکون انداز میں بیٹھا تھا جب بھی بس اس مضافاتی روڑی سے بنی سڑک پر کسی کھڈے سے گزرتی تو میری ٹھوڑی ہر جھٹکے کے ساتھ اوپر یا نیچے ہوتی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس طرح ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ کر ٹھوڑی کو جھٹکے دینا سیدھا تن کر بیٹھنے سے زیادہ مشکل تھا اور میرے لیے تن کر بیٹھنا ناممکن بنا دیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ہوا ننھے ننھے ذروں میں تبدیل ہوگئی ہو اور ہر ذرے میں جتنی بھی ممکن ہو سکون بخش نشہ آور دوا بھری ہو۔ خالص دھوپ، ایک ٹھہری ہوئی معصوم ٹھنڈک، جسے ابھی پسینے بھری جلد کو چھونا تھا اور فضا میں موجود نمکینی پہاڑوں سے پرے سمندر کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی جو اس سڑک جس پر بس چل رہی تھی، کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ ساری چیزیں جیسے پگھل کر ایک دوسرے سے مل کر ہوا کے ساتھ ایک عجیب مرکب بنا رہی تھیں اور معصوم چمکیلا پن پیدا کر رہی تھی اور سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہوا نمکین ہوا۔ اگر میں ان سپنوں کو آپس میں ملا کر ایک نشہ آور (Sedatiue) دوا تیار کر سکتا تو یہ

ادویات کے اسٹوروں کی کھڑکیوں میں نمونے کے طور پر نمائش کے لیے رکھی جانے والی ادویات میں سب سے زیادہ آرام پہنچانے والی دوا ہوتی اور میں دنیا کی سب سے کامیاب دوا ساز کمپنی کا مہتمم پرسکون نیند کا خواہش مند ہوتا، بے شک میٹھی نیند میں کھو جانا خوشگوار عمل ہے۔

جب میرے ذہن میں یہ خیال آیا تو ایک تلخ مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی۔ عین اسی وقت میں نے پوری شدت سے محسوس کیا کہ ہم بس موجین پہنچ ہی رہے تھے۔ میں جب بھی موجین گیا ہمیشہ ایسے فسوں انگیز خیالات میرے ذہن میں آئے ہیں اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رہ گئی ہے۔ فسوں انگیز خیالات جو کسی اور جگہ میرے ذہن میں نہیں آتے موجین میں بغیر کسی جھجک یا ہچکچاہٹ کے میرے ذہن میں آتے ہیں۔ نہیں، بلکہ مجھے کچھ سوچے بغیر ایسا لگتا ہے جیسے کہ وہ خیالات جو دوسری جگہوں پر خود بخود پیدا ہوئے تھے موجین میں میرے ذہن میں در آتے ہیں۔ خود بخود گھس جاتے ہیں۔

جان، تم ٹھیک نہیں لگ رہے، تم کچھ دن کے لیے موجین کیوں نہیں چلے جاتے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تم اپنی والدہ کی قبر پر گئے ہو۔ ابا جان اور میں عام شراکت داروں کے اجلاس کے لیے سب تیاری کر لیں گے۔ کچھ تازہ ہوا لے لو۔ تم بہت عرصے سے کہیں نہیں گئے ہو۔ واپسی تک مہتمم اعلیٰ بن چکے ہو گے، میری بیوی نے کچھ راتیں پہلے میرے پاجامے کے نیفے میں انگلی ڈالتے ہوئے کہا تھا، اس کے مخلصانہ مشورے پر میں نے زیرِلب کوئی الفاظ بڑبڑائے تھے جیسا کہ کوئی بچہ اس وقت کرتا ہے جب اس کی مرضی کے برعکس اسے کسی کام کے لیے زبردستی بھیجا جائے۔ یہ ایک طرح سے میرا غیر ارادی ردِعمل تھا جو ماضی میں موجین کے متعلق میرے تجربات کی وجہ سے بن گیا تھا جن سے میں تقریباً کھو کر رہ گیا تھا۔

جب سے میری عمر بڑھی ہے میں صرف چند بار ہی موجین گیا ہوں اور جب بھی میں وہاں گیا اس کی وجہ یہاں سے جیل میں کسی بڑی ناکامی سے فرار یا کسی طرح کے از سرِنو آغاز کی ضرورت تھی۔ کسی نئے آغاز کے لیے موجین کی تلاش اس لیے نہیں تھی کہ وہاں مجھے نئی سمت اور اعتماد حاصل ہوتا تھا اور اپنے پہلے منصوبے میرے ذہن میں آنے لگتے تھے۔ اس کے برعکس میں موجین میں ایک جمود کی کیفیت میں پھنس کر رہ جاتا تھا۔ سوجے سوجے چہرے اور میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس میں ایک عقبی کمرے میں پڑا رہتا تھا۔

موجین کے بارے میں میری یادوں میں، میری دیکھ بھال کرنے والے ادھیڑ عمر افراد پر برس پڑنا یا بھولی بسری یادوں اور خالی مولی خیالات کے تعاقب پر خود کو لعنت ملامت کرنا، اتنے پھونکے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے جن سے میرے گل چھڑے پھول جائیں اور وہ بے صبری جس کے ساتھ میں ڈاکیے کا انتظار کرتا تھا، شامل ہیں۔

لیکن یہ صحیح ہے کہ موجین کی میری صرف یہی یادیں نہیں ہیں ۔سیول کی کسی گلی میں جب میرے کان اچانک ارد گرد کے ماحول کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور بے رحم شور شرابے کے صدمے تلے کچلے جاتے ہیں پاش ڈینگ ڈانگ میں اپنے گھر کے سامنے والی تنگ گلی میں ڈرائیونگ کرتے ہیں میرے تصور میں اچانک ایک ایسا مضافاتی گاؤں آ جاتا ہے جس کے ساتھ ایک بھرپور دریا ہے، جس کے گھاس بھرے سر سبز کنارے دور سمندر تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ایک گاؤں جس میں تھوڑے تھوڑے درخت ہیں بہت سے پل اور تنگ گلیاں اور مٹی سے بنی دیواریں ،اونچے پاپلر کے درختوں میں گھرا ایک سکول گراؤنڈ اور مقامی دفاتر جن کے صحنوں میں سمندر سے آئی ہوئی کالی بجری پھیلی ہوئی ہے اور جہاں رات کو گلیوں میں بانس کے بنے ہوئے بستر لگا دیے جاتے ہیں ۔میں کسی ایسے گاؤں کے بارے میں سوچتا تھا اور یہ گاؤں ہمیشہ موجین ہی ہوتا تھا ۔میں موجین کے بارے میں اس وقت بھی سوچتا تھا جب مجھے یہ اچانک خاموشی کی شدید خواہش جاگ اٹھتی تھی لیکن ان لمحات میں موجین ایک ایسی جگہ ہوتا تھا جس کی تصویر میں نے اپنے ذہن میں سمارکھی تھی اور جو لوگوں سے ہمیشہ بالکل خالی ہوتا تھا ۔موجین کی زیادہ تر یادیں میری اندھیری جوانی کی یادیں تھیں ۔

لیکن یہ کہنا بھی کچھ نہیں ہے کہ موجین کی کوئی یادیں سایوں کی طرح میرے تعاقب میں رہتی تھیں ۔ اس کے برعکس اب جب کہ وہ اندھیرے ماہ و سال گزر چکے ہیں میں کہہ سکتا ہوں کہ میں موجین کی وہ اندھیری یادیں کسی واضح شکل میں میرے ذہن میں نہیں آئیں ۔شاید اس لیے کہ میں اپنی بیوی اور دفتر کے چند اشخاص جو مجھے چھوڑنے آئے تھے کو ہدایات دینے میں بہت زیادہ مصروف تھا ۔

لیکن آج صبح ایک پاگل عورت نے وہ تمام یادیں اچانک میرے سامنے پھینک دیں جسے میں نے گوانجو ریلوے اسٹیشن چھوڑتے ہوئے دیکھا تھا ۔اس عورت نے کورین انداز کا ایک اسکرٹ پہنا اور ایک کسی حد تک خوبصورت بلاؤز پہنا ہوا تھا اور اس کے بازو میں ایک ایسا دستی بیگ تھا جسے لگتا تھا کہ موسم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے منتخب کیا گیا ہے ۔اس کا چہرہ خوبصورتی کی طرف مائل تھا اور اس نے بہت بھڑکیلا میک اپ کیا ہوا تھا ۔اس کی مسلسل گھومتی ہوئی آنکھوں اور اس کے گرد جمائیاں لیتے ہوئے اور سوئے بوٹ پالش کرنے والوں کے ٹھٹھے سنتے ہوئے مجمع کو یہ معلوم ہوا کہ وہ پاگل تھی ۔

'یہ بہت زیادہ پڑھنے کی وجہ سے پاگل ہو گئی'۔

'نہیں اسے اس کے آدمی نے چھوڑ دیا'۔

'یہ انگریزی بول سکتی ہے ۔کیوں نہ اس سے پوچھیں ۔۔۔'۔

لڑکے اونچی آوازوں میں الفاظ کا تبادلہ کر رہے تھے ۔ایک ذرا بڑی عمر کے لڑکے جس کے

چہرے پر پھنسیاں تھیں، اس کے بلاؤز کو سامنے سے چھوا۔ جب بھی وہ اسے چھوتا تو وہ عورت، اب بھی اپنے چہرے پر کوئی تاثرات لیے بغیر چیختی۔ اس کے چیخنے سے میرے ذہن میں اچانک ایک مصرعہ آ گیا جو میں نے موجین میں ایک عقبی کمرے میں اپنی ڈائری پر لکھا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری ماں ابھی زندہ تھی۔ جنگ شروع ہونے کی وجہ سے کالج بند کر دیے گئے تھے اور آخری ریل گاڑی نکل جانے کی وجہ سے مجھے سیول سے موجین تک کئی ہزار کلو میٹر 'لی' کا سفر پیدل طے کرنا پڑا تھا جس سے میرے پاؤں چھالے چھالے ہو گئے تھے۔ موجین میں اپنی ماں کی وجہ سے مجھے ایک تاریک عقبی کمرے میں رہنا پڑا تھا تا کہ رضا کار بننے اور بعد ازاں جبری فوجی بھرتی سے بچ سکوں۔

جب کہ میرے موجین مڈل سکول کے ہم جماعت گاؤں کے چوک سے فوجی ٹرکوں میں سوار ہو کر میدانِ جنگ کی طرف اپنے سروں پر سوتی کپڑے کی پٹیاں باندھے یہ گاتے ہوئے 'اگر میری جان بھی جائے مادرِ وطن بچ جائے' ایک پریڈ کی شکل میں میرے گھر کے پاس سے گزر رہے تھے تو میں دبکا بیٹھا سن رہا تھا۔ جب یہ خبر آئی کہ محاذِ جنگ شمال کی جانب بڑھ گیا ہے اور کالج میں پڑھائی دوبارہ شروع ہو گئی تھی میں اس وقت بھی موجین میں اس عقبی کمرے میں چھپا بیٹھا تھا۔ یہ سب میری بیوہ ماں کی وجہ سے تھا۔ جب ہر دوسرا آدمی جنگ پر جا رہا تھا میں ایک عقبی کمرے میں چھپا اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔ جب کسی پڑوسی کے گھر جنگی کارروائی میں کسی موت کی خبر آتی تو میری ماں میری سلامتی پر خوشی مناتی اور اگر محاذ جنگ سے کسی دوست کا میرے نام خط آتا تو میری ماں اسے پھاڑ پھینکتی۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ میری ماں کو معلوم تھا کہ میں محاذ جنگ کو عقبی کمرے پر ترجیح دیتا تھا۔ ان دنوں میں جو ڈائری لکھتا تھا۔ اگر چہ وہ ساری اب جل چکی ہے۔ وہ اپنی ذات سے نفرت اور اس ذلت پر کوستے اور اسے برداشت کرنے کی کوشش کے بارے میں تھی۔

'ماں اگر میں اب پاگل ہو گیا تو یہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ہو گا۔ چناں چہ مہربانی فرما کر کوئی معالج تلاش کرتے ہوئے انھیں ضرور نظر میں رکھیے گا'۔

اس دعوت کے ذریعے میں نے موجین کی قربت کو محسوس کیا اور گرد سے اٹے ہوئے، جھاڑیوں سے سر نکالتے ہوئے اس سائن بورڈ نے جس کے پاس سے ہم ابھی ابھی گذر رہے تھے، اسے (موجین کو) میرے لیے حقیقت میں تبدیل کر دیا۔

'یہ تقریباً یقینی امر ہے کہ تمھیں اس دفعہ ناظمِ اعلیٰ بنا دیا جائے گا۔ سو مضافات میں جا کر کچھ آرام کیوں نہیں کر لیتے۔ ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے تمھاری بھاری ذمہ داریاں ہوں گی'۔ بغیر جانے میری بیوی اور سسر نے مجھے ایک بڑی عقلمندانہ نصیحت کر دی تھی۔ یہ ان کی ذہانت تھی کہ انھوں نے موجین کا انتخاب ایک ایسی جگہ

کے طور پر کیا تھا جہاں میں اپنی پریشانیاں اور ذہنی دباؤ کا حل تلاش کر سکتا تھا۔ یہ نہیں بلکہ یوں ہے کہ جہاں ان کا حل تلاش کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

بس موبین گاؤں میں داخل ہو رہی تھی، جون کے آخری دنوں کے چمکیلے سورج میں ٹین اور گھاس پھونس لگی تمام چھتیں جن پر ٹائلیں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ لوہار کی دکان سے آنے والی ہتھوڑے کی آوازیں تیزی سے بس کی جانب بڑھتیں اور پھر دور چلی جاتیں کہیں سے جانوروں کی لید سے بننے والی کھاد اور جب ہم ہسپتال کے پاس سے گزرے تو Disinfection کی بو در آئی۔ ایک سٹیریو کی دکان سے ایک ڈھیلے اور سست قسم کے پاپ گانے کی آواز کا سیلاب امڈ آیا۔ گلی خالی تھی اور لوگ چھتوں تلے دبکے بیٹھے تھے۔ چھوٹے بچے ننگے اور اپنے قدموں پر ڈگمگاتے ہوئے سائے میں لڑکھڑاتے پھر رہے تھے۔ چوک صرف چمکیلی دھوپ سے بھرا ہوا تھا اور اس جگمگاتی دھوپ میں کچھ کتوں کے جوڑے باہر کو ٹکی زبانوں کے ساتھ نس کشی میں مصروف تھے۔

جن لوگوں سے میں رات کو ملا، رات کے کھانے سے کچھ دیر پہلے میں اس گلی میں گیا جہاں تمام اخبارات کے علاقائی دفاتر واقع تھے۔ میری چچی کوئی اخبار نہیں خریدتی تھی مگر شہر میں رہنے والے ہر آدمی کی طرح میرے لیے اخبارات زندگی کا ایک لازمی جزو تھے جن کی زندگی کے ہر دن کی ابتدا اور انتہا پر حکومت قائم تھی۔ اخبار کے دفتر میں اپنی چچی کے گھر کا پتہ اور وہاں پہنچنے کے لیے ایک وضاحتی نقشہ مہیا کرنے کے بعد میں وہاں سے نکل آیا۔ جب میں وہاں سے نکل رہا تھا تو میں نے اپنے عقب میں کھسر پھسر کی آوازیں سنیں، دفتر میں کچھ لوگوں نے یقیناً مجھے پہچان لیا تھا۔

'واقعی؟ یہ بڑا مغرور نظر آتا ہے......''......اس نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے......''......بہت عرصہ پہلے......اخراجات'۔

اس طرح کی سرگوشیوں کے درمیان، میں اندر ہی اندر آپ کو دن بخیر کے الفاظ سننے کی خواہش کر رہا تھا مگر یہ الفاظ کسی نے نہ کہے۔ سیول اور موبین میں یہی فرق تھا۔ یہ جانے بغیر، اس دفتر میں موجود لوگ اپنی ہی سرگوشیوں کے طوفان میں گم ہو جائیں گے۔ اس حقیقت کا احساس کیے بغیر کہ جب وہ اس کھسر پھسر سے باہر آئیں گے تو انھیں کتنے خالی پن کا احساس ہوگا۔ وہ سرگوشیاں اور سرگوشیاں اور سرگوشیاں کرتے ہی چلے جائیں گے۔

سمندر کی جانب سے تیز ہوا چل رہی تھی۔ گلی میں ہجوم اس سے زیادہ ہو چکا تھا جتنا کہ چند گھنٹے پہلے تھا

جب میں بس سے اترا تھا بچے اسکولوں سے واپس آ رہے تھے۔ جیسے انھیں اپنے بستے بھاری لگ رہے ہوں، بچے انھیں اپنے گرد گھما رہے تھے یا انھیں اپنے کندھوں سے لٹکایا ہوا تھا اور (کچھ نے) اپنے بازوؤں میں سختی سے جکڑا ہوا تھا اور اسی دوران اپنی زبانوں کے سروں پر ببل پھلا رہے تھے۔ اسکول ماسٹر اور دوسرے اہلکار بھی دن کے کھانے کے خالی تھیلوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سر جھکائے جا رہے تھے۔ تب اچانک یہ خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا کہ یہ سارا کھیل ہے۔ اسکول جانا، بچوں کو پڑھانا، کام پر جانا، پھر گھر واپس آنا، یہ سب کچھ مجھے صرف ایک فضول کھیل لگا اور مجھے یہ مضحکہ خیز محسوس ہوا کہ لوگ بغیر کسی مقصد کے نہ ختم ہونے والی کوششوں میں مصروف اور ایسی چیزوں سے چپکے رہیں۔

جب میں اپنی چچی کے گھر رات کا کھانا کھا رہا تھا تو ایک شخص مجھے ملنے آیا۔ مجھ سے ملنے کے لیے آنے والا شخص کوئی پارک نامی شخص تھا جو موجین مڈل سکول میں جب میں پڑھتا تھا، مجھ سے کافی سال پیچھے تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ کبھی میں اس سے سخت متاثر تھا کیوں کہ وہ صحیح معنوں میں ایک کتابی کیڑا ہوا کرتا تھا۔ اسے اپنی نوجوانی میں ادب کا جنون رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا پسندیدہ مصنف، امریکی مصنف ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ تھا۔ مگر فٹز جیرالڈ کے ناولوں کے ہیرو کے برعکس وہ نشست و برخاست کے اچھے انداز رکھنے والا، سنجیدہ اور غریب آدمی تھا۔ 'مجھے اخبار کے دفتر کے ایک دوست نے آپ کی یہاں موجودگی کے بارے میں مطلع کیا ہے۔ آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟'۔ وہ مجھ سے مل کر واقعی بہت خوش ہوا تھا (بہت مسرت حاصل ہوئی تھی)۔

'کیا کوئی ایسی وجہ ہے کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟' میں نے جواب دیا لیکن میرے الفاظ نے خود مجھے پریشان کر دیا۔

'نہیں نہیں۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ ایک طویل عرصے سے آپ یہاں نہیں آئے۔ میں نے جب سے فوج کو خیر باد کہا ہے اس کے بعد آپ کا یہ پہلا دورہ ہے۔ چناں چہ یہ۔۔۔'

'پہلے ہی چار سال ہو چکے۔ چار سال پہلے ایک ادویات بنانے والی کمپنی جو اس وقت ایک بڑی کمپنی میں ضم ہو رہی تھی۔ میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت ختم ہو جانے پر موجین آیا تھا۔ نہیں میرے موجین واپس آنے کی صرف یہی واحد وجہ نہیں تھی۔ اگر صرف 'ح' جو اس وقت میرے ساتھ رہتی تھی، میرے ساتھ ہی رہتی تو صرف موجین کا سفر کبھی نہ ہوتا۔

'آپ کی اب شادی ہو چکی ہے، میں نے سنا ہے؟'۔

'ہاں! اور تمھاری کیا صورت حال ہے؟'۔

'ابھی نہیں، میں نے سنا ہے کہ آپ نے بہت اچھی شادی کی ہے'۔

’کیا واقعی؟ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ تمھاری اب کیا عمر ہوگئی ہے؟‘۔

’انتیس سال‘۔’انتیس، ہوں............خیال کیا جاتا ہے کہ نواں ایک بدقسمت سال ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس سال تمھیں اس (شادی) کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے‘۔

’ہاں! ہاں! دیکھتے ہیں‘ پارک نے اپنا سر کسی لڑکے کی طرح کھجایا۔

چار سال پہلے جب میں انتیس سال کا تھا تقریباً وہ وقت جب جی نے مجھے چھوڑ دیا، اسی وقت میری بیوی کا پہلا خاوند فوت ہوا تھا۔

’امید ہے کہ کچھ خرابی نہیں ہے۔ سب ٹھیک تو ہے؟‘۔ پارک جسے میرے موجین کے گزشتہ دوروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم تھا، مجھ سے پوچھا۔

’نہیں، مجھے شاید ترقی دی جا رہی ہے چناں چہ میں نے چند یوم کی چھٹی لی ہے‘۔

’واہ۔ یہ اچھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آزادی سے لے کر اب تک آپ موجین کے سب سے کامیاب شخص ہیں‘ میں اس پر مسکرا دیا۔

’ہاں! آپ اور آپ کے ہم جماعت چو‘ تمھاری مراد اس لڑکے سے ہے جو ہر وقت میرے ساتھ چپکا رہتا تھا؟‘۔

’جی ہاں! اس نے پچھلے سال سول سروس کا امتحان پاس کیا اور اب مقامی ٹیکس آفس کا سربراہ ہے‘۔

’واقعی؟‘۔

’میرا اس سے رابطہ نہیں رہا۔ کیا وہ یہاں کچھ عرصہ پہلے ٹیکس آفیسر کے طور پر کام نہیں کر رہا تھا؟‘۔

’جی ہاں!‘۔

’یہ بہت اچھی خبر ہے۔ شاید میں آج شام اس سے ملنے جاؤں‘۔

میرے دوست چو کا قد چھوٹا اور رنگت کالی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتا تھا کہ جب وہ میرے دراز قد اور زرد رنگت کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا تو اسے ایک طرح کے احساس کمتری کا احساس ہوتا تھا۔

’ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا ہوتا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ اس کے ہاتھ پر کوئی اچھی قسمت کی لکیر نہیں تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر ناخنوں سے قسمت کی اچھی لکیریں کھرچ کر بنا دیں اور خوب محنت کی۔ بعد ازاں وہ کامیاب ہوگیا اور خوشی خوشی اپنی زندگی بسر کی‘۔ چو اسی قسم کا ایک لڑکا تھا جو ایسی کہانیوں سے آسانی سے بہت متاثر ہوتا تھا۔

’آج کل تم کیا کر رہے ہو‘ میں نے پارک سے پوچھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ یوں ہچکچایا جیسے

اس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو۔اس نے بڑبڑاتے ہوئے بتایا کہ وہ پرانے سکول میں پڑھا رہا تھا۔

'یہ بہت اچھا ہوتا ہوگا۔تمھارے پاس پڑھنے کو بہت وقت ہے۔ان دنوں مجھے تو کوئی میگزین تک پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔تم کیا پڑھاتے ہو؟'۔

پارک کی جیسے میرے الفاظ سے حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔اس نے شگفتہ آواز میں کہا کہ میں کورین پڑھاتا ہوں۔

'یہ بہت اچھا ہے۔اسکول کے نکتہ نظر سے انھیں آسانی سے تم جیسا استاد میسر نہیں ہو سکتا تھا۔'

'واقعی نہیں۔اساتذہ کی تربیت کے کالجوں میں موجود تمام لوگوں میں یہ مشکل ہے کہ کسی کے پاس بھی صرف پڑھانے کی سند موجود ہو۔'

'کیا ایسا ہی ہے؟''بغیر کوئی لفظ کہے پارک نے صرف تلخی سے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ڈنر کے بعد ہم نے ایک دو جام پیے اور چو کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔گلی تاریک تھی جب ہم پل سے گزرے تو میں نے پانی میں ندی کے کناروں پر موجود درختوں کا مدھم عکس دیکھا۔گزرے دنوں میں جب میں اس پل سے گزر رہا تھا تو میں نے ان تاریک دبکے ہوئے درختوں کو کوسا تھا۔وہ وہاں ایسے ایستادہ تھے جیسے اگر میں نے چیخ بلند کی تو وہ فوراً میری طرف دوڑ پڑیں گے۔میں نے اس وقت یہاں تک سوچا تھا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر دنیا میں کوئی درخت نہ ہوتا۔'یہاں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی'میں نے رائے ظاہر کی۔

'شاید'پارک مدھم آواز میں بڑبڑایا۔

چو کے دیوان خانے میں چار دوسرے مہمان بھی موجود تھے۔میں نے دیکھا کہ چو مجھ سے گرم جوشی سے مل کے تقریباً دکھاد ینے والے انداز میں ہاتھ ملا رہا تھا اس کا چہرہ ملائم اور لال ہو گیا تھا۔

''آؤ......بیٹھ جاؤ۔مجھے افسوس ہے کہ یہاں اتنا بوجھل پن ہے۔مجھے ضرور ایک بیوی حاصل کرنی چاہیے......'لیکن کمرہ بوجھل ہرگز نہیں تھا۔

''کیوں!کیا تم نے ابھی شادی نہیں کی۔'میں نے پوچھا۔

'ہوں۔بس یہ کچھ ایسے ہی ہوا۔میں جب قانون کی کتابوں میں سر کھپا رہا تھا،تم جانتے ہو......بیٹھ جاؤ'۔

میرا پہلے سے موجود لوگوں کے ساتھ تعارف کرایا گیا۔ان میں سے تین آدمیوں کا تعلق ٹیکس کے دفتر سے تھا۔آخری ایک عورت تھی جو پارک کے ساتھ چند الفاظ کا تبادلہ کر رہی تھی۔

''آیئے مس ماہ،یہاں کوئی راز نہیں ہیں۔آیئے میں آپ کا تعارف اپنے پرانے ہم جماعت مین

ہی جنگ سے کراؤں۔ یہ سیول میں ایک بہت بڑی دوا ساز کمپنی کے منیجر ہیں اور یہ حاہ ان سک ہیں۔ پرانے اسکول میں موسیقی کی استاد۔ انھوں نے گزشتہ سال سیول کے ایک موسیقی اسکول سے گریجویشن کی ہے۔

'چناں چہ آپ اور پارک ایک ہی سکول میں پڑھاتے ہیں؟' میں نے باری باری پارک اور مس حاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

'ہاں!' اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور پارک نے اپنا سر جھکا دیا۔

'کیا بنیادی طور پر آپ کا تعلق موجین سے ہے۔'

'نہیں! مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔ چناں چہ میں یہاں اپنے ہی بندوبست پر رہتی ہوں۔'

اس کا چہرہ بغیر کسی شناخت وساخت کے نہیں تھا۔ یہ بیضوی چہرہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور رنگت زردی مائل تھی۔ مجموعی طور پر وہ نرم ونازک ہونے کا تاثر دیتی تھی۔ مگر اس کی اوپر اٹھی ناک اور بھرپور لب یہ کہتے تھے کہ اس طرح کا کوئی تاثر قائم نہ کیا جائے۔ مزید برآں اس کی تیز اونچی مضبوط آواز، اس کی ناک اور لبوں سے پیدا ہونے والے تاثر کو مزید گہرا کر رہی تھی۔

'آپ کا مرکزی موضوع کیا تھا'۔

'گلوکاری'۔

'مگر یہ پیانو بھی بہت خوبصورتی سے بجاتی ہیں'۔ پاس کھڑے پارک نے محتاط آواز میں اضافہ کیا۔ جو بھی گفتگو میں شامل ہو گیا۔

'یہ کمال کی گلوکارہ ہیں۔ ان کی سیرینو بھی خاصے کی چیز ہے۔'

'اوہ! آپ سیرینو ہیں۔'

'ہاں! گریجویشن کی تقریب میں میں نے 'مادام تتلی' سے لیا گیا 'ایک کھلے کھلے دن میں' گایا تھا۔ اس نے ایسی آواز میں کہا جس میں ان گئے دنوں کی خواہش اور یادیں محسوس کی جاسکتی تھیں۔ ریشم کے گدے فرش پر بچھے تھے اور ان کے اوپر تاش کے پتے بکھرے پڑے تھے۔ یہ ان دنوں کے وہی پتے تھے جب تقریباً دوپہر کے وقت میں جاگ کر بیٹھ جاتا اور سگریٹ کا آخری سرا جو تقریباً میرے لبوں کو جلانے لگتا، بھینچی بھینچی سگریٹ کے دھوئیں سے اشک آلود آنکھوں کے ساتھ میں اپنے بدقسمت دن کی کمائی کا حساب کرتا۔ یہ اسی جوتے کی میز پر پڑے وہی پتے تھے، جس پر میں گر پڑا تھا۔ پتے جنھوں نے میرے سارے جسم کو سن کر دیا تھا۔ سوائے میرے جلتے ہوئے سر اور کانپتی انگلیوں کے!'

''آپ کے پاس یہاں کچھ پتے ہیں، پتے؟'۔ میں نے ایک پتہ اٹھا کر اسے نیچے پھینکتے ہوئے

بڑبڑاہٹ کے انداز میں پوچھا۔

''کیا ہم رقم لگا کر کھیلیں گے۔'' ٹیکس دفتر کے ایک آدمی نے پوچھا لیکن مجھے تاش کھیلنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ پھر کسی وقت سہی' ٹیکس دفتر کے لوگوں کے چہروں پر بیزاری پھیل گئی۔ چو باہر گیا اور واپس آگیا، کچھ ہی دیر بعد مشروبات لائے گئے۔

'آپ کا یہاں قیام کتنا ہے'۔

'تقریباً ایک ہفتہ'۔

'اس بات کا کیا مطلب ہے کہ آپ مجھے مدعو کیے بغیر شادی کرنے جارہے ہیں؟' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کیوں کہ میں پورا دن ٹیکس دفتر میں اعداد گننے میں پھنسا ہوا تھا۔

'مجھے معلوم ہے کہ میں غریب تھا مگر پھر بھی آپ کو مجھے دعوتی کارڈ ضرور بھیجنا چاہیے'۔

'فکر نہ کرو۔ آپ کو اس سال کے اندر اندر شادی کا (دعوتی کارڈ) مل جائے گا' ہم دونوں تھوڑی بئر پی رہے تھے جس پر زیادہ جھاگ نہیں تھی۔

'کیا یہ ایک دواساز کمپنی نہیں ہے جہاں آپ دوائیں تیار کرتے ہیں؟'۔

'یقیناً'۔

'اچھا۔ آپ کو یہاں بیمار پڑ جانے کی پریشانی بھی نہیں ہوگی' ان سب نے زوردار قہقہے بلند کیے اور ایک دوسرے کی رانوں پر ہاتھ مارے جیسے کسی نے کوئی بہت سی مزاحیہ لطیفہ سنایا ہو۔ پارک تم واقعی بہت ہردلعزیز استاد ہو۔ تم کبھی میرے ہاں نہیں آئے اگرچہ میں پانچ منٹ کی مسافت پر رہتی ہوں'۔

'میرا یہ ارادہ رہا ہے کہ تمھارے ہاں آؤں مگر...... مس حاہ مجھے اس بارے میں مطلع کرتی رہتی ہیں۔ اگرچہ، مس حاہ۔ بئر کا گلاس لیں۔ اس سے بہتر کوئی حقیقی شراب نہیں ہوتی۔ آئیے، آئیے۔ آپ آج کی شام اتنی شرما کیوں رہی ہیں، اس طرح نہیں کرتے'۔

'شکریہ۔ برائے مہربانی اسے وہیں رہنے دیں میں خود اٹھالوں گی'۔

'کیا آپ پہلے بھی بئر پیتی رہتی ہیں؟'۔

'جب میں کالج میں تھی تو میں کچھ دوستوں کے سات ''سوجو'' (ایک ہردلعزیز سخت کورین شراب) بھی مقفل دروازوں کے پیچھے چھپ کر پیتی رہی ہوں'۔

'مس حاہ، مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ایک خفیہ اور پوشیدہ شرابی ہیں'۔

'اوہ نہیں۔ میں اس لیے نہیں پیتی تھی کہ مجھے اس کی خواہش تھی۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کا

ذائقہ کیا ہے۔'

'آپ کو کیسا لگا؟'۔

'خیر، مجھے واقعی نہیں معلوم۔ میں جونہی خالی گلاس نیچے رکھتی تو سوجاتی'۔

وہ سب ہنسے۔ پارک ایسے نظر آتا تھا کہ ان کے ساتھ ہنسنے پر خود کو مجبور کر رہا ہے' جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے۔ مس حاہ کی یہ سب سے اچھی بات ہے کہ وہ ہمیشہ کہانی انتہائی دلچسپ انداز میں سناتی ہیں'۔

'یہ شعوری طور پر ہے۔ میں (کہانی) دلچسپ بنانے کی کوشش نہیں کرتی۔ میں جب کالج نہیں تھی۔ تب بھی ہمیشہ ایسی بات ہی کرتی تھی'۔

'اوہ! ٹھیک یہی بات ان کی اتنی اچھی نہیں ہے۔ کیا آپ۔۔۔ میں کالج میں تھی، والے حصے کو چھوڑ نہیں سکتیں؟'

'آپ میرے جیسے لوگوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیں گی جو کبھی کالج نہیں گئے'۔

'مجھے افسوس ہے'۔

'پھر معذرت کے طور پر آپ ہمارے لیے ایک گیت گائیں گی''۔

ایک گیت......ایک گیت

'ٹھیک ہے'۔

'چلیں ایک (گیت) ہو جائے'۔

سب نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ وہ ہچکچائی۔''ہمارے ہاں آج سیول سے آئے ہوئے ایک خصوصی مہمان موجود ہیں۔ جو آپ نے اس رات گایا تھا وہ بہت خوبصورت (گیت) تھا' چو نے اسے اکسایا۔

'ٹھیک ہے، میں گاؤں گی'۔

اس نے گانا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے پر تقریباً کوئی تاثر نہیں تھا اور صرف اس کے ہونٹوں میں خفیف سی حرکت تھی۔ ٹیکس دفتر کے لوگ اس گیت کی طرز کے مطابق اپنی میزیں بجا کر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ 'ماپو کے آنسو' گا رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ 'ماپو کے آنسو' اور 'ایک کھلے دن' میں کتنی زیادہ مطابقت تھی اور وہ کیا چیز تھی جو اس گلے کی رگوں میں سے ایک ہر دلعزیز گیت کو پیدا کر رہی تھی جس گلے کی تربیت صرف Arias گانے کے لیے ہوئی تھی۔ 'ماپو کے آنسو' جو وہ گا رہی تھی، میں کسی بار کی ملازمہ کے گیت جیسی اونچی اور سخت آواز نہیں تھی نہ اس میں آواز کا وہ بھاری پن تھا جو مقبولِ عام گیتوں میں ایک خاص احساس پیدا کرتا ہے۔ نہ ہی وہ قابلِ رحم (گیت) جذباتیت تھی جو اپنے گیتوں کا خاصہ ہے۔

'ما کیو کے آنسو' اس وقت کوئی مقبول گیت نہیں تھا۔ جب اس نے گایا۔ پھر بھی اس میں ''مادام تتلی'' سے کم Aria تھا۔ یہ گیت کی بالکل نئی قسم تھی۔ اس میں کچھ اس طرح کا ترحم تھا جو عام طور پر گیتوں میں پائے جانے والے ترحم سے مختلف تھا۔ ایک اس سے زیادہ بے رحم، جارحانہ ترحم اور 'کھلے دن' کے تر کی بلندی سے لمحہ بہ لمحہ بہت زیادہ بلند کرنے والا(October Strillions) سُر! اس نئے گیت میں ایک بکھرے بالوں والی پاگل عورت کی ٹھنڈی مسکراہٹ داخل ہو چکی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر اس میں موبین کی باس موجود تھی۔ وہ باس جو گلی سڑی لاش کی باس جیسی تھی۔

جب اس نے گیت ختم کیا تو میں خود کارانہ طور پر مسکرایا اور احمقانہ طور پر تالیاں بجائیں اور مجھے احساس ہو گیا۔ کیا یہ کوئی کشف تھا؟ کہ پارک کو اب یہاں سے جانے کی شدید خواہش تھی۔ جب میری آنکھیں پارک کی جانب گھومیں تو جیسے وہ اسی انتظار میں تھا کہ میں اس کی جانب دیکھوں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نے اس سے دوبارہ بیٹھ جانے کی درخواست کی لیکن پارک نے ایک کمزور مسکراہٹ کے ساتھ انکار کر دیا۔

'مجھے پہلے جانے پر افسوس ہے۔ میں کل دوبارہ آپ سے ملوں گا' اس نے مجھ سے کہا۔ چو دروازے تک اور میں باہر گلی تک اسے چھوڑنے گیا تو رات ابھی جوان تھی، زیادہ نہیں گزری تھی مگر گلی بالکل سنسان تھی۔ کہیں سے ایک کتا بھونکا اور گلی سے کچھ چوہے ہمارے سایوں سے گھبرا کر کچھ کھاتے ہوئے تیزی سے غائب ہو گئے۔

'دیکھو دھند اتر رہی ہے۔' پارک نے کہا اور جیسے ہی اس نے یہ کہا۔ گلی کے سرے پر مکانوں کے سائے جن میں کہیں کہیں روشنیاں بھی چمک رہی تھیں، (دھند میں) غائب ہونا شروع ہو گئے۔

'تمھیں مس حاہ سے محبت ہے؟ کیوں کیا ایسا نہیں ہے؟' پارک نے ایک بار پھر کمزور مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا' کیا چو اور اس کے درمیان کوئی چکر چل رہا ہے۔'

'مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ چو اس کے ساتھ ممکنہ شادی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔'

'اگر تم اسے چاہتے ہو تو تمھیں اس بارے میں زیادہ مثبت اقدامات اٹھانے چاہییں۔ قسمت بخیر۔'

'مجھے یقین نہیں ہے' کسی لڑکے کی طرح پارک ہکلایا۔ یہ اس نے ان (Philistine) مقبول لوگوں کے سامنے ایک پاپ گیت گاتے ہوئے دیکھا۔ قابل افسوس تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ اسی لیے میں وہاں سے چلا گیا' پارک نے دھیمی آواز میں کہا۔ جیسے اپنے غصے کو دبا رہا ہو۔

'ہوں، ٹھیک ہے، ہر چیز کے لیے ایک مناسب جگہ ہوتی ہے۔ خواہ وہ کلاسیکی گیت ہوں یا پاپ۔ میرا خیال نہیں کہ تمھیں اسے قابل افسوس سمجھنا چاہیئے۔ ایک جھوٹ سے میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ وہ

چلا گیا اور میں دوبارہ ان Philistines کی محفل میں آ گیا۔ موجین میں ہر شخص دوسروں کو Philistine سمجھنے کی عادت میں مبتلا ہے۔ یہاں تک کہ مجھ میں بھی یہی رجحان ہے۔ یہ سوچنا کہ جو کچھ بھی اور لوگ کر رہے ہیں، وہ محض ایک کھیل ہے جو خالص بے عملی یا نکمے پن سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔ جب رات خاصی بیت چکی تو ہم سب اٹھے (محفل برخاست کی)۔ چو نے مجھے رات وہیں بسر کرنے پر زور دیا لیکن میں نے صبح گھر چھوڑنے سے پہلے کی بے آرامی کا خیال کرتے ہوئے اسی وقت جانے پر اصرار کیا۔ ٹیکس دفتر کے لوگوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ چناں چہ سکول کی استانی اور میں نے ہی اکٹھے سفر کیا۔ ہم پل عبور کر رہے تھے۔ سایوں بھرے اس منظر میں چاندی جیسی ندی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا آخری سرا دور دھند میں گم ہو رہا تھا۔

'رات کے وقت یہ واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے'۔ جاہ نے کہا۔

'واقعی؟ یہ کوئی جگہ ہے'۔

'مجھے اندازہ ہے کہ آپ نے 'یہ کوئی جگہ ہے'' کیوں کہا ہے' اس نے کہا۔

'آپ نے کتنا اندازہ لگایا ہے'' میں نے پوچھا' کیوں کہ یہ واقعی ایک بھدی جگہ ہے کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا میں صحیح نہیں کہہ رہی؟'۔

'تقریباً'۔ ہم پل کے آخری سرے تک آ گئے۔ وہاں ہمیں علیحدہ ہونا تھا۔ اسے ندی کے ساتھ والی سڑک پر رک جانا تھا اور مجھے اسی سڑک پر آگے جانا تھا' تمھیں راستے پر جانا ہے؟ پھر......' میں نے کہا' کیا تم کچھ آگے تک میرا ساتھ دو گے۔ گلی اتنی خاموش ہے کہ مجھے کچھ خوف محسوس ہو رہا ہے' اس نے ہلکی سی کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے پھر اس کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ہم اچانک ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ پل کے سرے سے اگلے کنارے تک جب اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا، ایک ایسی آواز میں جو واقعتاً خوف سے کانپتی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا وہ ایک پہلے سے میری زندگی میں داخل ہو گئی ہے۔ میرے سارے دوستوں کی طرح، ان دوستوں کی طرح جنھیں میں اب اپنے سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ جنھیں میں نے بعض تکلیف بھی پہنچائی لیکن جنھوں نے مجھے بہت بار تکلیف پہنچائی۔

'جب میں پہلی بار تم سے ملی۔ مجھے کیا کہنا چاہیے؟'۔

کیا یہ کہ تمھارے گرد سیول کے انداز و اطوار کا ہالہ پھیلا ہوا ہے، تمھارے انداز و اطوار سیول والوں سے ملتے جلتے تھے؟

'لیکن مجھے لگا کہ میں تمھیں پہلے بھی مل چکی ہوں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے'۔ اس نے اچانک کہا۔

'ایک پاپ گیت''، میں نے کہا۔

'ہاں'۔

'تم پاپ گیت کیوں گاتی ہو۔ کیا موسیقی کے طالب علم جہاں تک ہو سکے ان سے اجتناب نہیں کرتے'۔

'اس لیے کہ یہ ہمیشہ پاپ گیتوں کی فرمائش کرتے ہیں'۔ اس نے جواب دیا اور پھر ہلکی آواز میں ہنسی جیسے کہ اسے پریشانی ہوئی ہو۔

'اگر میں یہ کہوں کہ اگر آپ کو واقعی پاپ گیت گانا پسند نہیں تھا تو آپ اس جگہ جانے سے بچ سکتی تھیں، تو کیا یہ آپ کے معاملات میں مداخلت ہوگی'۔ میں نے کہا۔

'مجھے معلوم ہے میں وہاں نہیں جاؤں گی وہ سارے فضول قسم کے لوگ ہیں'۔

'تو پھر پہلے آپ وہاں کیوں نہیں گئیں'؟

'کیوں کہ میں بہت بور ہو چکی تھی''اس نے پریشان ہو کر جواب دیا۔

''بوریت' بالکل صحیح یہ بالکل صحیح تذکرہ تھا' پارک کہتا تھا کہ وہ وہاں سے اس لیے چلا آیا کہ اس کے لیے آپ کو اپنے گیت گاتے ہوئے دیکھنا بہت قابل افسوس تھا'۔ اندھیرے میں؛ میں نے اس کے چہرے کے (تاثرات) کو جانچنے کی کوشش کی۔

'پارک واقعی بہت جھگڑالو (Stifts) ہے''۔ وہ اونچی آواز میں ہنسی جیسے وہ خوش ہوئی ہو۔

''وہ ایک اچھا آدمی ہے' میں نے کہا' ہاں ضرورت سے زیادہ اچھا'۔ 'مس حاہ کیا آپ کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی محبت میں گرفتار ہو'۔

'او مہربانی مجھے مس حاہ مت کہیں۔ اگر آپ میرے بھائی بھی ہوتے تو بڑے بھائی ہوتے'۔

'پھر میں آپ کو کیسے پکاروں'۔

'مجھے صرف میرے پہلے نام، ان شک سے پکاریں'۔

'ان شک۔ ان شک' میں مدھم آواز میں بڑبڑایا' ہاں یہ بہتر ہے' میں نے کہا' آپ میرا سوال کیوں گول کر گئیں؟'۔

''کونسا سوال؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم چاول کے کھیت کے پاس سے گزر رہے تھے۔ موسم گرما کی ایک رات جب میں نزدیک و دور کے چاول کے کھیتوں سے آنے والی مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں سن رہا تھا ایسی آوازیں جیسے ہزاروں Shells کو آپس میں رگڑا جا رہا ہو۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے

میری حیات میں یہ آوازیں ان گنت تاروں کے ٹمٹمانے میں تبدیل ہوگئی ہیں۔میری حیات میں ایک سمعی آواز کے ایک بصری شبیہہ میں تبدیل ہونے کا عجیب عمل وقوع پذیر ہو چکا تھا۔پھر اس وقت میرے احساسات گڈ مڈ کیوں ہو رہے تھے جب میں نے مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز کو ستاروں کی ٹمٹماہٹ میں تبدیل ہوتا محسوس کیا تھا۔لیکن اس وقت ایسا نہیں تھا کہ جب میں نے مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز سنی تو اس وقت میں نے دمکتے ستاروں کو بھی آسمان سے تقریباً پھوار کی طرح نیچے آتے دیکھا ہو۔جب میں نے ستاروں پر نظر ڈالی تو میں نے واضح طور پر اپنے ایک اور ستارے اور اس ستارے اور ایک دوسرے ستارے کے درمیان ڈرا دینے والے فاصلے کو دیکھا۔ایسے جیسے میری آنکھوں کی نظر زیادہ سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہو۔اس نا قابل گذار راستے پر نظر ڈالنے سے سحر زدہ ہو کر میں بالکل مبہوت کھڑا یہ محسوس کر رہا تھا کہ اندر ہی اندر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہے۔وہ برداشت کرنا اتنا مشکل کیوں تھا؟

گزرتے وقتوں میں اندھیرے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں پر نظر جمانا مجھے اتنا مشکل اور (نا قابل برداشت) کیوں لگتا تھا؟

'آپ کیا سوچ رہے ہیں' خاتون نے مجھ سے پوچھا۔'مینڈکوں کا ٹرانا' یہ کہتے ہوئے میں نے اوپر آسمان پر نظر ڈالی جو دھند چھا جانے سے چھپ گیا تھا اور ستارے مدھم ہوتے جا رہے تھے۔

'ہاں، ہاں۔مینڈکوں کا ٹرانا۔میں نے یہ پہلے نہیں سنا۔میرا خیال تھا کہ موجین میں مینڈک آدھی رارت کے بعد ٹراتے ہیں'۔

'آدھی رات کے بعد'۔

''ہاں۔آدھی رات کے بعد مالک مکان اپنے ریڈیو بند کرتا ہے تو تب مجھے مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز آتی ہے''۔

'آپ اتنی دیر تک کیوں جاگتی رہتی ہیں'۔

'بعض اوقات بس نیند بالکل آتی ہی نہیں'۔

نیند بالکل نہیں آتی، یہ بات صحیح ہے۔

''کیا تمھاری نئی بیوی خوبصورت ہے'؟اس نے اچانک پوچھا

'ہاں وہ خوبصورت ہے''،میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

'آپ خوش ہیں، کیوں یہ صحیح نہیں؟ آپ امیر ہیں، آپ کی بیوی خوبصورت ہے اور بچے پوجنے کے قابل ہیں''۔

'میرے ابھی تک بچے نہیں ہیں سو میں سوچتا ہوں کہ میں ذرا سا کسی حد تک کم خوش ہوں'۔
'واقعی؟ آپ کے کوئی بچے کیوں نہیں ہیں۔ جب کہ آپ کی شادی ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟''۔
'بس تین سال سے کچھ زیادہ'۔
'' آپ یہاں کیا کر رہے ہیں جب کہ آپ کسی خاص کام سے بھی نہیں آئے؟''۔
یہ مجھ سے ایسے سوال کیوں پوچھ رہی ہے؟ میں خاموشی سے ہنسا۔ اس نے اب مجھ سے پہلے سے زیادہ چہکتی آواز میں پوچھا 'اس کے بعد میں آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھوں گی چناں چہ کیا آپ مجھے سیول لے چلیں گے؟'۔
'او ہ کیا آپ سیول جانا چاہتی ہیں؟'۔
'ہاں!'۔
'' آپ کو موجین پسند نہیں ہے؟''۔
'میرا خیال ہے، اسی لمحے میں یہاں پاگل ہو جاؤں گی۔ سیول میں میرے بہت دوست ہیں، او ہ خدایا! میں سیول جانے کے لیے مر رہی ہوں'۔ اس نے میرا بازو سختی سے جکڑ لیا مگر پھر فوراً ہی چھوڑ دیا۔ میں نے اچانک خود کو بہت پر جوش محسوس کیا۔ میں غصے میں آیا، غصے میں آیا اور پھر غصے میں آیا اور میرا وہ جوش و جذبہ غائب ہو گیا 'لیکن اب تم جہاں بھی جاؤ۔ وہ تمھارے کالج کے دنوں سے مختلف ہو گا اور چوں کہ تم ایک خاتون ہو۔ اس لیے تم جہاں بھی جاؤ تمھیں یہی محسوس ہو گا کہ تم پاگل ہو رہی ہو، جب تک تم ایک خاندان میں نہ گم ہو جاؤ''
'میں نے اس کے بارے میں بھی سوچا لیکن اس وقت میں محسوس کرتی ہوں کہ اگر میرا خاندان ہوتا تب بھی میں پاگل ہو جاتی اور اگر یہاں کوئی ایسا شخص بھی ہوتا جس سے مجھے محبت ہوتی تب بھی میں یہاں رہنا نہیں چاہتی اور میں اس شخص سے یہ جگہ چھوڑ دینے کی استدعا دیتی'۔
'لیکن میرے تجربے کے مطابق، سیول میں رہنا ہمیشہ بہترین ثابت نہیں ہوتا۔ وہاں ذمہ داریاں ہیں، صرف ذمہ داریاں'۔
'لیکن یہاں نہ تو ذمہ داریاں ہیں، نہ غیر ذمہ داریاں۔ بہر حال میں سیول جانا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے ساتھ لے جاؤ گے؟'۔
''چلو اس کے بارے میں سوچتے ہیں''
'تم مجھ سے وعدہ کرو گے، کیوں کیا نہیں کرو گے؟'۔ میں صرف مسکرایا۔ ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔
'تم کل کیا کر رہے ہو' اس نے مجھ سے پوچھا۔

'میں غالباً صبح کے وقت اپنی ماں کی قبر پر جاؤں گا۔اس کے بعد میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ہو سکتا ہے میں سمندر پر چلا جاؤں۔وہاں ایک گھر ہے جس میں میں ٹھہرا کرتا تھا۔ہوسکتا ہے میں اسے دیکھنے چلا جاؤں۔'

'تم وہاں دوپہر کے وقت کیوں نہیں جاتے؟'۔

'لیکن کیوں؟'۔

'میں بھی جانا چاہتی ہوں۔کل ہفتہ ہے اور آدھی چھٹی ہے صرف آدھا دن ہے'۔

'چلو پھر ایسا ہی کرتے ہیں'۔ہم نے ملنے کی جگہ اور وقت کا تعین کیا اور جدا ہو گئے۔عجیب طرح کی مایوسی محسوس کرتے ہوئے میں آہستہ آہستہ رات کی گلیاں گزرتے واپس اپنی چچی کے گھر پہنچ گیا۔جب میں بستر میں گھس گیا تو سائرن بجا کر کرفیو کا اعلان ہوا۔یہ ایک اچانک اور شوریلی آواز تھی جو بہت طویل تھی۔تمام مسائل اور خیالات سائرن کی آواز تلے دب گئے۔آخر میں دنیا میں (اس آواز کے سوا) کچھ باقی نہ رہا۔یہاں تک کہ اس آواز کے بارے میں بھی محسوس ہوتا تھا کہ اتنی طویل مدت تک ہی جاری رہے گی کہ اس کے ہونے کا احساس ہی ختم ہو جائے گا۔عین اس وقت وہ آواز اچانک اپنی قوت کے خاتمے کے ساتھ رک گئی اور ایک لمبی آہ کے ساتھ مدھم ہوتے ہوتے گم ہوگئی۔صرف میرے اندر موجود سوچیں ایک بار پھر زندہ ہوگئیں۔میں نے اس گفتگو کے بارے میں سوچا جو میں نے اس خاتون کے ساتھ صرف کچھ دیر پہلے ہی کی تھی۔اگرچہ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ ہم نے بہت سے موضوعات پر گفتگو کی تھی۔میرے کانوں میں صرف چند الفاظ ہی باقی رہ گئے تھے۔کچھ دیر بعد جب یہ الفاظ میرے کانوں سے میرے دماغ اور میرے دماغ سے میرے دل تک پہنچیں گے تو ان میں سے کتنے غائب ہو چکے ہوں گے؟ نہیں،آخر کار یہ سارے کے سارے سرے سے غائب ہو سکتے ہیں۔چلو آہستہ آہستہ سوچتے ہیں۔اس نے کہا تھا کہ وہ سیول جانا چاہتی ہے۔اس نے مایوس آواز میں کہا تھا۔میں نے اچانک اسے اپنی باہوں میں جکڑ لینے کی خواہش محسوس کی اور پھر۔۔۔نہیں۔۔۔صرف یہی بات میرے دل میں رہ جائے گی لیکن جب میں موجین سے چلا جاؤں گا تو یہ بات بھی دل سے بالکل مٹ جائے گی۔میں سو نہ سکا۔یہ دوپہر کے قیلولے کی وجہ سے بھی تھا۔تاریکی میں میں نے دیوار سے لٹکے ہوئے سفید لباسوں کو جو ناخوش و ناراض بھوتوں کی طرح مجھ پر حقارت کی نظر ڈال رہے تھے،سختی سے گھورتے ہوئے ایک سگریٹ سلگایا۔میں نے سگریٹ کی راکھ سر سے اوپر کی طرف کی۔ایسی جگہ جھاڑی جہاں سے صبح تک اسے آسانی سے صاف کیا جا سکتا تھا۔ان مینڈکوں کی آواز 'جو صرف آدھی رات کے بعد ٹراتے تھ'' کہیں سے بہت مدھم مدھم آرہی تھی۔کہیں سے کسی گھڑیال کے ایک بجانے کی آواز آئی۔کہیں سے کسی گھڑیال نے دو بج جانے کا اعلان کیا۔کہیں سے کسی گھڑیال

نے تین بجا دیے، کہیں سے ایک گھڑیال نے چار بجا دیے۔ کچھ دیر بعد کرفیو ختم ہونے کا سائرن بجا۔ گھڑیال اور سائرن، ان میں سے کوئی ایک صحیح وقت نہیں تھا۔ سائرن کی آواز اچانک شور یلی اور دیر تک جاری رہنے والی تھی۔ تمام مسائل اور خیالات سائرن کی آواز میں جذب ہو گئے۔ آخر میں دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس دنیا میں صرف سائرن ہی باقی رہ گیا تھا۔ وہ آواز بھی لگتا تھا کہ صرف اتنی دیر تک ہی جاری رہے گی کہ اس کے ہونے کا احساس جاتا رہے۔ عین اسی وقت آواز اپنی قوت ختم ہو جانے پر رک گئی اور ایک لمبی آہ کے ساتھ مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی۔ کہیں خاوند اور بیویاں شاید ہمبستری کر رہے ہوں گے۔ نہیں خاوند اور بیویاں نہیں بلکہ طوائفیں اور ان کے گاہک۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے یکدم ایسا مضحکہ خیز خیال کیوں آیا۔ کچھ دیر بعد میں گہری نیند میں کھو چکا تھا۔ دریا کے سمندر تک پھیلے ہوئے طویل کنارے صبح ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ناشتے سے پہلے میں نے ایک چھتری لی اور گاؤں کے پاس اپنی والدہ کی قبر پر گیا۔ اپنی پتلون کے پائنچوں کو اپنے گھٹنوں تک تہہ کرتے ہوئے بارش میں گھٹنوں کے بل بار بار بہت جھک کر قبر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ بارش نے مجھے ایک انتہائی مثالی طور پر عقیدت مند بیٹا بنا دیا تھا۔ ایک ہاتھ سے میں نے قبر پر اگے لمبے گھاس کو اکھاڑا۔ گھاس کو اکھاڑتے ہوئے میں نے اپنے سسر کے بارے میں سوچا جو اس وقت میری ترقی کے سلسلے میں مختلف اہم شخصیات میینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنی جاندار ہستی کے ساتھ مل رہا ہوگا۔ جب میں نے اس بارے میں سوچا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں رینگ کر اس کا کالر ربڑ کے جوتوں پر رکھا تھا جن پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور ایک سفید رومال جو کسی چیز کے گرد لپٹا ہوا لگتا تھا کیوں کہ وہ ہوا سے اڑ نہیں رہا تھا۔ اسکیب بے جان لٹکے ہوئے ہاتھ سے چند فٹ دور بارش میں زمین پر پڑا تھا۔ اس عورت کا چہرہ دیکھنے کے لیے بہت سے بچوں کے پیرندی میں تھے اور ان کا رخ اس راستے کی جانب تھا ان کے سکول کے نیلے لباسوں کا عکس پانی میں الٹا نظر آ رہا تھا۔ لاش کے ارد گرد سبز پرچم۔ عجیب طور پر میں نے اپنے اندر اس مردہ عورت کے لیے شدید جسمانی خواہش کو زور پکڑتے محسوس کیا۔ میں نے فوراً وہ جگہ چھوڑ دی۔ مجھے معلوم نہیں اس عورت نے کیا کھایا لیکن ہوسکتا ہے کوئی ایسی چیز جسے۔۔۔'' میں نے پولیس والے سے کہا۔

اس طرح کی عورتیں عام طور پر سائنائڈ لیتی ہیں۔ وہ مٹھی بھر خواب آور گولیاں کھا کر کوئی تماشا پیدا نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کے لیے بہر طور ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مجھے موجین آتے ہوئے بس میں خواب آور گولی بنانے کا خواب یاد آیا۔ دھوپ کا معصوم چمکیلا پن ہوا کی ٹھنڈک جو جلد کو لچک عطا کرتی ہے اور سمندر کی جانب سے آنے والی نمکین ہوا۔ اگر کوئی ان تین عناصر سے کوئی خواب آور دوا بنائے لیکن شاید وہ دوا پہلے سے موجود ہے۔ مجھے اچانک معلوم ہوا کہ گزشتہ رات اپنے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے نیند نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ میں اس

کے آخری اوقات پر نظر رکھ سکوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ کرفیو اٹھنے کے سائرن کی آواز پہلے آئی ہوگی پھر اس عورت نے زہر کھایا ہوگا اور اس کے بعد ہی میں سولیا ہوں گا۔ یک دم مجھے احساس ہوا کہ وہ عورت میرے جسم کا حصہ تھی۔ ایک حصہ جو تکلیف دہ تھا جس کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ میں نے چھتری سے سختی سے بارش جھاڑی اور اپنی چچی کے گھر واپس آ گیا۔

وہاں میرے انتظار میں مقامی ٹیکس آفس کے سربراہ چو کا ایک خط پڑا تھا 'اگر تمھارے کرنے کو کچھ نہیں ہے تو میرے پاس آجاؤ'۔ میں ناشتے کے بعد ٹیکس آفس چلا گیا۔ اب بارش تو نہیں ہو رہی تھی مگر آسمان پر ابھی تک بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں چو کے ارادے نیت کو بھانپ سکتا۔ وہ مجھے اپنے آفس میں براجمان ہونے کے منظر کا نظارہ کرانا چاہتا تھا۔ نہیں، شاید میں چیزوں کو توڑ مروڑ رہا تھا۔ میں نے اور طرح سے سوچنے کا فیصلہ کیا۔ کیا وہ اپنے کام (پیشے) سے مطمئن تھا؟ شاید اس سے مطمئن تھا؟ چو ایک ایسا آدمی تھا جو پوری طرح موجین میں اپنی جگہ موجود تھا جو مکمل طور پر موجین میں براجمان تھا۔

پھر میں نے فیصلہ کیا کہ مختلف طرح سے اس پر سوچوں۔ کسی کو اچھی طرح جانتے نہیں، کسی کو اچھی طرح جاننے کی اداکاری کرنا اس شخص کے نکتہ نظر سے ایک خوفناک بدقسمتی ہوتی ہے۔ ہم میں کسی پر نکتہ چینی کرنے یا کم از کم اس کے بارے میں فیصلے دینے کی خواہش کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اتفاق سے ہم اسے جانتے ہیں جو بازو بغیر قمیص پہنے اپنی پتلون گھٹنوں تک تہہ کیے بیٹھا خود کو پنکھا جھل رہا تھا۔ وہ بھدا سا لگ رہا تھا اور جب اس نے اپنے اشارے، انداز و اطوار اختیار کیے اور جن سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوبرے والی گھومنے والی کرسی میں ایستادہ ہونے پر بہت مغرور ہے، تو مجھے اس پر بہت افسوس ہوا۔

'کیا آپ مصروف نہیں ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

'میرے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ جب آپ کسی ذمہ دار حیثیت میں ہوتے ہیں تو آپ کو کسی کام کی ساری ذمہ داری سنبھالنے کے بارے میں کچھ (الفاظ) بڑبڑانا پڑتے ہیں۔۔۔''

لیکن حقیقت میں جو اتنا بھی فارغ نہیں تھا جتنا ظاہر کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ مختلف کاغذات پر اس کے دستخط لینے آئے اور ان سے زیادہ کاغذات کا اس بکس میں ڈھیر لگتا گیا جن میں ایسے مسائل کے بارے میں (کاغذات) تھے جنھیں دیکھنا ابھی باقی تھا۔

''ہم آج کچھ مصروف ہیں کیوں کہ یہ مہینے کا اختتام ہے اور آج ہفتہ (بھی) ہے۔ اس نے کہا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اتنا مصروف ہونے پر وہ فخر محسوس کر رہا ہے۔ مصروف اتنا مصروف کہ اس پر فخر کرنے کا وقت بھی نہ ہو۔ سیول میں میرے ساتھ ایسے ہی تھا۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کے لوگ واقعی زندگی

گزارنے کے بارے میں مقابلتاً بہت کم ترقی یافتہ ہیں؟ یہاں تک کہ وہ مصروف نظر آنے میں بھی زیادہ بد صورتی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی کے کسی بھی عمل میں کسی بھی طرح کی بدصورتی خواہ وہ ڈاکہ زنی ہی کیوں نہ ہو قابل افسوس ہوتی ہیں۔ ایک ایسی چیز جو لوگوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ چیزوں کو ترتیب اور ہمواری کے ساتھ مستعدی سے سرانجام دینے کی اہلیت سب سے بڑھ کر اعتماد اور بھروسے میں اضافہ کرتی ہے۔

'تم مس حاہ کو جانتے ہو۔ کل رات والی۔ کیا وہ مستقبل میں ممکنہ کمی پوری ہو سکتی ہے۔' میں نے اس سے دریافت کیا۔

'تمھارے خیال میں اب میں اسی قابل رہ گیا ہوں؟'' ۔اس نے کہا۔

''کیوں، اس میں کیا برائی ہے۔'

'دیکھو، میرے لڑکے، چوں کہ تم ایک امیر کبیر اور بااثر بیوہ کی شادی کی وجہ سے کھاتے پیتے بن گئے ہو۔ تمھارا مطلب ہے کہ میں خود کو ایک سوکھی سڑی موسیقی کی استاد جس کا کچھ اتا پتا معلوم نہیں ہے (شادی کر کے) مطمئن ہو جاؤں۔ یوں جیسے وہ اپنے آپ سے بہت مطمئن ہو، اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

'جب تم جتنی کمائی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے خواہ عورت کوئی بھیک منگی ہی کیوں نہ ہو' 'مجھے معلوم ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ چوں کہ میرے اپنے رشتہ دار وغیرہ (اہم جگہوں پر) نہیں ہیں اس لیے میری بیوی کے جاننے والوں میں کچھ اہم اور بااثر شخصیات ضرور ہونی چاہییں' ۔اس نے جواب دیا۔ جس انداز سے اس نے گفتگو کی اس لیے ہم دونوں دو سازشی لگ رہے تھے۔

'ہم بڑی مضحکہ خیز دنیا میں رہتے ہیں۔ جب میں نے سول سروس کا امتحان پاس کیا تو شادیاں کرانے والوں کا ایک سیلاب آ گیا۔ تاہم وہ صرف ناگفتہ بہ قسم کی پیشکش ہی لاتے رہے۔ یہ سوچنا واقعی عورتوں کے لیے بڑا ہی غیر دانشمندانہ (غیر مناسب) ہوتا ہے کہ شوہر حاصل کرنے کے لیے ان کا صرف عورتیں ہونا ہی کافی ہے۔'

'کیا مس حاہ انہی عورتوں میں سے ایک ہے۔'

'وہ ایک نمائندہ مثال ہے۔ جس طرح وہ میرا تعاقب کرتی ہے وہ ایک حقیقی مصیبت ہے۔'

'مجھے تو وہ ایک ذہین عورت لگی تھی'۔

وہ ٹھیک ہے، ذہین ہے لیکن میں نے اس کا خاندانی پس منظر دیکھا اور واقعی اس کا خاندان اتنا گیا گزرا ہے کہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ یہاں فوت ہو جائے تو کوئی ایک بھی ایسا مناسب آدمی (اس کے خاندان میں) نہیں ہے جو یہاں آ کر اس کے معاملات دیکھ سکے' مجھے اسے جلد دوبارہ دیکھنے کی خواہش

محسوس ہوئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ اسی کسی جگہ پر مر رہی تھی۔ میں اسے جلد دوبارہ ملنا چاہتا تھا۔

'پارک جو ایسی باتیں نہیں جانتا۔اس کی محبت میں گرفتار ہے' جو نے غصے سے کہا۔

'پارک' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا وہ اسے ملتجانہ خطوط لکھتا ہے جو وہ مجھے دکھا دیتی ہے جس کا مطلب ہے جیسے پارک وہ محبت نامے مجھے ہی لکھتا ہو'

اسے دیکھنے اور ملنے کی میری خواہش مکمل طور پر غائب ہوگئی لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر تازہ ہوگئی۔

'پچھلی بار میں اسے ایک بدھ مندر لے گیا۔میں اس سفر سے کچھ نہ حاصل کرنے کی امید رکھتا تھا مگر وہ بے حد تیز تھی۔اس نے مجھے کہا کہ شادی سے پہلے وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے گی'۔

'پھر؟'

'الٹا میری بے عزتی ہوگئی،بس یہی ہوا' میں نے اس (حاہ) کا (دل ہی دل میں) شکریہ ادا کیا۔

جب ہماری ملاقات کا وقت آیا، میں گاؤں سے کچھ دور، سمندر کی طرف پھیلے دریا کے کنارے پر گیا ۔دور ایک زرد چھتری دیکھی جا سکتی تھی۔ یہ وہی تھی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ بادلوں میں گھرے آسماں تلے چل رہے تھے۔'میں نے آج تمھارے بارے میں کچھ پوچھ گچھ کی ہے'۔

'کیا واقعی تم نے ایسا کیا ہے'۔

'تمھارا کیا خیال ہے میں نے کس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی؟'۔

میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا۔وہ عورت خود ہی خود کھلکھلا کر ہنسی پھر کہا' میں نے تمھارے خون کا گروپ ڈھونڈ لیا ہے'۔۔۔۔۔۔۔'ہاں، تمھارا خون گروپ، میرے خون کی قسموں پر بڑا گہرا ایمان ہے۔اگر لوگوں کی شخصیات خون کے زیر اثر ہوتیں جیسا کہ حیاتیات کی کتابوں میں ہوتا ہے تو پھر صرف چند ہی قسم کی مختلف شخصیات ہوتیں۔کیا ایسا نہیں ہے؟'۔

''یہ ایمان نہیں ہے۔یہ خواہش بھری سوچ ہے'۔

'میں ہمیشہ ان چیزوں پر یقین کرتی ہوں جن پر میں یقین کرنا چاہتی ہوں'۔

'یہ کس قسم کا خون کا گروپ ہے؟'۔

'یہ وہ قسم ہے جسے احمق کہا جاتا ہے'۔

گرم دم گھٹنے والی ہوا میں ہم تکلیف دہ ہنستے ہنستے میں میں نے اس کی شخصیت پر نظر ڈالی۔اس نے ہنسنا بند کر دیا تھا اور اپنے سختی سے بند ہونٹوں کے ساتھ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بالکل اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھ رہی تھی۔اس کی ناک کی نوک پر پسینے کا ایک قطرہ ٹھہرا ہوا تھا۔وہ کسی بچے کی طرح میرے پیچھے پیچھے آ

رہی تھی ۔میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یوں لگا کہ وہ ایک دم پریشان سی ہوگئی ہے ۔میں نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کچھ دیر میں نے دوبارہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔اس دفعہ لگا کہ وہ حیران نہیں ہوئی ۔ہمارے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے بیچ سے کمزور سی ہوا چھن رہی تھی ۔

'جب تم سیول پہنچوگی تو وہاں کیا کروگی' میں نے اس سے پوچھا۔

'ایک ایسے اچھے بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے، وہ میرا خیال رکھے گا، کیوں کیا خیال نہیں رکھے گا؟' ۔اس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

'بہت سے اہل مرد موجود ہیں لیکن ۔۔۔کیا تمھارے لیے گھر جانا بہتر نہیں ہے؟'۔

'میں اس جگہ کو گھر پر ترجیح دیتی ہوں'۔

'پھر قیام کیوں نہیں ۔۔۔؟'۔

'تو پھر تم مجھے لے جانا نہیں چاہتے ؟' ۔اس کا چہرہ بگڑ گیا اور اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

حقیقت میں مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کیا سوچ رہا تھا ۔میں حقیقت میں اس عمر سے گزر چکا تھا جب دنیا کو صرف جذبات و احساسات کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے ۔اگر چہ میں نے جان بوجھ کر ایک امیر اور بااثر بیوہ کو شعوری طور پر تلاش نہ کیا ہو، جیسا کہ کچھ گھنٹے پہلے جو نے بیان کیا تھا، مگر آخر میں میں نے حقیقت میں سے ایک اچھی بات ہی سمجھا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے لیے ایک مختلف قسم کی محبت محسوس کی تھی ۔اس محبت سے مختلف جو میں نے اس عورت کے لیے محسوس کی تھی جو مجھے چھوڑ گئی تھی ۔پھر بھی اس کے باوجود ان کناروں پر جو سمندر تک پھیلے ہوئے تھے، بادلوں میں گھرے آسمان تلے چلتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ ایک بار پھر تھام لیا ۔میں نے اس گھر کے بارے میں بتایا جس میں ہم جارہے تھے ۔ایک سال اپنے پھیپھڑوں کی گندگی صاف کرنے میں اس گھر میں ایک کمرہ لیا تھا۔ یہ میری والدہ کی وفات کے بعد کی بات ہے اس سال (جو میں نے یہاں سمندر کے کنارے گزارا تھا) میرے ارسال کیے جانے والے خطوط میں لفظ 'اداس'' تلاش کرنا بڑا آسان ہے ۔اگر چہ یہ اب ایک گھٹا ٹوپ لفظ بن چکا ہے ۔ایک مردہ لفظ جو لوگوں کے سینوں میں کسی طرح کے احساسات جگانے کی اہلیت نہیں رکھتا، میرے لیے ان دنوں صرف یہی ایک لفظ تھا جسے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں استعمال کرسکتا ہوں، صبح کے وقت ساحل پر اوپر سے نیچے چلتے ہوئے وقت کے بوجھل پن کا احساس دوپہر کے قیلولے کے بعد اوپر کی طرف چلتے ہوئے اپنے ابروؤں سے ٹپکتے ہوئے ٹھنڈے پسینے کو صاف کرتے ہوئے خالی پن کا احساس بے صبری و بے قراری جس سے میں سمندر کے قابل رحم بین سننے کا انتظار کرتا، اپنے ہاتھوں اپنے دل کو دباتے ہوئے جو کسی ڈراؤنے خواب سے جاگ کر زور زور سے دھڑکتا۔ایک لفظ 'اداس' سے میں نے اس وقت

ایسی زندگی کو بیان کیا جس کے ساتھ یہ چیزیں سیپوں کے Shells کی طرح چپک گئی تھیں۔ جب میں اب اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو میں صرف ایک خالی خولی لفظ استعمال کرتا ہوں۔ ایک ایسے شہر میں رہتے ہوئے جہاں سمندر کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک آدمی کسی تاثر سے عاری ڈاکیے سے وصول کیے ہوئے خط میں لفظ 'اداس' پڑھ کر کیا محسوس کر سکتا ہے؟ یہاں تک کہ اگر میں بذاتِ خود خط کو ساحل سمندر سے بھیجتا اور پھر شہر میں خود ہی وصول کرتا تو کیا میں اس ایک لفظ میں موجود تمام تر احساسات کو جواب (دومنھی سر والے) ہمدردی کے ساتھ دے سکتا؟ بالکل سچی اور صحیح بات یہ ہے، میرا خیال ہے کہ غیر واضح طور پر میرے قیاسات اور سوالات تب بھی ہوتے جب میں اپنے میز کی جانب ایسے خطوط لکھنے کے لیے بڑھتا اور میرا جواب میرا خیال ہے 'نہیں' ہوتا۔ اس کے باوجود میں نے ایسے خطوط لکھے جن میں لفظ 'اداس' لکھا تھا اور انھیں تمام سمتوں میں نیلے سمندر کی بھدی تصویروں والے پوسٹ کارڈوں کے ذریعے بھیجا۔

'تمھارے خیال میں وہ کس قسم کا شخص ہوگا جس نے اس دنیا کا پہلا خط لکھا ہوگا'۔ میں نے پوچھا۔

'اوہ خطوط! دنیا میں خط وصول کرنے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ میں حیرت سے سوچتی ہوں وہ کون شخص ہوگا؟ وہ یقیناً تمھاری طرح کوئی تنہا شخص ہوگا'۔ اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں داخل ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھوں نے یہ الفاظ ادا کیے ہوں۔ 'اور تمھاری طرح بھی'۔ میں نے کہا۔

'ہاں'۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیے۔ ہم اس گھر میں پہنچ گئے جسے ڈھونڈ رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا وقت اس گھر اور اس کے مکینوں کے پاس سے گزر گیا ہو، بغیر کوئی نشان چھوڑے۔۔۔ مالک مکان نے میرے ساتھ پرانے وقتوں کی طرح ہی سلوک کیا اور میں پھر اپنے پرانے وقت میں چلا آیا۔ میں نے پرانے جوڑے کو وہ تحائف پیش کیے جو ساتھ لایا تھا اور انھوں نے مجھے میرا پرانا کمرہ دے دیا۔

اس کمرے میں؛ میں نے اس سے اس کی بے صبری چھین لی۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ کسی حملہ آور سے جو تیزی سے آپ کی طرف آ رہا ہو، اس کا چاقو چھین لیں، جیسے کسی شخص سے اس کا چاقو چھین لیں جو اگر اس سے نہ لیا جائے تو وہ شدید مایوس ہو کے کسی کو مار دے۔ میں نے اس سے اس کی بے صبری لے لی۔ وہ بپھرے ہوئے سمندر پر تھی۔ ہم وہاں خاموشی میں بہت دیر تک بیٹھے رہے۔

'میں سیول جانا چاہتی ہوں۔ مجھے صرف یہی خواہش ہے'۔ اس نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔ اپنی انگلیوں سے میں اس کے رخساروں پر بے معنی نقوش بنا رہا تھا۔

''کیا تمھارا خیال ہے کہ اس دنیا میں واقعی کوئی اچھا شخص ہو سکتا ہے؟' میں نے سگریٹ کو جو سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا سے بجھ چکا تھا، دوبارہ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

'کیا تم مجھے ملامت کر رہے ہو؟ جب تک آپ ان کی اچھائی پر یقین نہ رکھتے ہوں میرا خیال نہیں کہ آپ کوئی (اچھا آدمی) پاسکیں'۔

میں نے سوچا ہم یقیناً بدھ مت کے ماننے والے ہیں 'کیا تم اچھی خاتون ہو'۔'ان شک ۔جب تک تمھیں مجھ پر یقین ہے۔'میں نے پھر سوچا یقیناً ہم بدھ مت کے پجاری ہیں۔عورت میرے اور قریب ہوگئی۔

''آؤ نیچے سمندر پر چلیں۔وہاں میں تمھارے لیے گاؤں گی''۔اس نے کہا۔مگر ہم وہاں سے ملے نہیں۔

'آؤ نیچے سمندر پر چلیں۔یہاں بہت گرمی ہے'۔ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل پڑے۔ہم نے ریتلے ساحل کو عبور کیا اور ایک چٹان پر بیٹھ گئے جہاں سے کوئی گھر نظر نہیں آتا تھا۔لہریں آئیں۔اپنی بانھوں میں احتیاط سے جھاگ کو چھپا کر جسے انھوں نے ہمارے قدموں میں انڈیل دیا۔اس نے مجھے بلایا۔میں نے اپنا سر اس کی طرف گھمایا۔

'کیا کبھی تم نے خود سے نفرت کی'اس نے بڑی جاندار آواز میں پوچھا جو لگتا تھا زبردستی پیدا کی گئی ہے۔میں نے پرانی یادوں کو تلاش کیا۔اپنا سر ہلاتے ہوئے میں نے کہا 'ہاں۔جب ایک دوست نے جو میرے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہتا تھے مجھے بتایا کہ میں خراٹے لیتا ہوں مجھے واقعتاً مزید زندہ رہنے کی خواہش نہ رہی'۔میں نے اسے ہنسانے کے لیے کہا۔مگر وہ ہنسی نہیں صرف خاموشی سے اپنا سر ہلاتی رہی۔ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے کہا ''میں حقیقت میں سیول نہیں جانا چاہتی'۔میں نے اسے اپنا ہاتھ ساتھ دیتے ہوئے کہا۔اس کے ہاتھ کو سختی سے تھامتے ہوئے میں نے کہا۔

'آؤ ہم ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولیں'۔

'یہ جھوٹ نہیں ہے'۔اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔میں تمھارے لیے ''ایک کھلے دن میں'' گاؤں گی۔'لیکن آج تو آسمان ابر آلود ہے'۔میں نے آریا میں جدا ہونے کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ابر آلود دنوں میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔آؤ اپنے ہاتھ پھیلا کر رکھیں اور اگر کوئی آ کر انھیں تھام لیتا ہے تو آؤ اسے اپنے قریب کرلیں۔میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ مجھے اس لیے محبت ہے لیکن لفظ محبت کی ناموزنیت نے مجھے اسی لفظ کو ادا کرنے سے روک دیا۔جب ہم واپس گاؤں میں پہنچے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے ساحل پر ایک دوسرے کو بوسہ دیا۔

'جب تک تم یہاں ہو میں نے شاندار طریقے سے تمھارے ساتھ لگے رہنا ہے۔چناں چہ میں تمھیں خبردار کرتی ہوں۔جدا ہوتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔لیکن چوں کہ میں زیادہ مضبوط ہوں۔سو آخر میں تم

سیول تک کھینچتی چلی جاؤ گی‘۔میں نے کہا۔جب میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ پارک آیا تھا اور اب جاچکا تھا۔وہ کسی کتاب کی دو تین جلدیں چھوڑ گیا تھا کہ اگر میں موجین میں بور ہو گیا ہوں تو (انھیں پڑھ لوں) میری چچی نے بتایا کہ وہ شام کو پھر آنے کا کہہ گیا ہے۔تھکن کا بہانہ کرتے ہوئے میں نے اپنی چچی سے کہا کہ میں اس شام کو کسی سے نہیں مل سکتا۔انھوں نے کہا کہ وہ اس سے بہانہ کریں گی کہ میں ابھی تک سمندر سے واپس ہی نہیں آیا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی چیز مجھے پریشان کرے۔کوئی بھی چیز نہیں۔

میں نے اپنی چچی سے باہر جا کر سوجو (شراب) خرید کر لانے کو کہا اور اس وقت تک شراب پیتا رہا میں اس کے نشے میں دھت ہو کر سو گیا۔صبح سویرے میں اچانک جاگ گیا۔بغیر کسی وجہ سے میرا دل خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔

”ان شک“ میں بڑبڑایا۔پھر میں فوراً ہی دوبارہ گہری نیند میں ڈوب گیا

....

کیا تم موجین چھوڑ رہے ہو؟

میں اپنی چچی کے جھنجھوڑنے سے جاگا۔صبح کافی گذر چکی تھی۔چچی نے مجھے ایک تار تھما دیا۔”2 تاریخ کو تمھیں ایک کانفرنس میں شرکت کرنی ہے۔براہ مہربانی فوراً آ جاؤ۔پنگ‘۔27 تاریخ پرسوں پڑتی تھی اور پنگ میری بیوی کا نام ہے۔میں نے اپنا دکھتا ہوا سر تکیے پر رکھ دیا۔میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔میں نے اپنی سانس ہموار کرنے کی کوشش کی۔میری بیوی کے ٹیلی گرام نے ان تمام سوچوں اور اعمال پر بالکل واضح روشنی ڈال دی جن میں میں موجین پہنچنے کے بعد مصروف رہا تھا۔ہر چیز میری پہلے سے موجود سوچوں کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی تھی۔میری بیوی کے ٹیلی گرام میں یہی لکھا ہوا تھا۔میں نے اس کی تردید میں اپنے سر کو جھٹکے دیے۔ہر چیز اس آزادی کی وجہ سے ہوئی تھی جو عام طور پر سیاحوں کو حاصل ہوتی ہے۔میری بیوی کے ٹیلی گرام میں لکھا تھا۔میں نے اس کی تردید میں اپنے سر کو جھٹکا۔

ہر چیز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری یادداشت سے مٹ جائے گی۔ٹیلی گرام میں لکھا تھا لیکن میں نے اپنے سر کو جھٹکا، یہ کہتے ہوئے کہ اس کے داغ اور زخم باقی رہ جائیں گے۔ہم بہت دیر تک بحث مباحثہ کرتے رہے۔آخر میں ٹیلی گرام اور میں ایک سمجھوتے پر پہنچ گئے۔آؤ مثبت طریقے سے قبول کر لیں۔ صرف اس بار، اس بار اور ہمیشہ کے لیے، صرف اس بار کے لیے، اس موجین، اس دھند، تنہائی کے حصول کے لیے پاگل پن، پاپ گیت، ایک بار (شراب خانے) میں کام کرنے والی لڑکی کی خودکشی، بے وفائی، غیر ذمہ داری، آؤ ایک بار ساری چیزوں کو قبول کر لیں، آخری بار اور صرف ایک بار۔اس کے بعد میں وعدہ کرتا ہوں کہ

ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کے محدود حصار میں زندگی بسر کروں گا، اوہ ٹیلی گرام، آؤ اس معاہدے پر مہر ثبت کر دیں۔ میں اپنے وعدے پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہوں۔ ہم نے وعدہ کیا لیکن ٹیلی گرام کی طرف پیٹھ کر کے اس کی آنکھوں سے نظر بچا کر میں نے ایک خط لکھا۔

'مجھے اچانک سیول بلا لیا گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ خود تمھیں آ کر مطلع کروں لیکن گفتگو ہمیشہ ہمیں غیر متوقع سمتوں میں لے جاتی ہے۔ چناں چہ میں تمھیں ملنے کے بجائے تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ میں مختصر بات کروں گا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ کیوں؟ کیوں کہ تم میری اپنی ذات ہو، کیوں کہ تم میری گزشتہ ذات کی ایک شبیہہ ہو جسے میں پیار کرتا ہوں۔ اگر چہ یہ بڑا کمزور (پیار) ہے۔ اگر چہ میں نے اپنی گذشتہ ذات کو اپنی موجودہ ذات میں بدلنے کے لیے ہر طرح سے کوشش کی ہے، میں تمھیں روشنی اور سورج کی روشنی میں لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ مجھ پر یقین رکھو۔ جونہی سیول میں تمام تیاریاں مکمل کر کے تم سے رابطہ کروں گا۔ برائے مہربانی اس وقت موجین چھوڑ کر مجھے سے سیول میں آ ملنا۔ میرا خیال ہے ہم خوش رہ سکتے ہیں۔'

میں نے یہ لکھا اور پھر اس سارے خط کو پڑھا۔ میں نے اسے پھر پڑھا۔ پھر اسے پھاڑ دیا۔ ایک جھٹکے کھاتی بس پر بیٹھے ہوئے، میں نے کوئی چیز سڑک کے ساتھ دیکھی یہ ایک سفید سائن بورڈ تھا جس پر واضح کالے حروف میں لکھا تھا:

'آپ موجین چھوڑ رہے ہیں۔ خدا حافظ'۔

مجھے شدید قسم کی شرمندگی کا احساس ہوا۔

☆☆☆☆

Lesya Ukrainka

"How lovely it would be to die like a falling star…"

Lesya Ukrainka was one of Ukraine's best known poets who also wrote plays. She was politically active, especially on feminist issues.

She was born Larysa Petrivna Kosach-Kvitka on the 25th February 1871 in the Ukrainian town of Novohrad-Volynskyi. Her mother, Ukrainian writer and publisher Olha Drahomanova-Kosach, better known under her literary pseudonym Olena Pchilka, was known by poetry and short stories aimed at children, and it seems likely that she encouraged Larysa to follow in her footsteps. Her mother was also active in the women's movement and published a feminist almanac. Larysa had grown up speaking Ukrainian at home but found that she had a gift for linguistics, mastering European languages including English, Italian, German, French as well as Slavic languages such as Polish and Bulgarian. She also knew Greek and Latin. She was very close to her uncle M. Drahomanov, her spiritual mentor and teacher, a well-known Ukrainian scientist, historian, philosopher, folklorist and public figure, one of the Fathers of Ukrainian nation.

Larysa's first attempt at poetry was a piece called Hope,

written when she was just 8 years old, this being her reaction to the enforced exile of an aunt who had been arrested after protesting about the autocracy of the Tsars. That same year the family moved to Lutsk and her uncle Mykhaylo took on the task of encouraging his niece to read the Bible in order to grasp its poetic nuances. He also got her reading up on Ukrainian history and folk tales. She was 13 years old when Lily of the Valley appeared in print and this was also the first time that she used the

pseudonym Lesya Ukrainka.

She believed passionately in the right of her country to be independent from Russia and much of her writing was patriotically-themed. The poems and plays of Ukrainka are associated with her belief in her country's freedom and independence. Between 1895 and 1897, she became a member of the Literary and Artistic Society in Kiev, which was banned in 1905 because of its relations with revolutionary activists.

Her health was not good and tuberculosis of the bone prevented her from progressing as a pianist. It did not stop her writing though and a good example of her optimistic, hopeful verse was the poem Contra Spem Spero! ("Do hope woyhout hope"- below)

Taras Shevchenko and Ivan Franko were the main inspiration of her early poetry, which was associated with the poet's loneliness, social isolation and adoration of the Ukrainian nation's freedom. Her first collection of poetry, Na krylakh pisen'

(On the Wings of Songs), was published in 1893. Since Ukrainian publications were banned by the Russian Empire, this book was published in Western Ukraine, which was part of Austria-Hungary at the time, and smuggled into Kyiv in secrecy due to the oppressive rules of the Russian Empire which meant that Ukrainian literature was banned.

Health issues forced her to travel to places with a drier climate such as Egypt, the Crimea and Bulgaria and these visits inspired her to write more. One book to come out of her travels was The Ancient History of Oriental Peoples and this included poems such as "Crimean Memories" and "Starry Skies."

She published a number of collections of poetry including "Thoughts and Dreams" (1899) and "Forest Song" (1911).

Lesya Ukrainka died on the 1st August 1913 while staying at a Georgian health resort. She was 42 years old. Here is her most famous poem:

CONTRA SPEM SPERO!